امی مرحومہ

سکینہ خاتون

کے نام

خوابوں کے اُس پار

مجھے

ڈر لگتا ہے

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

فہرست

وارین ہسٹینگس کی ٹوپی

ڈراکیولا

لیبارٹری

بیٹی

نور علی شاہ کو اُداس ہونے کے لئے کچھ چاہیے

بازار، طوائف اور کنڈوم

بھنور میں ایلس

غلام بخش

آپ اس شہر کا مذاق نہیں اُڑا سکتے

بوڑھے جاگ سکتے ہیں

مجھے اسے زندہ رکھنا ہے

حیران مت ہو سنگی مترا

پیر اللہ

وارن ہسٹنگز کی ٹوپی

ٹوپی کی قسمت ایسے بھی کھل سکتی ہے، محمد علی بھائی نے کبھی سوچا نہیں تھا۔ چھوٹی بڑی ہر چھی، دو پلی، فیروز آبادی، حیدر آبادی، لکھنوی، ملتانی، مولانا ابوالکلام آزاد، محمد علی جوہر اسٹائل ٹوپیوں کی اتنی بڑی کوئی 'ڈیل' بھی ہو سکتی ہے، محمد علی بھائی کے لئے ایسا سوچنا عرش پر اڑنے کے برابر تھا۔ وہ تو صبح سے شام تک رنگین، ریشمی، مخملی، ملائم، چکور، گول اور ولایت علی خاں والی ٹوپیوں کا مول تول کرتے گذار دیتے تھے ___ دور کہاں، یہیں اپنے دلّی کے نظام الدین میں ___ بستی حضرت نظام الدین۔ سنا ہے پڑوس میں کوئی بہت بڑے شاعر بھی تھے۔ غالب نام تھا۔ ارے وہی غالب اکیڈمی والے غالب۔ جہاں ٹھیلا لگاتے ہیں، وہی تو ان کا گھر ہے ___ گھر نہیں دکان ___ یا جو بھی ہو، محمد علی بھائی صبح سے شام اس لئے بھی پریشان رہتے ہیں کہ ہر آنے والا نیا مسافر بس اُسی کے ٹھیلے کے پاس آ کر پوچھتا ہے ___

'غالب اکیڈمی جانتے ہو؟'

اب کیا ___ وہ چیخیں یا چلّائیں کہ بھیا، جہاں کھڑے ہو وہی تو ہے اُن کی دکان۔ پتہ نہیں اس دکان مکان میں یا جو بھی کہہ لیں، صبح سے کیا کیا ہوتا ہے کہ لوگ بس جوق در جوق چلے ہی آتے ہیں۔ جیسے اور کوئی کام ہی نہیں۔ کتنے ہی لوگ اس کی دکان پر آ کر دریافت کرنے کے بعد، جیسے اُسے پریشان کرنے پر آمادہ ہو جاتے ___

___ نہیں جانتے؟

نہیں۔

___ غالب کو نہیں جانتے؟

نہیں۔

____ ہوگا کوئی ایسا جو کہ غالب کو نہ جانے؟

میں نہیں جانتا، بس۔

____ پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہیں؟

تم ہی بتلاؤ کے ہم بتلائیں کیا

____ یعنی کوئی مسلمان غالب کو نہیں جانے

'اے بھائی اِس کو مسلمان مت کہئے' ____ بتانے والوں نے محمد علی بھائی کو بتایا تھا ____ نہیں جانتے کیا۔ شاعر تھا ____ کوٹھے پر جاتا تھا ____ شراب پیتا تھا۔

'توبہ توبہ توبہ'.....

محمد علی بھائی کی آنکھوں میں غالب، ان کے خاندان، بلکہ خاندان در خاندان کے لئے ڈھیر ساری نفرت جمع ہو جاتی۔

____ روزے نہیں رکھتا تھا

اچھا

____ نماز بھی نہیں پڑھتا تھا

اچھا

____ پھر تو ٹوپی بھی نہیں پہنتا ہوگا؟

نہیں ____ یہی تو ____ غزلوں کی طرح اُس کی ٹوپی بھی مشہور ہے۔ غالب کی بڑی سی ٹوپی ____ بابل کے ٹیڑھے مینار کی طرح دور تک جانے کے بعد ذرا سی جھک گئی ____ ٹوپی کے اوپر کے حصہ میں پیوند لگی ہوئی ____ کپڑے کا بالشت بھر حصہ۔ مخملی ٹوپی ____ کچھ لوگ اس کے ٹھیلے کے پاس آ کر پوچھتے بھی تھے ____

غالب ٹوپی ہے؟

نہیں

'کمال ہے، غالب اکیڈمی کے پاس ٹوپی بیچتے ہو اور غالب ٹوپی نہیں رکھتے۔ بھائی کمال ہے۔'

کمال تو بس پوچھنے والے کی نظر میں ہوتا ___ یعنی، ہوگا کوئی ایسا جو کہ غالب کو نہ جانے۔ محمد علی بھائی بدلی ہوئی سیاست کی فارسی نہیں جانتے تھے۔ مگر غالب کو مسلمان کہنے کے نام پر ان کے تن بدن میں آگ لگ جاتی ___ شرابی اور مسلمان۔ ہونہہ۔ سنا ہے ڈومنی کے کوٹھے پر جاتا تھا۔ فرنگیوں کے لئے شاعری کرتا تھا۔ ان ہی گلیوں میں گھومتا ہوگا کل۔ نہیں۔ کسی نے بتایا ___ وہ تو گلی قاسم جان میں رہتے تھے ___ یہاں سے کیا واسطہ ___ پھر یہاں کاہے کو آ گئے ___؟ دکان کھلوا دی اور وہ مزار تو دیکھئے ___ یہاں مزار بھی بنوالیا ___ لیکن کیا ہوا بھائی اتنا بڑا مزار اتنی جگہ گھیر لی۔ مگر باہر سے تالہ بند۔ دروازے پر کتے لوٹتے ہیں یا صاحب جان فقیر دو چار کتوں کو کسی محبوب کی طرح اپنے سینے سے چمٹائے 24 گھنٹہ سوتا رہتا ہے۔

''یہی ہوتا ہے مذہب سے پھرنے کا انجام۔ ارے انہی مسلمانوں نے تو..... اور شراب پیئیں''۔

محمد علی بھائی کو غالب کا ذکر گوارا نہ تھا۔ کچھ پیارا تھا، تو اپنے محبوب کا تذکرہ ___ محبوبِ اولیا یعنی درگاہ حضرت نظام الدین۔ ایک قطار سے پھول والے ___ چھوٹی چھوٹی ان تنگ گلیوں میں محبوب اولیاء کی برکت ہے۔ چھوٹے چھوٹے ہوٹل تو دیکھ لیجئے۔ ہزاروں کی تعداد میں بھوکے، لاچار، غریب، فقیر۔ پانچ پانچ روپے میں کھانا کھلایئے۔ باہر سے آنے والا آدمی محمد علی بھائی کی دکان پر بھی رکتا ہے۔ ٹوپی کی قیمت پوچھتا ہے۔

'کتنے کی ہے؟'

'توبہ توبہ.....' سُرمے، والی آنکھیں اور زیادہ ندی جتنی گہری ہو جاتیں ____

'کیا بولتے آپ۔ ٹوپی کی قیمت نہیں ہوتی..... ہدیہ ہوتا ہے۔ ہدیہ.....

'جو مرضی ہدیہ دے دیں۔'

محمد علی بھائی جانتے تھے، ہدیہ کے نام پر دینے والا دو چار پیسے زیادہ ہی دے جائے گا۔ کبھی کم نہیں دے گا ____ اب بھلا قرآن پاک، تسبیح اور ٹوپی جیسی پاک چیزوں کی خرید پر مول تول کرنے کی ہمت کون کرے گا ____ اللہ کا کلام۔ اللہ کے گھر میں باادب جانے کے لئے ایک ٹوپی ہی تو احترام کا واحد ذریعہ ہے۔ بچپن میں ابا بھی کہتے تھے ____ مسجد میں سر ڈھک کر جانا چاہئے۔

'کیوں؟'

'فرشتے ہوتے ہیں۔ مقدس گھر ہے اس لئے۔'

'نہیں پہنی تو؟'

'شیطان سر پر تھپڑ مارتے ہیں۔'

ہو ss ہو ss محمد علی بھائی کو ہنسی آتی ہے۔ ایک وہ دن اور ایک یہ ____ ٹوپی کی عزت اور دبدبہ جو دل میں قائم ہوا، سو آج تک ہے ____

ٹوپی کو آنکھوں سے چومتے ہیں۔ ریشمی، دوپلّی، ترچھی، بچوں کی، روئی جیسی ملائم ٹوپیاں ہاں ____ تو۔ ذکر چلا تھا، ڈومنی کے کوٹھے پر جانے والے غالب کا۔ شراب پینے والے غالب کا اور تقدیر یر تو دیکھئے۔ جگہ ملی تو کہاں۔ یہاں محبوب اولیاء کے آستانہ کے قریب ____ عرس کے دنوں میں یہاں ٹھیلا لگانا بھی مشکل ہو جاتا۔ جو ق در جوق آدمی ہی آدمی ____ محبوب اولیاء کے آستانہ پر قوال اپنے اپنے راگ الاپ رہے ہیں۔

'بھر دے جھولی مری یا محمد

لوٹ کر پھر میں جاؤں نہ خالی.....'

وہ ٹھیلے کو غالب کے مزار والی گلی کے کنارے لگا کر، کپڑے سے برابر کر، محبوب اولیاء کے در پر دستک دینے پہنچ جاتا۔ کسی نے بتایا تھا۔ یہیں علامہ اقبال کی دعا بھی قبول ہوئی تھی۔ کہتے ہیں اقبال نے سات برسوں تک کچھ بھی نہیں لکھا۔ آستانے میں حاضری دی اور یہ شعر پڑھا ____

فرشتے پڑھتے ہیں جس کو، وہ نام ہے تیرا
مسیح وخضر سے اونچا مقام ہے تیرا

'اب دیکھئے اقبال کہاں ہیں ____ شاعر مشرق کہا جاتا ہے ____ کسی نے بتایا تھا، علامہ کا مزار تو لاہور میں ہے ____ یہی تو غلط ہے۔ علامہ کو یہاں ہونا چاہئے تھا۔ یہاں تو بیکار غالب کو بھیج دیا۔ شرابی کہیں کا۔'

محمد علی بھائی کو اقبال پسند تھے..... پسند ہی نہیں تھے، بہت پسند تھے۔ وہ کہتے بھی تھے ____ ارے غالب کی کا بات کرتے ہو۔ شاعر تھے تو اقبال۔ ایک کیا۔ دس سنادوں اشعار۔ ابھی اسی وقت۔ مسلمانوں کے تھے۔ اپنے تھے اور یہ غالب۔ لیکن دقت یہی تھی۔ کبھی کبھی لوگ غالب ٹوپی تو پوچھنے چلے آیا کرتے، اقبال ٹوپی پوچھنے کوئی نہیں آتا تھا۔

یہ پوری بستی ہی محمد علی بھائی کو اللہ کی سوغات لگتی تھی۔ نور سے جھلمل ____ چاروں طرف جیسے نور ہی نور پھیلا ہو۔ ایک قطار سے پھول والوں کی سیر ____ اور ٹھیک اُن سے چار قدم، آنکھوں کے فاصلے پر تبلیغی جماعت والوں کا دفتر ____ دفتر کیا تھا، مسجد کہئے۔ مسجد کیا، سب کے لئے ایک آشیانہ ____ دنیا بھر سے لوگ آتے ہیں۔ سوڈانی، چینی، افریقی، امریکی اور پتا نہیں کہاں کہاں سے ____ چہرے الگ، رنگ الگ، زبان الگ۔ لیکن کام ایک۔ مشن ایک۔ اسلام کی تبلیغ۔

تب اُس نے شروع شروع یہاں ٹھیلا لگانا شروع کیا تھا۔ ٹوپی خریدنے آئے بہت سے لوگوں کو تو وہ پہچان بھی نہیں پاتا تھا ___ کہ کیا، یہ بھی مسلمان ___ کمال ہے۔ یہ بھی ___ یہ کالا بھجنگ ___ یہ بھی۔ یہ افریقی بھی۔ یہ چینی بھیا بھی ___ سب کو ٹوپیاں دیتے دیتے ایک دن وہ مسجد میں چلا گیا۔ اُف۔ چاروں طرف نور کی بارش۔ اُس سے کہا گیا ___

'وہ چلّا میں چلے۔ چالیس دنوں تک۔ نہیں تو چوبیس دن۔ نہیں تو اپنے شہر میں ہی تین دن کا وقت نکالے۔ آزاد اپارٹمنٹ سے تاج اپارٹمنٹ۔ گھر گھر گھومنا ہے۔ نماز پڑھنے کی تبلیغ کرنی ہے۔''

'سبحان اللہ..... سبحان اللہ'

محمد علی بھائی ہر بات پر سبحان اللہ کہتے ہیں۔ تبھی سے یہ عادت پڑی ہے۔ چلّا میں جانے لگے تو جیسے گھر والوں کو بھولنے لگے۔ ابّا تو جا ہی چکے تھے۔ مرشد آباد میں انتقال ہوا ___ اور وہ اپنے بھائی مشتاق کے ساتھ یہاں خوریجی، دہلی میں آ کر بس گئے ___ زیادہ دنوں تک غائب رہنے لگے تو بیوی نے طوفان اُٹھا دیا ___

'گھر کی سوچو۔ دو دو بچے ہیں۔'

'تو.....'

'بچہ مدرسہ جانے لگا ہے۔'

'اچھی بات ہے۔' سرمہ لگی آنکھوں میں 'خاندانی جنون' پیدا ہوا ___ 'عیاشی میں جاتا ہوں کیا۔ مذہب کے کام سے جاتا ہوں۔'

'اور گھر؟'

'بتایا تھا نا۔ پہلے خلیفہ نے کیا کیا تھا۔ پیارے نبیؐ کے لئے گھر میں کچھ بھی نہیں چھوڑا۔' محمد علی بھائی کو، جاہل بیوی کو پیٹنے کی خواہش ہوئی۔ مذہب کے کام پر بندش لگاتی ہے۔ مگر کیا کرتے۔ جب آس پاس والوں کے 'مشورے' بڑھے کہ بھائی اولاد

والے ہو، اور پھر بزنس بھی ٹھپ..... پڑ رہا ہے..... تو ذرا سی آنکھ کھلی اور 'چلے' میں جانا کم کر دیا۔ بند نہیں کیا۔ بڑا بھائی مشتاق اُن دنوں 'ڈرائیوری' کرنے لگا تھا۔ دو ایک بار شیخ اور ایک 'عرب' کی صحبت میں دوسرے ملک جا چکا تھا۔ اس لئے محمد علی بھائی بھی ڈرائیونگ کرنا سیکھ چکے تھے۔ اس درمیان سعودی عرب سے تبلیغ میں آئے شیخ یاسر سے اُن کا سامنا ہوا تھا۔ تبلیغ کے لئے حیدرآباد گئے۔ وہاں سترہ سال کی ایک دلہن پسند آ گئی۔ غریب باپ کو بیٹی کی قیمت چکائی ___ واپسی میں بستی نظام الدین آئے۔ محمد علی بھائی سے ملے تو دل کی بات ہونٹوں پر آ گئی۔

'ہمارے ساتھ چلو گے؟'

'کیوں نہیں؟'

'ویزا بنا ہوا ہے'

'بالکل ہے۔'

ڈرتے ڈرتے محمد علی بھائی نے پوچھا۔ 'عمرہ (آدھا حج) تو کر سکوں گا نا؟

'عمرہ کیوں۔ حج کیوں نہیں ___؟'

محمد علی بھائی لاجواب ہو گئے۔ مکہ مدینہ کے پُرنور نظارے آنکھوں میں گشت کرنے لگے ___ بیوی بچوں کو، پیسے کے لئے تسلی دی ___ اور خود نکل گئے، اللہ میاں کی نگریا ___ خانہ کعبہ۔ اللہ میاں کا گھر ہی تو ہے ___ عمرہ کیا۔ حج بھی کر آئے اور دو سال میں ہی شیخ کی نوکری بھی چھوڑ کر آ گئے۔

محمد علی بھائی لوٹ تو آئے لیکن تجارت اور بزنس کے ''دو اور دو' دو سو'' کے پہاڑے سیکھ چکے تھے ___ آنکھیں کھل گئی تھیں ___ لے دے کر وہی ایک ٹھیلا ___ وہ اپنی اِس 'تجارت' کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے کے فراق میں تھے ___ شاید اس لئے بھی کہ مشتاق نے سلیم پور میں گھر لے لیا تھا اور وہ اب تک خوریجی کے دو کمروں

والے کرائے کے فلیٹ میں دہلی کی گرمی برداشت کر رہے تھے۔لیکن امید تھی۔ اللہ کی لاٹھی میں دیر ہے اندھیر نہیں ____ ایک دن معجزہ ہوگا۔ جھولی پھیلائیں گے، اور محبوب اولیاء اتنا دے دیں گے کہ قارون کا خزانہ بھی کم پڑ جائے گا۔

✦ ✦

قارئین،

برسوں پہلے ایک جادوگرنی نے پوچھا تھا۔آپ جادو پر یقین رکھتے ہیں ____ اور یقیناً، اس سوال کو پوچھتے ہوئے جادوگرنی طنز سے مسکرائی تھی ____ یعنی اس عہد میں، اس ترقی یافتہ عہد میں بھی ____؟ممکن ہے، آپ کسی جادو یا معجزے پر یقین نہ رکھتے ہوں مگر ہمارے محمد علی بھائی کے ساتھ، آگے جو واقعہ پیش آیا، وہاں یقین کرنا ہی پڑے گا۔ کیونکہ یکا یک، جیسے طلسم ہوشربا کی داستانوں سے اٹھ کر کوئی کردار، زندہ ہو کر اُن کے سامنے متعلق کھڑا ہو گیا ہو۔ یہ آنکھوں کا دھوکہ نہیں تھا۔ پھر بھی ہمارے محمد علی بھائی نے آنکھیں ملیں۔ بستی حضرت نظام الدین کے فٹ پاتھ کنارے رکھے، اپنے ٹھیلے کا جائزہ لیا ____ نظر اٹھا کر دیکھا ____ سامنے ایک فرنگی تھا اور ایک تھے اپنے صادق بھائی ____ جو کتنی ہی بار تبلیغی جماعت کی مسجد میں دکھائی دیئے تھے۔

دونوں یکا یک اُس کے ٹھیلے کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔ اس طرح، جیسے لیوتالستائے کی ایک کہانی میں، کسی بھوکے پیاسے کے گھر خود بھگوان چل کر آ گئے ہوں۔

'جی۔صادق بھائی۔السلام علیکم.....'

محمد علی بھائی غور سے صادق بھائی کا چہرہ پڑھ رہے تھے ____

'سلام مجھے نہیں، انہیں کیجئے ____'

'اخواہ۔مسلمان ہیں؟ سبحان اللہ' محمد علی بھائی نے تپاک سے ہاتھ آگے

بڑھایا____

'نہیں۔ مسلمان نہیں۔'

محمد علی بھائی نے فوراً ہاتھ پیچھے کھینچ لیا____ 'کیا کہتے ہیں صادق بھائی۔ کافر کو سلام کرنا منع ہے۔'

'ہوگا____'

'آپ تو نماز روزہ سب کرتے ہیں۔ پھر ایسی بات.....' محمد علی بھائی کہتے کہتے رک گئے____ فرنگی، انگریزی میں دھیرے دھیرے صادق بھائی سے کچھ کہہ رہا تھا اور صادق بھائی انگریزی میں اُس کا جواب دے رہے تھے..... ٹیل ہم۔ ٹیل ہم پلیز____ ٹیل ہم دیٹ آئی ایم ویری مچ پلیز ٹولک وہاٹ ہی سیڈ۔ تم سے مل کر بہت خوش ہیں۔'

'کیا کہتے ہیں صادق بھائی.....'

صادق بھائی نے اُس کا ہاتھ پکڑا۔ دھیرے سے کان میں کہا____ 'محمد علی بھائی، تیری تو چل پڑی.....'

'مطلب'

'اِن سے ملو____ یہ ہیں____ ایرک ہیسٹنگز.....'

'ای.....رے.....ک.....' محمد علی بھائی نام لیتے لیتے ٹھہر گئے ___ کیا.....ایریک.....؟

'ہیسٹنگز۔ وارن ہیسٹنگز کے خاندان کا.....'

'تو میں کیا کروں۔'

'کرنا تمہیں ہی ہے محمد علی بھائی____' صادق بھائی ہنس رہے تھے۔ 'کیونکہ بزنس کا معاملہ ہے۔'

'بزنس اور مجھ سے؟'

محمد علی بھائی کی پیشانی پر شکن پڑ گئی تھی ___ اب سامنے والا آدمی اُنہیں اچھا لگنے لگا تھا ___

ایریک ہیسٹنگز نے، صادق بھائی سے کہا ___ Come to the point

'convey to him, what I mean.

صادق بھائی نے ترجمہ کیا ___ محمد علی بھائی، اِن کی باتیں غور سے سنو۔'

'اوہ۔یس.....یس۔' محمد علی بھائی جوش سے بولے۔ اتنی انگریزی تو وہ جانتے ہی تھے۔

اٹیس اے لانگ لانگ اسٹوری، اِمپاورنگ مومنٹس آف آلموسٹ تھری سنچوریز' لمبی کہانی ہے۔ڈھائی سو سال کے عرصے میں پھیلی ہوئی.....'

صادق نے ترجمہ کیا کیا، جیسے تھوک نگلا ہو ___

پوچھتے پوچھتے وہ ٹھہرے ___ آر یو اے ڈسنڈنٹ آف سراج الدولا ز فیملی؟

'آپ نواب سراج الدولہ کے خاندان کے ہیں نا؟ یعنی یہ بات بالکل سولہ آنے سچ ہے، نا'؟

محمد علی بھائی ایک لمحہ کو جیسے ننگے ہو گئے۔ گہرا سناٹا چھا گیا۔

✦ ✦

'غربت' کے اِس باب کو بھولے ہوئے ایک زمانہ ہو گیا۔ کہاں سراج الدولہ، کہاں وہ ___ لیکن سنتے تھے.....، اُن کے بھائیوں میں سے ایک لیاقت الدولہ کے خاندان سے اُن کا شجرۂ نصب جا کر مل جاتا ہے۔

تب اٹھارہویں صدی کا مرشد آباد اور تھا۔ کہتے ہیں لندن، پیرس اور روم کی چمک بھی اُس کے سامنے ماند تھی اور اس بات کا اعتراف تو رابرٹ کلائیو تک نے کیا تھا ___ ریشمی کپڑے اور ہاتھی کے دانت سے بنی خوبصورت چیزوں کی وجہ سے بھی مرشد آباد کی شہرت دور دور تک تھی۔

'اُن دنوں.....' ایریک ہیسٹنگز ایک لمحہ کو ٹھہرا ___ صادق بھائی کا ترجمہ جاری تھا ___ مرشد آباد بھاگیرتھی اور اب کے ہگلی ندی کے دونوں طرف بسا ہوا تھا۔ کہتے ہیں یہیں، یہیں بھاگیرتھی کے کنارے، پہلی بار تمہارے آباءواجداد میں سے ایک، اور ہمارے وارن ہیسٹنگز کی ملاقات ہوئی تھی ___ ایک بڑی ڈیل کے لئے.....

'ڈیل؟'

محمد علی بھائی بچوں کی طرح کانپ گئے ___ جیسے تیز ہوا چلی ہو اور تیز طوفانی ہوا میں اُن کا جسم مثل بید تھرّانے لگا ہو ___

'ڈیل.....بزنس ڈیل.....'

محمد علی بھائی کے لئے وہ فرنگی ایک 'گورا' آدمی تھا اور یہ گورا آدمی اِس وقت مسکرا رہا تھا ___

یکا یک سر میں جیسے تیز تیز بجلی کڑکنے لگی ___

'لیکن اتنے برسوں بعد ___ یعنی دو سال نہیں دس سال نہیں، سو سال نہیں ___ بلکہ ڈھائی سو سال.....؟'

محمد علی بھائی کو حیرانی تھی ___ اتنے برس میں تو قبرستان کی تاریخ بھی بدل جاتی ہے ___ دنیا کی کون کہے؟ ڈھائی سو سال پرانے مردے تو پتہ نہیں کہاں سے کہاں نکل جاتے ہوں گے ss ہو ہو ss۔

'ہنسومت ___' صادق بھائی کی آواز میں ناراضگی تھی ___ یہی تو کمی ہے۔ ہم ہندوستانیوں میں۔ تاریخ بھول جاتے ہیں۔ نہیں بھولتے تو یہاں رہتے کیا؟ اِن کی طرح چاند پر چلے گئے ہوتے ___ یہی تو فرق ہے۔ ان کے لئے سب کچھ تاریخ ہے ___ بلکہ سچ یہ ہے کہ ایریک بھائی بھی تاریخ ہیں ___ اِن کا حال اور ماضی بھی تاریخ ہے.....'

'یس.....' ایریک ہسٹینگز نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا۔

صادق بھائی اُس کی طرف گھومے ___ 'پتہ ہے۔ یہ کیا کہہ رہے ہیں ___ تمہیں تلاش کرنے میں ساری زندگی لگ گئی ___ وارن ہیسٹنگز کے مرنے کے بعد ڈیل کی یہ تاریخ کچھ پشتوں تک تو چلتی رہی مگر کسی کو بھی ہندوستان آنے میں کامیابی نہیں ملی ___ دراصل وارن ہیسٹنگز کے گھر والے، اُن پر زندگی کے آخری لمحوں میں لگنے والے الزام اور الزامات اور مقدموں سے بالکل خوش نہیں تھے ___ پھر لگاتار کورٹ کچہری، گواہیاں، اس سے ایسٹ انڈیا کمپنی کی طاقت کم ہو رہی تھی۔ کمپنی کے افسر اعلیٰ بھی کمزور پڑنے لگے تھے۔ لیکن تاریخ ان ڈھائی سو برسوں میں آنے والی نسل کو اس ڈیل کی کہانی سناتی رہی اور ہیسٹنگز خاندان کا ہر آدمی سوچتا تھا ___ وہ ہندوستان جائے گا ___ لیاقت الدولہ کے خاندان والوں کو پکڑے گا ___ اور اس تاریخی ڈیل کے بارے میں بتائے گا ___'

معاذ اللہ! محمد علی بھائی صدیوں پرانی تاریخ کی اس محبت سے بے حد متاثر تھے ___ مگر میرا گھر۔ میرے بارے میں.....'

صادق بھائی نے اُس کا ہاتھ تھاما ___ جو تاریخ کی حفاظت کرتے ہیں، وہ تاریخ میں شامل لوگوں تک پہنچ جاتے ہیں۔

'مگر ___'

صادق بھائی، محمد علی بھائی کے ہاتھوں کو تھامے رہے ___ 'DNA جانتے ہو یا نہیں؟'

'ہاں۔' محمد علی بھائی کو اپنے نالج پر فخر کا احساس ہوا ___

'اسپیل برگ نے کھدائی میں ملے ڈائناسور کے انڈے سے پورا جوراسک پارک تیار کرلیا۔ 'کب، کیسے، کیا' جیسی چیزیں تاریخ میں نہیں آتیں ___ صرف جانو، دیکھو اور سنتے رہو ___'

'یس..... یو آر رائٹ.....'

محمد علی بھائی کی آنکھوں میں چمک لہرائی۔ سب سمجھ گیا ___ سمجھ گیا صادق بھائی۔

لیکن کیا اور کتنا سمجھا تھا محمد علی بھائی نے ___ لیاقت الدولہ اور سراج الدولہ کے خاندان کی 'رام کہانی' تو کب کے نوابوں کے قبرستان میں دفن ہو چکی تھی۔

مرشد آباد چھوڑے بھی ایک زمانہ ہو گیا ___ پھر کبھی وہ لوٹ کر تاریخ کی سنہری 'گپھا' میں نہیں گئے۔ وہاں تھا ہی کیا۔ سوائے ناامیدی اور ایک دُکھ بھری کہانی کے۔ وہ تو، اللہ اللہ خیر صلی جمنا پار، خوریجی میں دو چھوٹے کمروں والا ایک اصطبل مل گیا اور مل گئی بستی حضرت نظام ___ مل گیا ٹوپیوں والا ایک ٹھیلہ ___ اور مل گئے، انہی بستیوں میں اپنے صادق بھائی ___ جن سے کسی اُجاڑ دُکھ بھرے لمحے محمد علی بھائی نے ذکر کیا تھا، کہ وہ کس کے خاندان سے ہیں اور اب کیا ہو گئے۔

'نہیں اِس بات کو آپ ایسے نہیں سمجھیں گے ___' اریک ہیسنگر کا چہرہ چمک رہا تھا ___ 'دراصل اُس وقت ہمارے سائنسداں زمین اور کرۂ بادکو لے کر ایک تجزیاتی رپورٹ لائے تھے۔ زمین کا کرۂ باد پانچ پرتوں کا بنا ہوا ہے۔

'ٹراپوس فیئر، اسٹریٹوس فیئر، میسوس فیئر، تھرموس فیئر اور ایکسوس فیئر.....'

'تو.....' محمد علی بھائی کے چہرے پر گھبراہٹ تھی..... اتنے سارے فیئر..... اس گھبراہٹ میں وہ اریک ہیسنگر کا چہرہ دیکھنا بھول گئے ___ جس کی دائیں آنکھ کے پاس کے کالے تل سے، روشنی کی چنگاریاں نکل رہی تھیں ___ ٹھیک ایسے، جیسے پرندے اُڑتے اُڑتے 'بجوکا' کو دیکھتے ہوں ___ ٹھہرتے ہوں ___ لوٹ جاتے ہوں۔ نہیں، یہ تمثیل ٹھیک نہیں ___ ہاں، یاد آیا، مولوی صاحب، مدرسے میں اپنی جگہ باہر جاتے ہوئے 'گئوتکیہ' کو رکھ دیتے تھے، پھر اشارے سے کہتے تھے ___ 'یہ میں ہوں، جانا مت۔' اُن کے جانے کے بعد بھی گئوتکیہ عجب عجب

طرح سے مولوی صاحب کی شکلیں لیتا رہتا تھا۔ اس وقت کچھ ایسا ہی تھا۔ وہ ڈر بھی رہا تھا۔ سمجھنا بھی مشکل تھا۔ اُس پر اِس گورے بھائی کا چہرہ ____ بڑا ڈیل ____ لیکن یہ ڈیل کے درمیان میں کرۂ باد کہاں سے آ گیا۔

'ڈیل کے درمیان میں کرۂ باد؟' محمد علی بھائی خود کو روک نہیں سکے۔

ترجمہ کرنے والے صادق بھائی دل کھول کر ہنسے ____ گورے آدمی کی چھوٹی آنکھیں سکڑ گئیں ____ لیکن دوسرے ہی لمحے اُن میں چمک پیدا ہوگئی ____ صادق بھائی نے اُس کے لفظوں کا ترجمہ کیا ____ دس فول از سے اِنگ.....

اوہ نو ss نو ss اریک ہیسنگر ہنس رہا تھا ____ پھر اُس نے کچھ کہا۔ اب اُس کی انگریزی اور ترجمہ ساتھ ساتھ چل رہا تھا ____

'جیسے جیسے ہم اوپر بڑھتے جاتے ہیں، ہوا پتلی ہوتی جاتی ہے.....'

'تو.....'

'یہ سب سمجھنا اتنا آسان نہیں۔ ہندستان میں ولایتی مال کی کھپت کے سلسلے میں ڈیل ہوئی تھی۔ ہری دوار، ایودھیا، بنارس اور ایسے ہی کچھ مذہبی مقاموں پر گیروا ریشمی کپڑے تھوک میں بھجوانے کی بات ہوئی تھی ____ لارڈ ویلزلی نے خود ہی بہترین مال کے لئے ہندوستان کے ان بڑے ہندو بازاروں کی اسٹیڈی کی تھی۔ مگر صادق دھیرے سے پھسپھسایا ____ محمد علی بھائی جتنا کہا جائے، اتنا ہی سمجھو۔ زیادہ آگے پیچھے مت دیکھو ____ آگے پیچھے دیکھو گے تو یہ ڈیل ہاتھ سے نکل جائے گی۔ فائدہ تمہیں ہوگا تو کمیشن مجھے بھی تو ملے گا۔ سمجھے کہ نہیں۔ اب کیا ہے کہ یہ لاٹری تمہارے نام کھل گئی بس..... اب ایسے سمجھو..... کہاں یہ..... کہاں ہم..... ای کتنا پڑھے لکھے ہیں اور ہم ____ کیا مقابلہ ہے ____ کوئی مقابلہ ہوتا تو دوسو سال سے زیادہ کیا یہ ہم پر حکومت کرتے.....؟ ایک دن سب کی قسمت بدلتی ہے۔ سمجھو

تمہارے دن بھی.....

درمیان میں اریک ہیسٹنگز نے ناگواری سے اُس کی پھسپھساہٹ کے بارے پوچھا۔

صادق بھائی نے ترجمہ کیا..... دس فول از سے اِنگ.....

'اوہ..... یس.....' اریک ہیسٹنگز کے چہرے کی سلوٹیں ختم ہوئی تھیں..... لیکن اب یہی سلوٹیں محمد علی بھائی کے چہرے پر 'اُچھل' کر چھا گئی تھیں____

'معاملہ الجھا ہوا ہے____'

'نہیں اُلجھا ہوا نہیں____' صادق بھائی سمجھا رہے تھے____ بس تمہارے سمجھنے کا پھیر ہے۔ آخر نواب سراج الدولہ کے خاندان سے ہو____ ایک بڑے آدمی کی دوسرے بڑے آدمی سے ڈیل ہوئی تھی۔ ڈیل ناکام ہوئی____ ڈھائی سو برس سے زیادہ کا عرصہ گزر گیا____ اور اِس کے بعد.....'

'ڈھائی سو..... کیا یہ کچھ زیادہ____ زیادہ آپ کو نہیں لگتا؟'

'لگتا ہے تو کیا کریں؟' صادق بھائی کے چہرے پر ناراضگی تھی____ یقین بھی ایک چیز ہوتا ہے____ اور محمد علی بھائی۔ یہ تو ایک موقع ہے۔ سنہرا موقع____ تمہارے لئے۔ اِدھر اُدھر مت دیکھو۔ ذرا سوچو۔ ڈھائی سو سال پہلے جو ڈیل ہوئی تھی____ وہ اجودھیا، ہری دوار اور ہندوؤں کو لے کر____ اور اب کی ڈیل مسلمانوں کے ساتھ____ تمہارے ساتھ۔ امریکہ، انگلینڈ سب تمہارے ساتھ ہیں____'

'کہاں ساتھ ہیں؟'

'کیوں؟'

اُسامہ کیا پہلے ہمارے آدمی تھے۔ اُن کے تھے۔ ایک ڈیل تو اُن کی بھی ہوئی تھی۔ کیا ہوا اور بغداد میں عراق میں، ہم کیا اردو اخبار بھی نہیں پڑھتے ہیں۔

محمد علی بھائی کی سرمہ لگی آنکھوں میں، 'ذہانت' کے چودہ طبق روشن ہو گئے تھے۔

سب کرۂ باد کی وجہ سے۔ اُس وقت زمین کا کرۂ باد بدل گیا تھا۔ ریشمی کپڑے پہننے والوں کو پھپھولے نکل جاتے تھے۔ بڑے بڑے دانے چیچک جیسے۔ انگلینڈ میں اس کو لے کر میٹنگ ہوئی۔ وارن ہیسٹنگز بھی شامل ہوئے اور کہا گیا اس وقت ہندوستان سے درآمد کئے ہوئے ریشم سے انگلینڈ میں تیار کیا گیروا یا بھگوا کپڑا ہندوستان بھیجنا مشکل ہے۔ یہ ہندو ذات کو نا صرف پریشانی میں ڈالنے جیسا ____ بلکہ اس سے انگلینڈ کے راجاؤں کے لئے اُن میں یقین میں بھی کمی آئے گی اور یہ ڈیل ہوئی تھی ____ تمہارے پُروجوں میں سے ایک لیاقت الدولہ سے، جن کی لکھنؤ سے مُیا محل اور کلکتہ کے مُیا برج تک طوطی بولتی تھی۔

✦ ✦

قارئین

یہ قصہ بھی ڈھائی سو سال پہلے کا ہے اور اس کہانی میں تاریخ اتنا ہی ہے، جتنا دال میں نمک اور سچی بات یہ ہے کہ ہماری اس کہانی میں 'سانڈ' کا کوئی تذکرہ نہیں ہے اور جو تذکرہ ہے، وہ ٹوپی کا ہے۔ اس میں ڈھائی سو سال پہلے کی تاریخ آ تو گئی ہے۔ مگر اتفاق سے۔

اور اتفاق ہی کہنا چاہئے کہ حال فی الحال شروع ہوئے اس قصے کی بنیاد تب پڑی، جب ہندوستان میں غیر ملکی سرمایہ کاری کے سہارے ہندوستان کو اٹھاتے۔ سرکار کا چراغ بجھ گیا اور بام پنتھیوں کے سہارے بنی نئی سرکار نے غیر ملکی سرمایہ کاری پر اپنی ہری جھنڈی تو سنا دی۔ لیکن بحث میں بھی گھر گئے۔ معاشی پالیسیوں اور بجٹ پیش کرنے کے شور شرابے کے دوران ہی وارن ہیسٹنگز کے خاندان کے لوگ نے، سراج الدولہ کے خاندان سے مل کر اپنی نئی ڈیل کی منشا ظاہر کر دی تھی اور جیسا میں نے بتایا، اس میں نمک برابر اتہاس کا دخل تو رہے گا۔ پلاسی کی جنگ، ایسٹ انڈیا

کمپنی کی حکومت اور ہندوستان کا غیر ملکی حکومت کا غلام بن جانا ۔۔۔ یہ واقعہ، (اتفاق ہی ہے) اس کہانی سے جڑی ہے۔ اورنگ زیب کی موت کے بعد اُس کی اولادوں کی خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ سارے صوبوں میں بدامنی پھیلنے لگی۔ مغلیہ حکومت کے دو اہم صوبے دکن اور بنگال، خودمختار بن گئے۔ بنگال میں علی وردی خاں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے دائرے کو بڑھنے سے روک رکھا تھا۔

1756 میں علی وردی خاں کی وفات ہوئی اور اُن کی وصیت کے مطابق سراج الدولہ کو بنگال کا نواب تسلیم کرلیا گیا۔ دہلی حکومت اتنی کمزور ہوچکی تھی کہ اُس سے فرمان حاصل کرنا ضروری نہیں سمجھا گیا۔ سراج الدولہ کو بنگال کا نواب تسلیم کرلیا گیا۔ دہلی حکومت اتنی کمزور ہوچکی تھی کہ اُس سے فرمان حاصل کرنا ضروری نہیں سمجھا گیا۔ دہلی حکومت اتنی کمزور ہوچکی تھی کہ اُس سے فرمان حاصل کرنا ضروری نہیں سمجھا گیا۔ سراج الدولہ کے مقابلہ ایسٹ انڈیا کمپنی، سرمایہ داری کی تیزی سے اُبھرنے والی سب سے بڑی طاقت تھی۔ اس کا مرکزی دفتر لندن میں تھا۔ لیکن شاخیں بمبئی، مدراس اور کلکتہ میں تھے اور جو ایک دوسرے میں سے آزاد تجارت کرتی تھی۔ لیکن وہ آپس میں تعلقات بنائے رکھتی تھیں۔ اٹھارہویں صدی میں مرکزی حکومت کی کمزوری کی وجہ سے ایسٹ انڈیا کی شاخوں نے مقامی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا۔ مدراس کلکتہ میں کمپنی کے چالاک افیسر بھیجے گئے تاکہ ہندوستان کی بڑی منڈی پر دھاوا بولا جاسکے۔ ایسے افسران میں وارن ہیسٹنگز بھی تھا جو 1772 میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا گورنر بنا۔

اُس وقت ہندوستان کی آبادی کا ایک بڑا حصہ انیسویں صدی کے پہلے دہائی تک متفرق صنعتوں میں لگے تھے۔ بُنکاری، عوام کا قومی روزگار تھا۔ لاکھوں عورتیں کتائی سے اپنے پریوار کے لئے کمائی کرتی تھیں۔ انگریزی چمڑے کا کام سے لاکھوں کو روزگار ملتا تھا۔ وارن ہیسٹنگز نے طے کیا، کچے ریشم کی پیداوار کو بڑھاوا دیا جائے۔

ہدایت نامہ جاری ہوا۔ ریشم کے کاریگر، کمپنی کے کارخانوں میں کام کریں اور جو نہیں کریں گے، سزا کے حقدار ہوں گے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستان میں ریشم اور سوتی کپڑوں کا بننا کم ہوگیا۔ جن لوگوں نے پچھلی صدیوں میں یوروپ اور ایشیا کے بازاروں میں یہ مال غیر ممالک سے بھیجے تھے، وہ ہی ان مالوں کو بڑھتے ہوئے مقدار میں باہر سے منگانے لگے۔

کمپنی کا اختیار نامہ 1813 میں رینول ہوا۔ تلاش کی گئی۔ گواہیاں ہوئیں۔ وارن ہیسٹنگز، ٹامس منٹو، سر جان میلکم وغیرہ گواہوں کی گواہیاں لی گئیں۔

وارن ہیسٹنگز کا بیان نپا تلا تھا۔ ہندوستانی پیداوار کے بارے میں وہ اتنا بھر جاننے کے بارے میں دلچسپی رکھتے ہیں کہ برٹش مال کس طرح یہاں اپنی جگہ بنا سکتا ہے اور ہندوستانی صنعت کی قیمت پر کس طرح برٹش صنعت پنپ سکتے ہیں۔

وارن ہیسٹنگز سے پوچھا گیا۔ کیا ہندوستانی عوام، اپنے استعمال کے لئے یوروپ کے مال کی مانگ کرسکتی ہے۔

وارن ہیسٹنگز نے جواب دیا تھا ___ ہندوستان کے غریبوں کو کسی کمی کا احساس نہیں ہے۔ اُنہیں چاہئے تھوڑا تھوڑا، روٹی کپڑا اور مکان۔ یہ ساری چیزیں وہ اپنی دھرتی سے پا سکتے ہیں۔

سر جان میلکم کا ماننا تھا، ہندو باہمت، اُداس اور بھلے مانس ہیں وہ سچے اور کھرے ہیں۔ وہ ولایتی مال نہیں کھپا سکتے۔ کیونکہ اُن میں خریدنے کی شکتی نہیں ہے۔ وہ آسان اور سادہ زندگی ہی گزارا کرتے ہیں۔

'لیکن اُنہیں یہی آسان اور سادہ زندگی غیر ممالک سے مہیا کرائی جائیں تو؟'

وارن ہیسٹنگز کا جواب تھا: شاید اسی دن کے لئے وہ یہاں بھیجے گئے ہیں۔

✦ ✦

یہی وقت تھا، جب کمپنی کے کارخانوں کی وکالت کرنے والے سراج الدولہ کے

بھائی لوگوں میں سے ایک لیاقت الدولہ وارن ہیسٹنگز کے رجوع میں آئے تھے اور اُن سے ہیسٹنگز کے مکالمے کچھ اس قسم کے رہے۔

'ساتھ دو گے؟'

'ہاں۔'

'بڑی ڈیل بڑا پیسہ۔'

'آپ حاکم۔'

'ریشم کے کپڑے بنگال تک محدود ہیں۔ تم مرشد آباد کے۔'

'جو حکم حاکم۔'

ہمارے پاس بارہ ریزیڈینسیاں اور کئی کارخانے ہیں۔ کچھ جگہ پٹنی ریشم، مہین ریشم کے مال بنتے ہیں۔ ہمیں اچھے مہین ریشم چاہئے۔ ہندوؤں کو وہی کپڑے دو، جو وہ پہنیں، وہی کھانے کو دیں، جو وہ کھائیں اور وہی رہنے کو دو جو..... ان سے سستے میں ریشم لو۔ مال ولایت بھی بھیجا جائے گا۔ انہیں بھگوا ریشم کی دھوتی، ریشم کے کُرتے اور ریشم کی جنیئو دو۔ لیاقت الدولہ لاکھوں میں کھیلو گے تم۔

لیکن لیاقت الدولہ کے لاکھوں میں کھیلنے کا سپنا پورا نہیں ہوا۔ ہندوستانی آزاد پیدا کار کے لئے، کمپنی کا قدم سیدھے سیدھے اُنہیں اور غلام کرنا تھا۔ اختیار نامہ کے رینول کی بات ہوئی۔ شور شرابا ہوا اور لیاقت الدولہ سے ہونے والی بڑی ڈیل انگریزوں کی دھوکہ بازی کی بھینٹ چڑھ گئی۔

اِس المیہ کو وارن ہیسٹنگز نے اپنی ڈائری میں یوں لکھا:

'جو کچھ ہوا، اُس سے ہمارے برٹش کے کام کرنے والوں کو تعجب نہیں ہونا چاہئے۔ یہ بات یاد رکھنی چاہئے ہندوستان کے کام کرنے والے، انگلینڈ کے کام کرنے والوں سے، پہلے اِس صنعت میں ہیں۔ ان کے اپنے حدود ہیں۔ پانی اور کھانا کم ملتا ہے پھر بھی اُن میں محنت کی لگن غضب کی ہے ہم یعنی برٹش کام کرنے

والوں سے، پہلے سے اِس صنعت میں ہیں۔ان کے اپنے حدود ہیں۔ پانی اور کھانا کم ملتا ہے پھر بھی اُن میں محنت کی لگن غضب کی ہے ہم یعنی برٹش کام کرنے والوں سے زیادہ ہم ہندوؤں کو نہیں لبھا پائے، لیکن ایک دن ___ آنے والے دنوں میں سے کسی ایک دن ہندوستانیوں کے ساتھ مل کر ہمیں اس آنے والے دنوں میں سے کسی ایک دن ہندستانیوں کے ساتھ مل کر ہمیں اِس طرح غیر ملکی سرمایہ کاری کو بڑھاوا دینا پڑے گا۔ ہندوستان انوکھی صلاحیت والا، انوکھا ملک ہے اور یہ یاد رکھنے کی بات ہے وہاں مذہب ہی 'اعلیٰ' ہے۔ مستقبل میں ہندوستان ہی سب سے بڑا بازار سے بننے کی گنجائش بھی رکھتا ہے۔

قارئین

قصہ کوتاہ، یہ وہی پُرزہ تھا، جسے چاندی کے ورق میں جیسی صدوقچی میں رکھ کر، انتہائی حفاظت سے اریک ہیسنگر نے نکال کر اُس کے سامنے رکھا تھا ___ لو، دیکھو.....

محمد علی بھائی کے ہاتھ بڑھانے بھر سے وہ تھرتھرانے لگا تھا۔

صادق بھائی نے ترجمہ کیا ___ 'چھونا مت، صرف دیکھنے کی چیز.....'

'لیکن.....'

'لیکن کیا؟'

'دیکھوں تو سہی کیا لکھا ہے۔'

'تاریخ، اتہاس، اتہاس کو چھو سکتے ہو تم.....'

'نہیں.....'

'دیکھ تو سکتے ہو۔'

'کیا؟'

'وہی جو حال کا اتہاس ہے۔'

'حال کا اتہاس.....؟'

'یس۔ جو تم نے بنایا..... تم نے۔'

اُجلے آدمی کا چہرہ خوشی سے جگمگا رہا تھا۔ وہ ایک بار پھر کچھ کہہ رہا تھا اور اُس کا ترجمہ ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

پہلی ڈیل اجودھیا، ہری دوار، لیکن اب تمہاری پہلی ہندوؤں کی اور جب تمہاری یعنی مسلمانوں کی۔ اجودھیا کی ڈیل وہیں ہوسکی۔ وہ کمزور تھے۔ سچے اور بھولے بھالے۔ اور تم سے تو ڈر لگتا ہے۔ تم تو ورلڈ ٹریڈ ٹاور بھی گرا دیتے ہو۔ ایک دم ورلڈ ٹریڈ سے زیرو آور تمہارے اُسامہ تمہارے صدام ____ سمجھ رہے ہو نا تم نے، تم نے ایک ہو کر سرکار گرا دی۔ 'ہندتو' کی سرکار کس نے گرائی۔ تم نے کیونکہ پہلی دفعہ ایک تھے تم اور بابری مسجد، ورلڈ ٹریڈ ٹاور منہدم کئے جانے سے گجرات تک تم زیادہ سے زیادہ مسجدوں میں پہنچ رہے ہو۔ لُک ____ زیادہ سے زیادہ، تمہیں زیادہ سے زیادہ ٹوپیاں چاہئیں۔ ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں۔ پہلے والی جو ڈیل نہیں ہوئی تھی، ہم اُس کی قیمت چکا دیں گے۔

'کیا چکائیں گے؟'

محمد علی بھائی کا جسم، اچانک چلنے والی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے سے لرز رہا تھا ____

'جو مانگو کے ملے گا۔'

'مانگ۔ مانگ نا.....' صادق بھائی کی بڑی بڑی آنکھیں ایسی ہوگئی تھیں، جیسے اُنہوں نے تندور میں 'سینکے' جانے والے تندوری چکن کو تاڑ لیا ہو۔

'چلو ہم ہی دیتے ہیں۔' اریک ہیسنگر لٹانے پر آ گئے تھے۔

'دہلی تم کو دیا۔'

'دہلی.....'

'ہاں ____ معنی دہلی مارکیٹ۔' صادق بھی ہنسے۔

محمد علی بھائی کی آنکھیں جیسے پتھر تھیں۔ ایسے دہلی کیسے دے دیا۔ دہلی تو کبھی مغلوں کی، کبھی انگریز، کبھی باجپائیوں کی اور کبھی سونیا کی ہے۔

'چلو لکھنؤ لے جاؤ، اودھ دے دیا۔'

'اودھ؟'

'معنی پورے اودھ کا مارکیٹ۔' صادق بھائی کھلکھلا کر ہنس رہے تھے ____

'دیکھتے کیا ہو۔ مصافحہ کرو۔ مصافحہ اتنی بڑی ڈیل۔'

'ارے ہاتھ بڑھاؤ۔'

اُس نے ہاتھ بڑھایا۔ یعنی محمد علی بھائی نے ہاتھ بڑھایا مصافحہ یعنی ہاتھ ملانے کے لئے اور ٹھیک اسی لمحہ وہ اپنی دنیا، بستی حضرت نظام الدین اور ٹھیلے کی دنیا میں واپس آ گئے۔ اریک ہسنگر تھوڑا سا محمد علی بھائی کے کالے مٹ میلے، کھردرے ہاتھوں کو بڑھا دیکھ کر تھوڑا اُٹھٹھکا تھا۔ ٹھیک ایسے ہی اُسے کرنٹ لگا تھا، ایک بار جب دو سال کی ڈیوٹی پر 'شیخ' کی جنت، کار چلانے وہ سعودی گیا تھا۔ فائدہ اتنا ہوا کہ دو سال میں 'عمرہ' بھی کر آیا اور حج بھی ہو گئے۔ وہاں رہتے، سہتے، کار چلاتے ہوئے محمد علی بھائی کی آنکھوں میں اتنی روشنی بڑھی تھی، جتنا اِس ڈیل کا سن کر بھی نہیں بڑھی۔ بس، وہ تو ایک دن، شیخ کے حساب کتاب کو لے کر دُکھی محمد علی بھائی نے سلام ٹھونک دیا ____

'سلام شیخ۔ اپنا ٹھیلا پیارا۔ اپنی بستی حضرت نظام الدین پیاری۔ تبلیغی جماعت کا دفتر پیارا اور اپنی پلّی دوپلّی ٹوپیاں پیاری۔ میں تو چلا ____'

'کیا سوچنے لگے؟' صادق بھائی نے جھٹکا دیا تو اُسے خیال آیا۔ اریک ہسنگر نے مصافحے کے لئے اپنا ہاتھ پینٹ کی جیب سے باہر نہیں نکالا ہے۔

'مجھے سوچنے کا ٹائم چاہئے۔'

'ٹائم؟'

'آخر ڈیل ہے۔مذاق ہے۔'

اریک ہیسنگو کے پوچھنے پر صادق نے ترجمہ کیا____ ہی ٹولڈ.....

'اوہ یس۔یس.....'

صادق بھائی نے بتایا____ 'ہم پھر آئیں گے۔سوچنے کے لئے دو دن کی مہلت ہے۔اُس کے پاس اور ہاں۔کل یہ تمہارے ساتھ لنچ بھی کریں گے۔یہیں کریم میں اور____ تمہارے کارخانے سے ملیں گے، جہاں تمہاری ٹوپیاں بنتی ہیں۔ ہے ss ای۔مسٹر محمد علی ٹھیک؟'

صادق بھائی، محمد علی بھائی کی سرمہ لگی آنکھوں میں جھانک رہے تھے۔جاتے جاتے تپاک سے ہاتھ ملایا۔اریک بھائی کی مرسڈیز باہر تھانے کے پاس لگی تھی۔ بستی حضرت نظام الدین سے باہر نکلتے ہی تھانہ ہے۔وہاں عام طور پر بستی یا فاتحہ پڑھنے آنے والے لوگ گاڑیاں لگا دیا کرتے ہیں اور ان گاڑیوں کے لئے یہیں کے رہنے والے پانچ دس روپے لے کر گاڑی کی حفاظت کرتے ہیں۔ہوسکتا ہے، تھانے بھی کچھ پیسے پہنچ جاتے ہوں۔مگر یہ بات یقین سے اس لئے بھی نہیں کی جاسکتی، یہاں سارا علاقہ'..... مطلب نیکی کا۔جو بھی کام کرو گے، محبوب الٰہی خوش ہوں گے۔

'کریم میں کھانا کھائیں گے؟'

اتنی بہت ساری باتوں میں جو بات محمد علی بھائی کو یاد رہی، وہ یہ تھی کہ کریم میں کھانا کھائیں گے۔کریم مطلب اسٹیٹس سمبل۔یہاں، ٹھیلا لگانے سے پہلے سے ہی وہ کریم کے بارے میں کتنی کہانیاں سنتا رہا۔جب کے کریم ہے ہی کتنی دور۔ٹھیلے سے دس قدم ناپ لو۔دروازہ پر باوردی چوکیدار آتے ہی سلام داغتا ہے۔

کریم میں کھانے کی 'ہمت' اپنی جگہ تھی۔مگر____ یہ بات بھی بار بار پریشان کرتی

تھی کہ وہ اریک بھائی کو جواب کیا دیں۔ اچھا ہے، کریم کی دھیمی دھیمی روشنی میں برسوں کا خواب پورا کریں اور اریک بھائی کو جواب دیں۔ ایسا ممکن ہی نہیں۔

ایک بات اور تھی ____ اریک بھائی نے کہا تھا ____ جہاں ٹوپیاں بنتی ہیں، وہ اُس کا خانے کو بھی دیکھنا چاہئیں گے۔ آخر کو لمبی ڈیل کا سوال ہے۔ جتنا مال یا آرڈر چاہئے، اُس حساب سے اریک بھائی اس ٹوپی مارکیٹ کی 'ٹوہ' لینا چاہتے تھے.....

بے حد اشتعال میں ڈوبی رات کیسی ہوتی ہے، یہ پہلی بار محمد علی بھائی نے جانا۔ رات بھر رہ رہ کر کروٹیں بدلتے رہے۔ کبھی بچوں کو چھوتے۔ کبھی اُٹھ کر بیوی کے ہونے کا احساس کرتے۔ کیا سچ مچ اُن کی ڈیل ہوگی۔ کیا اِس ڈیل سے اُن کی دنیا بدل جائے گی۔

✦ ✦

صبح چھ بجے ہی صادق بھائی گاڑی لے کر گھر آ گیا۔ اریک بھائی بستی حضرت نظام الدین، درگاہ پر پہنچ چکے تھے اور اندر آستانے میں گورے چٹے مجاوروں کو دنا دن سو دو سو کی رسید اور صندوقہ لئے بیٹھے 'تاجروں' نے اریک بھائی کو محاصرہ میں لے لیا تھا۔ یہ کوئی بہت اچھا منظر نہیں تھا، محمد علی بھائی کے لئے۔ ایک لمحہ کو رات والا سپنا 'فر.....ر' ہو گیا۔ اریک بھائی نے اُسے دیکھ کر خوشی ظاہر کی مگر محمد علی بھائی کے چہرے پر 'سرد مہری' پسری رہی۔

'تو چلیں۔' صادق بھائی نے پوچھا ____

'صفیہ کی ڈیری' ____ یہی وہ جگہ تھی، جہاں محمد علی بھائی کی ٹوپیاں بنا کرتی تھیں۔ تین بڑے بڑے ہال تھے، زیادہ تر عورتیں تھیں، جو یہ کام کیا کرتی تھیں۔ بستی حضرت نظام الدین کے اندر گلیوں میں یہ 'ڈیری' تھی۔ ایک 'ہال' صرف مشینوں کے نام تھا۔ جہاں پاؤں سے چلنے والی مشینوں پر عورتیں ٹوپی کو آخری شکل دیا کرتی تھیں۔ سوت، ریشم، جھالے سے لے کر مشین ایک ایک چیز کو اریک بھائی دیکھتے

رہے۔تب ایک سورج کافی سر چڑھ آیا تھا۔اب منزل تھی کریم کی۔صادق بھائی کا خوف یہ تھا کہ بات بن جائے اور اُن کا کمیشن نہ جائے۔

جبکہ محمد علی بھائی کی پیشانی پر اُگنے والی تیسری آنکھ اب تھوڑی تھوڑی کھلی تھی۔وہ نا زیادہ جوش میں تھے، نا حوصلہ افزا، وہ ٹھیک ایسے ہی ہندوستانی تھے، جیسے 'ہندوستانی ہندوؤں کے لئے وارن ہیسٹنگز نے اُس ڈیل کے بارے میں غور کیا تھا____ 'یعنی سب کچھ تھوڑے تھوڑے میں مطمئن رہنے کا نظریہ اور یہ نظریہ کسی بھی مارکیٹ اسٹریٹجی کو منہدم کر سکتا تھا۔

✦ ✦

'ملٹیپن____ 'صادق بھائی اُس کی طرف مڑے____ تب ہندوستان میں تین قسم کے شہتوت تھے۔یوروپ میں اُگایا ہوا سفید شہتوت، چین میں اُگایا ہوا کالا بیگنی اور ہندوستانی شہتوت۔تین قسم کے کیڑے تھے۔دیسی، اٹلی اور چین کے کیڑے۔

اریک بھائی نے ایک چھوٹی سی ڈائری کھولی____ کمپنی کے پاس 12-13 ریشم گھر تھے۔کمپنی پیشگی دیتی تھی۔لیکن کمپنی پر پہلا الزام تو یہی لگا کہ ہندوستانی سیاست آزادی کے ساتھ ساتھ معاشی اور صنعتی آزادی بھی کھوتی جا رہی ہیں۔

'وہ گواہوں' مقدمہ، مزاحمت سے تھوڑے اُداس سے تھے۔وہ تو سطح تجارت بڑھانا چاہتے تھے۔شاید اِسی لئے 'بھاگی رتھی' کے پاس وہ ایک بار پھر لیاقت الدولہ سے ملے۔ملنا طے ہوا۔رات 7 اور 8 کے درمیان۔وارن ہیسٹنگز اپنی گھوڑا گاڑی میں تھے۔لیاقت الدولہ کو گھر نہ بلانے کے پیچھے بھی کئی وجہیں تھیں، جیسے مقدمہ سے پہلے کچھ تیار کردہ ریشمی گیروا کپڑوں کے کچھ تھان ہری دوار، بنارس اور برندا بن جیسے بازاروں میں پہنچائے گئے تھے...... 'پہلی بار۔لو شروع کرو____'

اریک ہیسٹنگز اُس کی طرف مڑے۔کریم کی میز پر خوشبو دیتا کھانا رکھ دیا گیا تھا۔

لذیذ پکوان باوردی ویٹر ۔سر جوڑے کھڑا تھا۔اُس نے دیکھا،صادق بھائی قورمے کا گوشت اپنی پلیٹ میں ڈال رہے ہیں۔

اور یہ کہانی کا ڈراپ سین ہے۔مقدمہ یا ناش اسی بات پر تھا۔پتہ نہیں کس نے منڈی میں افواہ اُڑا دی کہ ریشم کے مال میں گائے اور سور کی چربی ملی ہوئی ہے۔اِٹس ٹوٹل نانسینس اینڈ انڈاُنجسٹیبل الگ الگ علاقوں سے دنگے پھیلنے کی خبر آچکی تھی۔اور......

اریک ہیسٹنگز نے گوشت کا نوالہ توڑا____ ٹھیک اُسی وقت وارن ہیسٹنگز کی گھوڑا گاڑی 'بھاگی رتھی' کی طرف بڑھ رہی تھی کہ راستے میں ہی اُنہیں دیوانی کا ایک آدمی گھوڑا بھگاتا اُن کے پاس آیا اور بولا____ آگے نہ جائیں۔لیاقت الدولہ مارڈالا جاچکا ہے۔کمپنی کی فوج الرٹ ہے۔کچھ پاگل ہندوستانی ہیں،جنہیں سمجھنا ضروری ہے۔بہتر ہے کہ......؟'

وارن ہیسٹنگز پر لگنے والے اِس امپیچمنٹ کے مقدمے میں خلاصہ کیا گیا____

''ہندوستانیوں کو ہندوستانیوں کے انداز میں ہی سمجھا جائے۔اُن کے مذہب کو چھیڑے بغیر۔وہ مذہب کے معاملے میں شہد کی مکھی کے چھتوں کی طرح ہیں۔جس سے اُن پر حکومت کرنا آسان نہیں رہ جائے گا۔''

✦ ✦

قارئین!

قصہ کوتاہ۔شام ڈھل گئی تھی۔بستی حضرت نظام الدین اندھیرے میں ڈوب گئی تھی۔کریم میں کھانے کے بعد تھوڑا سیر سپاٹا ہوا۔پھر وہ ہمایوں کے مقبرے کی طرف نکل گئے۔واپس لوٹنے تک چراغ روشن ہو چکے تھے۔گاڑیوں کا شور تھم گیا تھا۔آسمان پر تارے ٹمٹما آئے تھے۔اریک آہستہ سے بولا____ ڈھائی سو برس اتہاس،اتہاس بدلنے کے لئے کافی ہوتے ہیں نہیں؟

'ڈیل ......' صادق بھائی بتا رہا تھا ___ 'سر! جنون تو وہی ہے۔ اجودھیا سے گودھرا اور گجرات تک۔'

'اب ہندو دھوتی کم پہنتے ہیں۔' اریک بھائی آہستہ سے ہنسا ___ لیکن مسلمان ٹوپی ضرور پہنتے ہیں۔ اور پوری دنیا میں بستی حضرت نظام الدین سے نکارگوا، اور چین سے جاپان تک۔ پچھلی ڈیل ناکام ہوگئی تھی لیکن ......

مرسیڈیز دور کھڑی تھی۔ چاند کی روشنی میں، اندھیری سڑک پر تین بھوتوں کے سائے زمین پر نشان بناتے چل رہے تھے ......

اریک بھائی انگریزی میں بولے ___

صادق بھائی نے ترجمہ کیا ___ ''تم ساتھ دو۔ اِس بار ٹوپی ہم پہنائیں گے۔ مسلمانوں کو۔''

آخری دو لفاظ وہ اتنے آہستے سے بولے کہ سامنے سے آتی گاڑی کے ہارن کے درمیان یہ الفاظ دب کر رہ گئے تھے۔

ڈراکیولا

مصنف کا بیان

’’میں ہر بار تمہارے گھر کی الگنی پر گیلے کپڑے کی طرح ’ٹنگی‘ رہی۔ تم میرے لئے مٹھی مٹھی بھر دھوپ لاتے تھے۔ اور میں تھی، برف جیسی یخ ___ دھوپ تمہاری مٹھیوں سے جھر جھر جاتی تھی...... سوکھتی کیسے میں......؟ تمہارے ہی گھر کی الگنی پر ٹنگی رہی۔ دُکھ دینے کے لئے تمہیں۔‘‘

وہ کچھ ایسا ہی سوچتی تھی۔ اپنے بارے میں ___ وہ یعنی، صوفیہ مشتاق احمد۔ اُسے اپنے بارے میں کچھ بھی سوچنے کا حق حاصل تھا۔ جیسے یہ کہ راتیں کیوں ہوتی ہیں؟ جیسے یہ، کہ آسمان پر ٹمٹماتے تاروں میں، اُس کی بھولی بسری عمر کیسے سما جاتی ہے۔ جیسے یہ کہ صبح کیوں ہوتی ہے۔ سورج کیوں نکلتا ہے۔ دھوپ سے زندگی کا کیسا رشتہ ہوتا ہے ___؟

قارئین، مجھے احساس ہے کہ میں نے کہانی غلط جگہ سے شروع کر دی۔ اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ایسا میرے ساتھ اکثر ہوا ہے۔ مگر پیارے قارئین، مجھے اس بات کا اعتراف کر لینے دیجئے کہ مجھے اس کہانی کو لکھنے کا کوئی حق نہیں تھا اور یقین جانیے، اس کہانی کے کرداروں سے، ملنے سے قبل تک مجھے اس بات کا احساس تک نہیں تھا کہ زندگی سے جڑی بے حد معمولی سچائیاں اتنی تلخ، اتنی سنگین بھی ہو سکتی ہیں ___ مجھے یہ بھی احساس ہے کہ آج کے عہد میں، جس کے بارے میں یہاں تک کہا جاتا ہے کہ اس سے زیادہ مہذب ترین دنیا کا کوئی تصور جارج بش کے پاس بھی نہیں ہے ___ اور نیوکلیائی ہتھیاروں کی، انسانوں کے قتل عام کی اس سے بدصورت مثال شاید تاریخ کے بے رحم صفحوں پر بھی مشکل سے ہی ملے گی ___ مجھے احساس ہے کہ انسانی بم، جینوم، کلوننگ اور نیو ٹکنالوجی کے اس عہد میں میں آپ کو

ایک ایسی کہانی سنانے جارہا ہوں، جس پر چوتھی دنیا کے مہذب ترین لوگ شاید ہی بھروسہ کرسکیں ___ انسانوں کو غلام بنانے والی کہانیاں اور غلاموں سے کیڑے مکوڑوں سے بھی زیادہ بدترین سلوک کی فنتاسیاں، معاف کیجئے گا، لوگ بھولے نہیں ہیں ___ تاریخ کے صفحات اذیت اور جبر کی مثالوں سے بھرے پڑے ہیں ___ لیکن یقین جانئے، میں ایسی کوئی رس بھری، لذیذ داستان آپ کے سامنے رکھنے نہیں آیا ___ اور آپ ہنسیں گے، یقیناً آپ کو ہنسنا چاہئے ___ کہ خود کو مہذب ثابت کرنے کی ریس میں اگر آپ کو کوئی ایسا قصہ سنایا جائے کہ عظیم طاقتوں میں سے ایک بننے جارہے ملک ہندستان میں، سن 2005 میں، ایک مسلمان لڑکی اپنی شادی کے لئے، 'شاہزادوں' کا انتظار کرتے کرتے تھک گئی اور اچانک ایک دن اُس نے ایک تنہا، اُداس کمرے میں ___ آسیبی داستانوں کے مشہور زمانہ کردار **ڈراکیولا** کو دیکھ لیا ___ تو چونکئے گا مت ___

اور یقین جانیے، ہماری اس کہانی کی کردار صوفیہ مشتاق احمد کے ساتھ یہی ہوا ___

✦ ✦

آدھی رات کا گجر بج چکا تھا۔ کمرے میں زیرو پاور کا بلب جل رہا تھا۔ باہر خوفناک آندھیاں چل رہی تھیں۔ پتّے سرسرا رہے تھے۔ باہر کوئی جنگل نہیں تھا۔ پھر بھی چمگادڑوں، بھیڑیوں، اُلّو اور طرح طرح کی خوفناک آوازیں رات کے پُراسرار سناٹے کو اور بھی زیادہ خوفناک بنا رہی تھیں اور یقیناً یہ دستک کی آواز تھی ___ نہیں۔ کوئی تھا، جو دیواروں پر رینگ رہا تھا ___ کیا ویمپائر ___ ؟ اُف، خوفناک آوازوں کا ریلا جسم میں دہشت کا طوفان برپا کرنے کے لئے کافی تھا۔ سہمی ہوئی سی وہ اٹھی۔ بدن میں کاٹو تو خون نہیں ___ وہ اٹھی، اور تھرتھراتی، کانپتی کھڑکی کی طرف بڑھی۔ لڑکھڑاتے کانپتے ہاتھوں سے کھلی کھڑکی کے پٹ بند کرنے چاہے

تو ایک دم سے چونک پڑی ___ کوئی تھا جو دیواروں پر چھپکلی کی طرح رینگ رہا تھا۔ اُف۔ اُس نے خوفزدہ ہو کر دیکھا۔ یقیناً یہ ڈراکیولا تھا، ہونٹ انسانی خون سے تر ___ دانت، لمبے، بڑے اور سرخ ___ وہ اپنے 'کوفن' سے باہر آیا تھا۔ صبح کی سپیدی تک اپنے ہونے کا جشن منانے یا پھر انسانی خون کا ذائقہ تلاش کرنے..... وہ یکبارگی پھر خوف سے نہا گئی۔ کسی اسپائیڈر مین کی طرح ڈراکیولا اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دیوار پر آرام سے چھپکلی کی طرح ___ پنجوں پر اُس کی گرفت مضبوط تھی۔ وہ اُسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس کی گھگھی بندھ گئی۔ وہ چیخنا چاہتی تھی مگر..... رینگتا ہوا، ڈراکیولا، ایکدم، دوسرے ہی لمحے اُس کے کمرے میں تھا ___ اُس کی آنکھوں میں وحشیانہ چمک تھی..... اور اُس کے نوکیلے دانت اُس کی نازک ملائم گردن کی طرف بڑھ رہے تھے..... اُس کی آنکھوں میں نیم بے ہوشی کی دھند چھا رہی تھی ___

مصنف سے صوفیہ مشتاق احمد کی بات چیت

'اُف، ڈراؤنا خواب، لیکن اس صدی میں ڈراکیولا ___ آپ کتابیں بہت پڑھتی ہیں، ڈراؤنی کتابیں؟'

'نہیں پڑھتی۔'

'پھر یہ خواب'

'نہیں، یہ خواب نہیں ہے۔ دیکھئے.....'

مصنف کے لئے یہ صبر آزما لمحہ تھا۔ یقیناً اُس کی گردن کی ملائم جلد کے پاس کئی داغ تھے ___ لیکن کیا یہ ڈراکیولا کے نوکیلے دانتوں کے نشان تھے، یا..... مصنف اِن 'اذیت گزار' لمحوں کے سفر سے، پھیکی ہنسی ہنستا ہوا اپنے آپ کو باہر نکالنے کا خواہشمند تھا ___

'یقیناً یہ داغ..... آپ سمجھ رہے ہیں نا، ایک صبح ہم اُٹھتے ہیں۔ اور کیڑے

نے..... کیڑا..... آپ سمجھ رہے ہیں نا.....؟'

صوفیہ مشتاق احمد کا چہرہ اس وقت، لیوناڈوی ونچی کی پینٹنگ مونالزا کی طرح ہو رہا تھا، جس کے تاثر کو آپ لفظوں کا لباس پہنا ہی نہیں سکتے۔ یقیناً..... وہ کیڑا ہی تھا۔ نوکیلے دانتوں والا ایک خوفناک کیڑا..... اور آپ سے زیادہ بہتر کون جانے گا کہ اس صدی میں انسان سے زیادہ خوفناک کیڑا..... دوسرا کون ہو سکتا ہے.....'

ہے..... ہے..... ہے.....، مصنف پھیکی ہنسی ہنسنے پر مجبور تھا..... 'یہ سب تو دانشوری، دانشمندی کی باتیں ہیں۔ ہے..... ہے.....'

مصنف کے الفاظ کھو گئے تھے..... لیکن وہم و گمان کی ایک بے نام سی کہانی یہ بھی تھی کہ مصنف نے وہ داغ دیکھے..... اور یقیناً وہ داغ اُس کی گردن پر موجود تھے.....

لیکن اس کہانی کے ساتھ اس بے معنی گفتگو، ڈراکیولا، صوفیہ مشتاق احمد کی گردن میں پڑے ڈراکیولا کے نوکیلے دانتوں کے نشان کا کوئی رشتہ نہیں ہے ____ لیکن یقیناً اس گفتگو کے بعد ہی اس کہانی کی بنیاد پڑی تھی، اور یقیناً ____ اب جو کچھ میں سنانے جا رہا ہوں، وہ بیان کی شکل میں ہے اور اس بیان میں، میں شامل ضرور ہوں، لیکن یہ یقین کرنا ضروری ہے کہ اس کہانی میں، اپنی طرف سے میں نے کوئی اضافہ یا الٹ پھیر نہیں کیا ہے..... اس سے پہلے کہ الگ الگ بیانات کا سلسلہ شروع ہو، مختصراً اس کہانی کے کرداروں سے آپ کا تعارف کرادوں۔ دلّی جمنا پار رہائشی علاقے میں ایک چھوٹی سی مڈل کلاس فیملی ____ بڑی بہن ثریا مشتاق احمد۔ عمر پینتیس سال۔ ثریا کے شوہر اشرف علی ____ عمر چالیس سال۔ نادر مشتاق احمد، ثریا کا بھائی۔ عمر 30 سال۔ اور ہماری اس کہانی کی ہیروئن (نہیں معاف کیجئے گا، بڑھتی عمر کے احساس کے ساتھ ایک ڈری سہمی سی لڑکی ہماری کہانی کی ہیروئن کیسے ہو سکتی ہے) صوفیہ مشتاق احمد، عمر 25 سال۔

تو اس کہانی کا آغاز جنوری مہینہ کی 8 تاریخ سے ہوتا ہے۔سردی اپنے شباب پر تھی۔سرد ہوائیں چل رہی تھیں۔دانت سرد لہری سے کٹکٹا رہے تھے۔لیکن جمنا پار، پریہ درشنی وہار، فلیٹ نمبر بی 302 میں ایک ناخوشگوار حادثہ وقوع پذیر ہو چکا تھا۔

کوئی تھا، جو تیزی سے نکلا ____ پہلے لڑکھڑایا، پھر باہر والے دروازہ کی چٹخنی کھولی اور تیز تیز، سرد رات اور کہاسوں کے درمیان، سیڑھیوں سے اُترتا ہوا، بھوت کی طرح غائب ہو گیا ____

'وہ چلا گیا.....' یہ جیجو تھا۔صوفیہ مشتاق احمد کا جیجو، آنکھوں میں خوف اور الجھن کے آثار ____ وہ چلا گیا اور ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے۔'

نادر مشتاق احمد نے نظریں اٹھائیں۔منظر کچھ ایسا تھا جیسے ویتنام اور ناگاساکی، ایٹم بم دھماکے کے بعد ندیوں سے اٹھتے ہوئے آگ کے شعلے آسمان چھو گئے ہوں ____ 'کیا ہوا، اُسی سے پوچھتے ہیں۔'

'لیکن، کیا پوچھیں گے آپ ____ ثریا جیجو کی طرف مڑی۔پھر ایک لمحے کو نظر اٹھا کر اُس نے نادر کی طرف دیکھا ____ جذبات پر قابو رکھو، اُف، دیکھو.....وہ کیا کر رہی ہے.....'

'شاید وہ آ رہی ہے.....' جیجو نے ہونٹوں پر انگلی رکھی ____

'کوئی اُس سے کچھ بھی نہیں پوچھے گا۔' یہ ثریا تھی ____

'تم بھی کیسی باتیں کرتی ہو باجی۔کوئی اُس سے بھلا کیا پوچھ سکتا ہے۔وہ بھی اس ماحول.....اور ایسے عالم میں۔لیکن.....کچھ.....'

'کچھ نہیں ہوگا۔'

'ہم نے فیصلہ کرنے میں.....'

ثریا مشتاق احمد، ایک لمبا سانس لیا۔آواز ڈوبتی چلی گئی ____ 'کہہ نہیں سکتی..... مگر ___ اُس نے اپنے شوہر اور نادر مشتاق احمد کی طرف ایک گہری نظر

ڈالی____ ''ہم نے آپس میں بات کی تھی۔اس کے سوا ہمارے پاس دوسرا راستہ ہی کیا تھا۔''

'وہ آرہی ہے اور اب ہمیں خاموش ہو جانا چاہئے____ اور یقیناً ہمارے تاثرات ایسے نہیں ہونے چاہئیں کہ اُسے کسی بات کا شک ہو کہ ہم اُس کے بارے میں کیا سوچ رہے ہیں____ اور یقیناً ہمیں اُس کی نفسیات کو بھی سمجھنا ہوگا۔'

یہ چوتھا____

باہر کہاسا زمین پر گر رہا تھا۔ رات برف سے زیادہ ٹھنڈ ہو گئی تھی____ دروازہ چرچڑانے کی آواز ہوئی۔ برف پگھلی۔ دھند چھٹی۔ سامنے صوفیہ کھڑی تھی۔ صوفیہ مشتاق احمد۔ ایک لمحے کو وہ ان کے پاس آکر ٹھہری۔ لیکن رُکی نہیں____ دوسرے ہی لمحے، وہ اپنے کمرے میں واپس لوٹ گئی____

پہلا بیان: ثریا مشتاق احمد

میں ثریا مشتاق احمد۔ پیدا ہوئی اتر پردیش کے بلند شہر میں۔ محلّہ شیخاواں۔ مسلمانوں کا محلّہ۔ زیادہ تر شیخ برادری کے مسلمان____ پاس میں مسجد تھی۔ پاپا مشتاق احمد کی چھوٹی سی دکان تھی۔ اسٹیشن روڈ پر۔ پنج گانہ نمازی____ پیشانی پر سجدے کے داغ۔ چہرہ ایسا نورانی اور معصوم کہ میں نے زندگی میں آج تک نہیں دیکھا اور ممی تو جیسے گائے تھیں۔ نادر چھوٹا بھائی تھا۔ اُس سے پانچ سال چھوٹا اور صوفیہ مجھ سے دس سال چھوٹی تھی____ بچپن میں چھوٹی چھوٹی آنکھیں مٹکاتی تو شرارت سے سارا گھر خوشی سے جھوم جایا کرتا۔

کالج میں داخلے سے قبل ہی اشرف زندگی میں آگئے تھے____ کیسے____؟ یہ لمبی کہانی ہے۔ چھوٹے سے شہر میں ایسی کہانیوں کے پر لگ جاتے ہیں۔ پھر کبوتر کی طرح پرواز کرتی یہ کہانیاں شیخاواں کے ایک گھر سے دوسرے گھر میں گونجنے لگی تھیں____

مما کو ہائپر ٹینشن تھا____

پپا جلد گھر آ جاتے تھے، طبیعت کی خراب کا بہانہ بنا کر____ پڑوس والی مسجد سے نماز کی صدا بلند ہوتے ہی، وہ تیز تیز لپکتے مسجد پہنچ جایا کرتے۔ وہاں سے آتے، تو لفظوں کے تیر سے اُداس اور گھائل ہوتے____ ممی اور وہ گھنٹوں اشرف کے بارے میں باتیں کرتے رہتے____ مثلاً کیوں آتا ہے۔ کیا کام ہے____ خاندان تو اچھا ہے نا____ یہ لڑکی ناک تو نہیں کٹائے گی۔ صوفیہ تو کافی چھوٹی ہے____

نادر نے صرف ایک بار جلتی آنکھوں سے میری کی آنکھوں میں دیکھا تھا____ بجیا، یہ کیا تماشہ ہے۔ چاروں طرف تم دونوں کے ہی ریڈیو بج رہے ہیں۔

'تو بجنے دو نا.....'

تب گول گول آنکھیں نکال کر صوفیہ نے میری طرف دیکھا تھا۔

'ایک ریڈیو میرے لئے بھی لا دو نا.....'

'پاگل، ایک ریڈیو نے ہی طوفان مچا دیا ہے.....' نادر نا گواری سے بولا

لیکن میں یہ کہانی کیوں سنا رہی ہوں۔ میری اور اشرف کی کہانی میں اگر کچھ دلچسپ ہے تو صرف یہ، کہ ہم نے لو میرج کی تھی۔ پھر اشرف دلّی آ گئے۔ اور میں بھی دلّی آ گئی____ اور جیسا کہ مہانگروں میں ہوتا ہے ایک دن خبر آئی۔ پپا نہیں رہے۔ دوسرے سال خبر آئی۔ ممی نہیں رہیں۔ شیخاواں اُجڑ گیا۔ گھر ویران ہو گیا۔ بلند شہر سے رشتہ ٹوٹ گیا____ نادر اور صوفیہ دونوں دلّی آ گئے۔ کبھی کبھی احساس ہوتا، اشرف ان دونوں کی موجودگی سے پریشان تو نہیں ہیں۔ لو میرج کا یہ بھی ایک فائدہ تھا کہ اشرف کسی بھی بات پر بولتے یا ٹوکتے نہیں تھے۔ مگر من میں کچھ گانٹھیں تو پڑ ہی جاتی ہیں____ کبھی جب اشرف کو، اُن کی اپنی دنیا میں قید اور اُداس دیکھتی تو دل کی بات ہونٹوں پر آ جاتی.....

'وہ..... ایک دن پرواز کر جائیں گے.....'

'ہاں.....'

'کون جانتا تھا، ممی پاپا اس طرح ہمیں ذمہ داریوں سے باندھ کر.....'

اشرف کہیں اور دیکھ رہے ہوتے ____

'تم ان دونوں کی موجودگی کو لے کر..... نہیں میرا مطلب ہے.....'

اشرف گہرا سانس کھینچ کر کہتے ہیں ____ 'بچے ہیں..... لیکن..... پرائیویسی کے یہی دن ہیں۔ یہ دن واپس نہیں آتے..... یہ دن چلے گئے تو.....'

نہیں، مجھے احساس تھا، اشرف کی رومانی دنیا میں نئی نئی فنتاسی اور خوبصورت کہانیوں کی ایک بڑی دنیا آباد ہے..... وہ اکثر اس کا ذکر بھی کیا کرتے..... مثلاً ہنسی ہنسی میں..... 'ثریا، یہ لباس کیوں بنایا گیا..... شادی کے بعد گھر میں میاں بیوی کو لباس نہیں پہننا چاہئے..... نیچرل ڈریس..... آخر ہم قدرتی لباس میں کیوں نہیں رہ سکتے.....؟ بس یہی تو چار دن ہوتے ہیں۔ ایک ساتھ سوئمنگ..... ایک ساتھ.....'

اشرف جب دن میں مجھے لے کر کمرہ بند کرنے کی کوشش کرتے تو وحشت سی ہوتی ____ صوفیہ کیا سوچے گی۔ بڑی ہو رہی ہے۔ پھر جیسے کمرے کے بند سناٹے میں کوئی کیڑا چپکے سے منہ نکالتا ____ اشرف ایکدم سے بوکھلا کر اُس سے الگ ہو جاتے۔ خود ہی آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیتے.....

'جاؤ۔ تمہیں آزاد کرتا ہوں۔'

مصنف سے ثریا مشتاق احمد کی مختصر سی گفتگو کے کچھ حصے

''تو گویا تم سمجھ رہی تھی..... کہ کیڑے.....'

'ہاں.....'

'یقیناً یہ کیڑے صوفیہ نے بھی دیکھے تھے.....؟'

'اور ڈرنے بھی.....'

'پھر؟'

'نادر کو اپنی خودداری کا احساس تھا ___ وہ ایک بوجھ کی طرح اس گھر میں رہنے کے خلاف تھا اور اسی لئے اپنے لئے ایک چھوٹی سی نوکری کا بندوبست کرتے ہی.....'

'اُس نے یہیں تمہارے قریب ایک فلیٹ لے لیا۔'

'ہاں۔اور پھر صوفیہ کو بھی لے گیا.....'

'نہیں۔شروع میں نہیں لیا گیا۔اُسے اپنی مجبوریوں کا احساس تھا۔مگر.....صوفیہ چپ چاپ رہنے لگی ___ سارا سارا دن گم صم ___ اپنے آپ میں کھوئی۔کسی سے بولنا چالنا تک نہیں۔بس جی چاہا تو کبھی کبھی ٹی وی کے آگے بیٹھ گئی۔اُس کا بس چلتا تو سارا سارا دن بستر پر سوئی رہتی ___ مگر جیجو اور پرائے کے گھر میں رہنے کا احساس.....اور اچانک اُس دن.....وہی کیڑا.....

'کیڑا.....؟'

ثریا مشتاق احمد اپنے بیان میں گم ہوگئی تھیں۔

ثریا مشتاق احمد کے بیان کا دوسرا حصہ

مُیا مارفوسس۔آپ نے یقیناً یہ کہانی پڑھی ہوگی۔نہیں، میں کیڑے میں، یا کیڑا مجھ میں تبدیل ہوگیا، ایسی کوئی بات نہیں۔مگر وہ تھا، یہیں ___ کمرے میں ___ صبح، سورج نکلنے سے پہلے ہی، بستر چھوڑتے ہوئے، میں نے اُسے اشرف کی آنکھوں کے پاس رینگتے ہوئے صاف دیکھا تھا۔نہیں، مجھے کہیں سے کوئی غلط فہمی نہیں ہے۔یقیناً وہ تھا۔اور میرے بھگانے سے پہلے ہی.....

اُس دن ارم کا برتھ ڈے تھا۔ارم کون۔میری بیٹی۔اشرف کی آنکھوں کا تارا۔پانچ برس کی ارم کو لے کر اشرف کی آنکھوں میں خوابوں کے اتنے جھومر اور فانوس دیکھے کہ ڈر ڈر جاتی.....وہ ایک خوبصورت شیشے کا ایکوریم تھا، جو اشرف اُس کے

لئے خصوصی طور پر لے کر آئے تھے ___ شیشے کی رنگین دنیا میں تیرتی سنہلی مچھلیاں..... 'یہ سون مچھریاں ہیں.....' اشرف نے کہا تھا ___ ایک دن میری بٹیا اس سے بھی خوبصورت ایک سون مچھلی بن جائے گی ___ انسانی سون مچھلی۔ پھر اپنی ہی بات پر وہ زور سے ٹھہا کہ لگا کر ہنسے تھے۔ گھر سے باہر نکلتے ہوئے شام کی پارٹی کے بارے میں وہ کچھ تفصیلات بتا کر گئے تھے۔ بچوں کی فہرست بن گئی تھی۔ ڈرائنگ روم خوبصورت ڈھنگ سے سجانے کے لئے کہہ گئے تھے..... 'کیڑا'..... ایک بار پھر اشرف کے دروازہ کے باہر نکلتے ہی میں نے کیڑے کی جھلک دیکھی تھی۔ کیڑا..... میں چیختے چیختے رہ گئی ___ تب تک اشرف باہر نکل چکے تھے..... چار بجے شام میں وہ واپس آئے تو ڈرائنگ روم کو ویسے کا ویسا پا کر وہ چیخ اٹھے۔

'صوفیہ کہاں ہے.....'

'وہ..... سو رہی ہے.....'

'کیا۔ سات بجے تک محلے ٹولے کے بچے آجائیں گے اور ابھی تک وہ سو رہی ہے۔ اتنے سارے لوگوں کو پالنے کا ٹھیکا لے لیا ہے تم نے۔ یہ سونے کا وقت ہے..... اور تم..... تم کیا کرتی رہی.....'

اشرف غصے سے بول رہے تھے..... کیڑا اُن کی آنکھوں کی پتلیوں پر چپ چاپ بیٹھا تھا۔ کمرے سے باہر نکل کر دیوار سے سٹی ہوئی، تھر تھر کانپ رہی صوفیہ کو میں نے پہلی بار دیکھا۔ شاید اشرف نے بھی صوفیہ کا یہ رنگ دیکھ لیا تھا۔ ایک لمحے کو وہ ٹھہرے۔ پھر اپنے کمرے میں داخل ہو گئے۔ دروازہ زور سے بند کر لیا ___

نادر مشتاق احمد کا بیان

نہیں۔ میں اشرف بھائی کو قصوروار نہیں مانتا۔ یقیناً ہم نے اُن کی زندگی میں سیندھ لگائی تھی۔ تقدیر کی مجبوری اپنی جگہ، لیکن اپنے اپنے فیوچر کے لئے کسی کی زندگی میں جبر کے طور پر داخل ہونے کا ہمیں کیا حق تھا ___ صوفیہ اُس دن کافی

روئی تھی۔ مجھے احساس تھا۔ شاید جان لیوا تنہائی کے اُداس مکالمے اُسے بار بار پریشان کر رہے تھے۔ مجھے اُسے ایک بھائی کی سطح پر، اس سناٹے سے باہر نکالنا تھا۔ اور میں نے اُسے نکالا۔ دوسرے دن، یعنی اس ناخوشگوار حادثے کے دوسرے دن میں اُسے اپنے گھر لے گیا اور ایک دو ماہ بعد اُس کا داخلہ کمپیوٹر میں کرا دیا۔ شاید اُسے اپنی تنہائیوں کو بانٹنے کا موقع مل جائے۔ میں جانتا تھا۔ وہ کوئی دوست نہیں بنا سکتی۔ بوائے فرینڈ تو بالکل نہیں۔ لیکن بڑی ہوتی صوفیہ کی ذمہ داری سے آزاد ہونے کا خیال مجھے زیادہ ستائے جا رہا تھا۔ کیونکہ مجھے امریکہ جانا تھا۔ میرے خواب امریکہ میں بستے تھے اور پھر شروع ہوا آنکھ مچولی کا کھیل ___ نہیں صاحب۔ پہلی بار احساس ہوا، کہ بجیا نے خود لڑکا پسند کر کے کتنی قابلیت دکھائی تھی ___ رشتہ دار، عزیز، جان پہچان والے، رشتہ گھر، شادی ڈاٹ کام، مہندی ڈاٹ کام۔ لڑکا دیکھنے کا سفر شروع ہوا تو جیسے ایک نئے بازار کو دیکھنے کا موقع ملا۔ نہیں صاحب۔ مجھے معاف کیجئے۔ یقیناً اس لفظ سے بہتر کوئی لفظ میرے پاس نہیں ہے۔ بازار ___ ہر کسی نے اپنے اپنے جانور کو پال پوس کر تیار کیا تھا۔ بقرعید کے موقع پر فروخت کرنے کے لئے ___ قیمتیں آسمان چھو رہی تھیں۔ اُس پر گھر گھرانہ، شجرہ نسب کی تفصیل ___ یہ بازار میرے لئے اور بجیا کے لئے نیا تھا۔ صوفیہ ہمیں گاڑی میں آتے جاتے ہوئے دیکھتی۔ بجیا کو فون پر باتیں کرتے ہوئے سنتی۔ پھر واپس آ کر ہمارے خاموش چہرے پر اپنی ادھ کھلی آنکھیں رکھ کر، واپس اپنے کمرے میں لوٹ جاتی ___ بجیا کو کبھی کبھی غصہ آ جاتا.....

'سب کے رشتے ہو جاتے ہیں۔ مگر یہاں.....'

جیجو ایک لمبا سانس بھر کر کہے..... 'فکر کیوں کرتی ہو، آسمان سے ایک دن.....'

وہ صوفیہ کے کمرے میں جاتے۔ اُسے بانہوں کے سہارے واپس لے کر آتے ___ ''کیا کمی ہے اس میں..... اور ابھی عمر کون سی عمر نکلی جا رہی

ہے.....'ہوئی ہے.....'وہ ایک بار پھر ٹھنڈا سانس بھرتے۔ ہر چیز کا وقت مقرر ہے۔ کیوں صوفیہ۔ ایک دن چپکے سے ایک شاہزادہ آئے گا اور ہوا کے رتھ پر بیٹھا کر.....

''

'نہیں۔ کوئی نہیں آئے گا۔'صوفیہ مسکرانے کی کوشش کرتی۔

'آئے گا.....'جیجو میری طرف مڑتے۔'نادر، اس قدر پریشان ہونے ضرورت نہیں ہے۔ صوفیہ سے زیادہ خوبصورت لڑکی میں نے کم کم دیکھی ہے، اس کا اعتراف کرتا ہوں۔ مگر کمی کیا ہے صوفیہ میں ____'جیجو ہنستے۔ بس ایک کمی ہے۔ خوبصورت کے ساتھ خوب سیرت بھی ہے۔ اور خوب سیرت 'لڑکیوں کے بازار زرا ٹھنڈے ہیں.....'

'میں کیا خوب سیرت نہیں تھی.....'ثریا آنکھیں تریرنے کی کوشش کرتی تو جیجو فلک شگاف قہقہہ بلند کرتے ____'خود پر کیوں لیتی ہو۔ صوفیہ مختلف ہے۔ اور ایک دن.....

میں سوچتا تھا۔ ایک دن..... ایک دن کیا ہوگا ____ کوئی معجزہ ہو جائے گا ____ چمتکار۔ امریکہ بار بار خوابوں میں منڈراتا ہے۔ نہیں ہنسیے مت ____ پریتی زنٹا، منموہن سنگھ اور ہمارے نیتاؤں سے زیادہ کلنٹن، بش اور کیری مجھے اپنے لگتے تھے۔ جینفر لوپیز کے خیالوں میں، میں زیادہ ڈوبا رہتا تھا ____ ہاں، یاد آیا۔ ایک لڑکا اور آیا تھا۔ فریاد عارف۔ لدھیانہ کا۔ قد پانچ فٹ دس انچ۔ عمر چالیس سال۔ باہر رہنے کا، دس برس کا تجربہ تھا۔ عمر زیادہ تھی تو کیا ہوا۔ یہ رشتہ ہمیں نیٹ سے ملا تھا۔ صوفیہ کی تصویر اور بایوڈاٹا لڑکے کو پسند آیا تھا۔ اُس کی تصویر بھی نیٹ سے ہم نے نکال لی تھی۔ شکل اچھی نہیں تھی۔ لیکن کیا شکل ہی سب کچھ ہوتی ہے..... ہاں، اُس کے ہونٹوں کے پاس ایک داغ تھا..... پتہ نہیں، کس چیز کا داغ تھا۔ جلے کا یا..... مگر داغ تھا ____ ڈرتے ڈرتے ہم نے تصویر صوفیہ کے حوالے کی۔ مگر تصویر دیتے

ہوئے یقیناً ہمارے ہاتھ کانپ رہے تھے۔نظر جھکی ہوئی تھی۔

صوفیہ مشتاق احمد کا بیان

تصویر میں ہاتھ میں لیتے ہی ہنس پڑی تھی۔ یہ پاپا کے کوئی دوست ہیں کیا..... نہیں، کم از کم جیجو مجھ سے اتنا بُرا مذاق نہیں کر سکتے۔جیجو کے گھر سے باہر آنے کے بعد بھی میں جیجو کے لئے ذرا بھی خفا نہیں تھی۔ یقیناً وہ سب سے زیادہ مجھے پہچانتے تھے۔اور یقیناً میرے لئے سب سے زیادہ جنگ بھی، وہی لڑتے تھے اور خاص کر ایسے موقع پر، جب کمرے میں یکا یک کالی کالی بدلیاں چھا جاتیں..... پھر جیسے تیز تیز آندھیوں کا چلنا شروع ہو جاتا۔نہیں، میں نے تصویر دوبارہ دیکھی..... اور اچانک چہرے کا طواف کرتی آنکھیں داغ کے نشان کے پاس آ کر ٹھہر گئیں۔ ہونٹ کے نیچے کا حصہ..... تصور اور خیالوں کی وادیوں میں، بوسے کے لئے سب سے خوبصورت جگہ۔ میں تو اس جگہ کا بوسہ بھی نہیں لے سکتی۔ میں ہنس رہی تھی۔ پاگلوں کی طرح ہنس رہی تھی۔کمرے میں دھند بڑھ رہی تھی۔شاید باہر جیجو، بجیا اور نادر بھائی نے میرے ہنسنے کی آوازیں سن لی تھیں.....

'صوفیہ۔'

دروازے پر تھاپ پڑ رہی تھی۔

نادر غصے میں تھے..... 'دروازہ کیوں بند کر لیتی ہو۔'

بجیا کی آنکھوں میں ایک لمحے کو ناگواری کے بادل لہرائے..... 'ہم نے ابھی رشتہ منظور کہاں کیا ہے۔صرف تم سے رائے پوچھی ہے.....

'نہیں۔وہ..... کیڑا۔'

دروازہ کھولتے ہوئے میری آنکھیں وحشت میں ڈوبی تھیں ___ جیجو نے سہارا دیا ___ صوفے تک لائے ___ کچھ ہی دیر میں مکالمے بدل گئے۔

'مگر کیڑا.....'

نادر نے بجیا کی طرف دیکھا ___ 'کیڑے بڑھ گئے ہیں۔ کیوں۔ رات بھر کاٹتے رہتے ہیں۔ دوا کا چھڑکاؤ کرو۔ یا گڈ نائٹ لگاؤ۔ مگر کیڑے نہیں بھاگتے.....'

بجیا یعنی ثریا مشتاق احمد نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ ہونٹوں پر ایک طنز بھری مسکان تھی۔

'آپ یقین جانیے، کوئی تھا۔ جو دیواروں پر رینگ رہا تھا۔ ایک دم سے کمرے کی دھوپ اُتر گئی۔ تاریکی چھا گئی ہے..... کمرے میں کہاسے بھر گئے اور..... میں بہت کچھ کہنا چاہتی تھی مگر..... میں نے دیکھا..... جیجو آہستہ آہستہ میری طرف دیکھ رہے تھے ___ پھر اُن کے ہونٹوں پر ایک مصنوعی مسکراہٹ داخل ہوئی ___

'ایک ستارا آئے گا.....'

''ستارے آسمان سے آتے آتے لوٹ گئے.....'' یہ بجیا تھی۔

''ہاں، لیکن گھبراؤ مت، ایک ستارہ آئے گا اور یوں اچھل کر تمہاری جھولی میں جا گرے گا.....' یہ جیجو تھا ___ ہونٹوں پر ہنسی۔ پھر وہ تمہاری آنکھوں میں، کبھی ہونٹوں پر آ کر چیخے گا..... یہ میں ہوں۔ پاگل۔ پہچانا نہیں مجھے۔ تمہاری قسمت کا ستارہ.....

'اُس کے چہرے پر دھوپ بہت تھی۔ تم نے دیکھا نا' بھائی نظر نیچی کئے بہن کو ٹٹول رہا تھا۔

''میں جگنو تلاش کرنے گئی تھی۔ راستہ بھٹک گئی ___ 'یہ وہ تھی۔ اُس کی آواز اندر کے روشن دان سے بلند ہوئی اور اندر ہی اندر گھٹ گئی۔

جیجو کا بیان

دراصل اُس 40 سال کے ادھیڑ مرد کی تصویر دیکھ کر مجھے خود بہت غصہ آیا تھا ___ نادر اور ثریا، رشتہ کے لئے مجھے کم ہی لے جاتے تھے۔ دراصل وہ اس 'مہرے' کو

آخری وقت کے لئے بچا کر رکھنا چاہتے تھے اور کسی خاص موقع پر ہی خرچ کرنا چاہتے تھے۔ یہ سب میرے لئے بھی نیا تھا۔ کیونکہ ہر برس بدلتے کلینڈر کے ساتھ ہی، میں صوفیہ کو دیکھ کر اُداس اور پریشان ہوا جا رہا تھا اور آپ سمجھ سکتے ہیں، خود صوفیہ کی کیا حالت ہوگی ____ میرے لئے یہ یقین کرنا مشکل تھا کہ مسلمانوں کے یہاں، ایک خوبصورت جوان لڑکی کی شادی کو لے کر اتنی ساری الجھنیں سامنے آسکتی ہیں ____ گھر گھرانہ اچھا۔ خاندان سیّد۔ مگر کسی کو لڑکی کا قد کچھ کم لگتا۔ کسی کو عمر کچھ زیادہ۔ کبھی کبھی جی چاہتا کہ پوچھنے والوں کا گریبان پکڑ کر کہوں، کہ اٹھارہ سال سے رشتہ تلاش کرتے ہوئے تم لوگوں نے اسے 23 سال کا کر دیا ہے اور اب ____ شاید میرے اسی غصّے کی وجہ سے نادر اور ثریا مجھے کبھی اپنے ساتھ نہیں لے گئے۔ مگر..... کبھی کبھی اپنی بڑی ہوتی ارم کو دیکھ کر گہری سوچ میں گرفتار ہو جاتا۔ کیا میرے ساتھ بھی ____ اور ہوا یوں، کہ اچانک اُس دن ارم کو دیکھا تو ایکدم سے چونک گیا ____ ارم غائب تھی۔ ارم میں صوفیہ آ گئی تھی ____

مصنف کا بیان

قارئین، ایک بار پھر مداخلت کے لئے معافی چاہوں گا۔ کہانی شروع ہوئی تو سوچ کے دائرے پھیلتے چلے گئے۔ یہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ کیا یہ بھی کوئی کہانی ہو سکتی ہے۔ ایک مسلمان لڑکی کو لڑکے کی تلاش ہے۔ عمر 23 سال، خوبصورت، تعلیم یافتہ ____ تہذیب کی اتنی صدیاں پار کرنے کے بعد بھی، چوتھی دنیا کے، ہتھیاروں کی ریس میں آگے نکلنے والے ایک بڑے ملک میں، یہ مسئلہ ایک کہانی کا جزو بن سکتا ہے، میں نے کبھی سوچا نہیں تھا ____

اُس دن، میں دوبارہ نادر مشتاق احمد کے گھر گیا۔ دروازہ کے پاس پہنچ کر بیل پر اُنگلی رکھی۔ دروازہ کھولنے والی وہی تھی۔

'آیئے'

'نادر؟'

'وہ باہر گئے ہیں۔'

صوفیہ، صوفے پر دھنس گئی۔ کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد بولی ____

'چائے بناؤں!'

'نہیں۔ ابھی رہنے دو۔'

میں آہستہ آہستہ آنکھیں گھماتا کمرے کی ویرانی کا جائزہ لے رہا تھا۔ دیوار پر قطار میں اُڑتی چار چڑیائیں کچھ اور ہی کہانی بیان کر رہی تھیں۔ تیسری والی چڑیا کی قطار ٹوٹ گئی تھی۔ تیسری چڑیا کیل سے جھول رہی تھی۔ پتہ نہیں کب سے۔ دیوار پر کنارے مشتاق احمد کی تصویر لگی تھی۔ تصویر پر ذرا بھی گرد نہیں تھی۔ جیسے ابھی ابھی گرد صاف کی گئی ہو۔ لیکن کمرے کی باقی چیزیں.....

'اندھیرا ہے' میں آہستہ سے بولا۔ جبکہ دوپہر کے تین بج رہے تھے۔ کھڑکی کے پاس پردہ پڑا تھا۔

'اِس گھر میں ہمیشہ اندھیرا رہتا ہے.....' صوفیہ آہستہ سے بولی۔

'اور وہ ڈرا کیولا.....'

میں آہستہ آہستہ کھڑکی کے پاس بڑھا ____

'نہیں، یہاں نہیں۔.....' یہاں میرے ساتھ آیئے۔ میرے کمرے میں.....'

وہ تیزی سے اٹھی ____ مجھے لے کر اپنے کمرے میں آ گئی ____ سنگل بیڈ کا دیوان پڑا تھا ____ چادر کئی دنوں سے بدلی نہیں گئی تھی ____ کمرہ بے رونق تھا اور یقیناً اس کمرے میں کھڑکی کے راستے گھنے کہرے، داخل ہو جاتے ہوں گے ____

'یہاں..... یہاں سے۔ یہ دیوار جو ہے..... آپ دیکھ رہے ہیں نا.....'

'مگر یہاں تو کوئی قبرستان نہیں ہے۔'

'آہ۔ نہیں ہے.....' صوفیہ اپنے بستر پر بیٹھ گئی ____ 'میں نے کب کہا، کہ یہاں

قبرستان ہے۔ مگر بن جاتا ہے۔ رات کے وقت۔ اپنے آپ بن جاتا ہے ____ دھند میں ڈوبا ہوا ایک قبرستان۔ ڈھیر ساری قبریں ہوتی ہیں۔ ایک کھلا ہوا 'کوفن' ہوتا ہے۔ وہ یہاں...... یہاں دیواروں پر رینگتا ہوا، کھڑکی سے اچانک میرے کمرے میں کود جاتا ہے......'

'یقیناً، وہم......اور وہم کا تعلق تو......'

'مجھے پتہ ہے۔ وہم ہے میرا۔ مگر کیا کروں۔ وہ رات میں، آپ یقین کریں میرے کمرے میں ہوتا ہے......'

'کیوں؟'

'اب یہ بھی بتانا پڑے گا بھلا۔ خون پیتا ہے......یقین نہیں ہو، تو یہ داغ دیکھئے۔'
اُس نے اپنی گردن دکھائی۔ گردن پر یقیناً نیلے داغ موجود تھے۔

'کوئی یقین نہیں کرتا۔ میں بھی مانتی ہوں، وہم ہے مگر۔ وہ ہے۔ وہ آتا ہے......اور......'

میں نے کہانی بدل دی۔ 'اوہ......تم نے بتایا تھا۔ تم بار بار مرتی تھی ____

'کون نہیں مرے گا ایسے ____ جب آپ بار بار اُسے سجا کر باہر لے جاتے ہوں۔ یا کبھی کبھی سج دھج کر گھر میں ہی نمائش یا میلہ لگا دیتے ہوں۔ ایک حد ہوتی ہے۔ کوئی بھی کتنی بار مرتا ہے۔ کتنی بار مر سکتا ہے کوئی۔ میں تو ہر بار، ہر پل......'

صوفیہ کہتے کہتے رُک گئی تھی ____

'مگر اُس دن نہیں مری۔ اُس دن۔ میں نے سوچ لیا تھا اور مطمئن تھی۔'

'اُس دن......'

'ارے وہی۔ ان ڈسنٹ پروپوزل۔' وہ کہتے کہتے رُکی ____ ایک ہنسی چہرے پر شعلے کی طرح کوندی۔ 'پروپوزل، کبھی بھی ان ڈسنٹ نہیں ہوتا۔ مگر بجیا اور بھیا کسی ساتویں عجوبے کی طرح اُس پروپوزل کو لے رہے تھے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ میں

پہلی بار کمرے میں کھکھلا کر ہنسی تھی۔ 'اب مزہ آئے گا۔' وہ ٹھہری ____ پھر بولی۔ اب کسی کو کیا پتہ۔ میرے جسم میں کتنے انگارے اکٹھے ہو گئے ہیں۔ اب تو شاید سرد بھی ہونے لگے ہوں یہ انگارے ____ نہیں، سرد نہیں۔ بڑھتے بڑھتے پورے جسم میں پھیل گئے ہیں۔ پھیلتے پھیلتے..... آپ نہیں سمجھیں گے۔' اُس نے گہرا سانس لیا۔

'لیکن پروپوزل۔؟'

''وہ بھی نیٹ سے برآمد ہوا تھا۔ صوفیہ کے ہونٹوں پر ہنسی تھی ____ 'عمر بھی زیادہ نہیں تھی۔ تھکے ہارے لوگوں کے لئے یہ بھی ہاتھ آیا ایک موقع تھا مگر ____ جس وقت بجیا اور بھائی اُس سے ملنے ہوٹل گئے، وہ ہوٹل کی لابی میں بیٹھا سگریٹ کے گہرے گہرے کش لے رہا تھا۔ یہ بجیا نے ہی بتایا۔

اِن ڈسنٹ پروپوزل

ہوٹل کی لابی میں اس وقت زیادہ لوگ نہیں تھے۔ نادر اور صوفیہ اُس کے سامنے بیٹھے تھے۔ وہ سگریٹ کے گہرے گہرے کش لے رہا تھا۔ ظاہر ہے، وہ لڑکی کی تصویر دیکھ چکا تھا۔ لیکن اُس نے ملنے کا تجسس نہیں دکھایا تھا۔ سگریٹ کے گول گول مرغولے کے درمیان اُس کے چہرے کے تاثر کو پرکھا نہیں جا سکتا تھا ____

نادر نے گلہ کھکھارتے ہوئے اُسے متوجہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اُس کی اُنگلیوں میں، مہنگی سونے کی انگوٹھیاں تھیں۔ عام طور پر مسلمانوں مردوں میں سونا پہننے کا رواج نہیں ہے۔ گلے میں بھی سونے کا ایک چین پڑا تھا۔ یقیناً اُس کی منشا یہ تھی کہ سامنے والا اُسے کسی رئیس سے کم نہ سمجھے۔

ثریا نے پہلو بدلا اور ناگوار آنکھوں سے نادر کو دیکھا ____ اُس نے سگریٹ آرام سے ختم کیا۔ ایش ٹرے میں سگریٹ کے باقی ٹکڑے کو مسلا۔ پھر مسکرایا ____

'معاف کیجئے گا۔ سگریٹ میری مجبوری ہے۔'

'کیوں نہ ہم معاملے کی بات کریں۔' نادر نے دوٹوک انداز میں کہا۔

وہ ایک بار پھر مسکرایا ____ 'مجھے بھی جانے کی جلدی ہے۔ دراصل میں سوچ رہا تھا ____ نہیں، جانے دیجئے۔ کسی بھی چیز کو تاڑ کی طرح کھینچنے میں میری دلچسپی نہیں ہے۔ بھاگتی دوڑتی دنیا میں الجبرے کے فارمولے کی طرح میں نے زندگی گزاری ہے۔ دو پلس دو برابر چار ____ سمجھ گئے نا۔ میرا پروپوزل ہوسکتا ہے، آپ کو پسند نہیں آئے۔ مگر سوچئے گا۔ مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔ نہیں پسند آئے تو آپ جاسکتے ہیں۔ کوئی جہیز لیتا ہے۔ کسی کی کوئی ڈیمانڈ ہوتی ہے۔ کسی کی کوئی ____ میرے پاس سب کچھ ہے۔ خود سے حاصل کیا ہوا ____ اس لئے مجھے کچھ نہیں چاہئے۔' وہ ایک لمحے کو ٹھہرا اور دوسرے ہی لمحے جیسے نشانہ سادھ کر اُس نے گولی داغ دی.....

''ایک دوسرے کو اچھی طرح پرکھنے کے لئے بہتر ہے کہ ہم ایک رات ساتھ ساتھ گزاریں۔''

اُس نے ہمارے تاثرات کی پرواہ نہیں کی۔ جملہ ختم کرنے ہی اٹھا اور دوسری طرف منہ کرکے دوسرا سگریٹ سلگالیا۔ لائٹر کی خوبصورت ٹیون کے ساتھ ایک شعلہ لپکا تھا، جس کی طرف پلٹ کر دیکھنے کی ہم نے ضرورت محسوس نہیں کی ____

صوفیہ کا جواب

واپس گھر لوٹنے تک جیسے یہ دنیا ایک چھوٹے سے سیپ میں بند ہو چکی تھی۔ صوفے پر برسوں کی بیمار کی طرح ثریا دھنس گئی۔ دوسرے صوفے پر نادر نے اپنے آپ کو ڈال دیا۔ آنکھیں بند کرلیں۔ دل و دماغ پر پتھراؤ چل رہے تھے ____ کب کس وقت صوفیہ آکر قریب میں بیٹھ گئی، پتہ بھی نہیں چلا۔ مگر جیسے ساری دنیا الٹ پلٹ ہوچکی تھی ____ سیپ کے منہ کھل گئے تھے۔ یا سیپ، لہروں کی مسلسل اُچھال کے بعد ٹوٹ پھوٹ کر بکھر گئی تھی۔

'کیوں، کیا ہوا.....؟'

یہ صوفیہ تھی۔ معمول کے خلاف اُس کے ہونٹوں پر ایک ہنسی بکھری ہوئی تھی ____ جیسے وہ یقیناً اس موسم کی عادی ہو چکی ہو.....!

جیجو پاس میں آ کر بیٹھ گئے۔ صوفیہ نے جیجو کی طرف دیکھا اور ایک بار پھر کھلکھلا کر ہنس دی۔

'یہ آتش بازی بھی پھس ہو گئی۔ کیوں جیجو.....؟'

لیکن یہ سچ نہیں تھا۔ نادر مشتاق احمد اور ثریا مشتاق احمد کی آنکھوں میں حساب کتاب کا سلسلہ جاری تھا ____

'بتا دوں؟' یہ نادر مشتاق احمد تھا۔

'نہیں' جیجو نے درد کی تاب نہ لا کر آنکھیں بند کر لیں ____

'بتانے میں حرج ہی کیا ہے.....' ثریا کی آواز دبی دبی تھی.....

'نہیں۔ مجھے بتایئے۔' صوفیہ اور قریب آ گئی۔ میں جانتی ہوں مجھے کوئی پسند نہیں کر سکتا۔ میں کتنی بار آپ لوگوں سے کہہ بھی چکی ہوں۔ مگر ____ اللہ کے واسطے بتایئے ہوا کیا ہے.....'

اور پھر، جیسے ایک کے بعد ایک آتش بازی چھوٹتی چلی گئی۔ آتش بازیوں کا کھیل رُکا تو دوسرا بم کا گولہ صوفیہ نے داغ دیا۔

'میں تیار ہوں۔ اُسے آنے دیجئے۔ کب بلایا ہے ____' ثریا کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے، اُس نے اپنا فیصلہ سنا دیا ____ میں تھک گئی ہوں۔ اب حوصلہ نہیں ہے، اب یہ کھیل ختم ہو جانے دیجئے۔ اب ایک آخری کھیل ____ ہم سب کے فائدے کے لئے۔ وہ پھر رُکی نہیں۔ دوسرے ہی لمحے وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئی ____

ایک خوفناک کہانی کا انت

قارئین۔ کوئی دنیا اس سے زیادہ خوبصورت اور کوئی دنیا اس سے زیادہ بدصورت

نہیں ہوسکتی ۔ یہ میرا مانتا ہے۔ اور شاید یہ اسی لئے بطور مصنف میں اس کہانی کا گواہ رہا ___ بطور مصنف میں نے اپنے آپ کو بھی اس کہانی میں شامل کیا ___ مجھے نہیں معلوم، ثریا اور نادر نے صوفیہ کی رضامندی کو اپنی منظوری کی ہری جھنڈی کیسے دے دی۔ یا پھر صوفیہ اس پروپوزل کے لئے مان کیسے گئی۔ اس ترقی یافتہ ملک میں شادی کے اس بھیانک بازار کا تصور میرے لئے ممکن نہیں ہے۔ شاید اسی لئے اس خوفناک کہانی کا انت سنانے کا حوصلہ مجھ میں نہیں ہے اور اسی لئے اب میں آپ کے درمیان سے رخصت ہوتا ہوں ___ جنوری ماہ کی بھیانک ٹھنڈک اپنے عروج پر تھی۔ اُس دن کی صبح عام صبح جیسی نہیں تھی۔ مگر صوفیہ مطمئن تھی۔ وہ شان سے گانا گنگناتی ہوئی اٹھی ___ دوپہر تک سرد لہری میں اضافہ ہو چکا تھا ___

گھڑی کی تیزی سے بڑھتی سوئیاں ایک نئی تاریخ لکھنے کی تیاریاں کر رہی تھیں۔

✦ ✦

ڈرائنگ روم میں ایک دوسرے کو گھیر کر سب بیٹھ گئے تھے۔ جیسے کسی میّت میں بیٹھے ہوں۔ جنازہ اٹھنے میں دیر ہو ___ ایک ایک لمحہ برسوں کے برابر ہو۔ پھر جیسے ہونٹوں پر جمی برف، بھاپ بن کر پگھلی ___

'آہ، یہ نہیں ہونا چاہئے تھے.....، یہ جیجو تھا۔

'کیا ہوگا؟' ثریا کی آنکھوں میں اُڑ کر وہی کیڑا آ گیا تھا ___

نادر نے بات جھٹکی ___ رات میں یہ کیڑے پریشان کر دیتے ہیں۔'

'شی.....وہ آ رہی ہے.....' جیجو نے مسکرانے کی ناکام کوشش کی.....'اور جان لو، وہ کوئی کیڑا نہیں ہے۔'

اور جیسے وقت تھم گیا ___ صوفیہ ایک لمحے کو اُن کے سامنے آ کر رُکی ___

'آپ لوگ.....آپ لوگ اتنے پریشان کیوں ہیں۔'

نہیں۔ یہ وہ لڑکی تھی ہی نہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر ڈر جانے والی ___ پتوں کی

طرح بکھر جانے والی ____ اُس کی ساری تیاریاں مکمل تھیں ____

وقت آہستہ آہستہ قریب آ رہا تھا۔

اُس نے پلٹ کر جیجو کی طرف دیکھا ____ نہیں یہ جیجو نہیں تھے۔ جیجو کی جگہ کوئی لاش تھی۔ چہرے پر، کاٹو تو خون کا نشان نہیں۔ آنکھیں بے حرکت.....

اُس نے پلٹ کر بھائی کی طرف دیکھا۔ بھائی ہمیشہ کی طرح نظریں نیچی کئے، اپنے آپ سے لڑنے کی کوشش کر رہا تھا ____

بہن نے چہرہ گھما لیا تھا۔ اس لئے وہ بہن کے جذبات کو نہیں دیکھ سکی ____

پھر جیسے کمرے میں ایٹم بم کا دھماکہ ہوا ____

'پانچ منٹ باقی رہ گئے ہیں بس، وہ آتا ہوگا ____ میں کمرے میں ہوں۔ آپ اُسے کمرے میں ہی بھیج دیجئے گا۔'

اُس کی آواز نپی تلی تھی۔

پھر وہ وہاں ٹھہری نہیں۔ سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی ____

اورانت میں کہانی

کوئی امتحان ایسا بھی ہو سکتا ہے، اُس نے کبھی سوچا نہیں تھا۔ بچپن سے لے کر آج تک اپنی خاموشی کے ریگستان میں چپ چپ سلگتی رہی۔ کسی نے بھی اُس کے اندر کی آواز کو کب سنا تھا۔ کسی نے بھی اُس کے اندر کی لڑکی کو کب دیکھا تھا۔ خود اُس نے بھی نہیں۔ نہیں۔ یہ سچ ہے۔ ایک عرصہ سے وہ اپنے آپ سے نہیں ملی۔ کمپیوٹر کو چنگ سے گھر اور گھر سے اپنے اُداس کمرے کا حصہ بنتے ہوئے بس وہ خلاء میں ڈوبتے ابھرتے بھنور کو دیکھنے میں ہی صبح سے شام کر دیتی ____ کمرے کے آسیب چپ چپ اُسے گھیر کر بیٹھ جاتے ____ اُسے سمجھنے والا کون تھا۔ اُسے پڑھنے والا کون تھا ____ وہ عشق نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اپنے لئے کوئی لڑکا پسند نہیں کر سکتی تھی۔ انٹرنیٹ پر چیٹنگ کرتے ہوئے اُس کے ہاتھ کانپتے تھے۔ کسی لڑکے سے دو منٹ

چیٹنگ کے بعد ہی اُس کی سانس دھونکنی کی طرح چلنی شروع ہو جاتی۔ بدن کانپنے لگتا۔ سائبر کیفے کی ایک ایک شئے گھومتی ہوئی نظر آتی۔ وہ بدحواس پریشان سی گھر آتی تو.....'

لیکن گھر کہاں تھا۔ ماں باپ ہوتے تو گھر ہوتا۔ بہن اور جیجو کا گھر، گھر کہاں ہوتا ہے۔ بھائی کا گھر، گھر کہاں ہوتا ہے۔ گھر میں تو سپنے رہتے ہیں۔ سپنوں کے ڈھیر سارے ٹوئنکل ٹوئنکل لٹل اسٹار ____ یہ چھوٹے چھوٹے تارے تو ہتھیلیوں سے چھوٹ چھوٹ کر گرتے رہے۔ اندھیرے کمرے میں آسیبی مکالمے رہ گئے تھے ____

'کھانا بنایا ____؟'

نہیں۔

'کیوں؟'

خواہش نہیں ہوئی ____

'خواہش یا.....؟'

ہونٹوں پر ایک ناگوار سا تاثر اُبھرا۔ کیا بس اِسی کام کے لئے رہ گئی ہوں ____

''ہوسکتا ہے۔ بھائی نے یہی سوچا ہو۔''

'نہیں۔ بھائی اُس محبت کرتا ہے۔

'سارے بھائی محبت کرتے ہیں مگر.....'

'میرا بھائی'..... وہ کہتے کہتے رُک جاتی.....

تمہارا بھائی ہر لمحہ، تمہارے اندر رہتا ہے۔ جانتی ہو کیوں؟۔

'نہیں۔'

'اُس کے پاس سپنے ہیں.....'

'تو.....؟'

'وہ اُڑنا چاہتا ہے۔ اُڑ کر اپنے لئے بھی سپنے دیکھنا چاہتا ہے۔ مگر تم۔ افسوس۔ تم نے اُس کے سپنوں کو راکھس کے ان دیکھے قلعے میں نظر بند کر رکھا ہے۔ وہ تم سے چھٹکارا چاہتا ہے____'

'نہیں۔' ایک جھٹکے سے اُٹھ کر وہ آئینہ کے سامنے کھڑی ہوگئی____' جھوٹ بولتے ہو تم۔ کوئی چھٹکارا نہیں چاہتا۔ سب پیار کرتے ہیں مجھ سے۔ ہاں، بس، عمر کے پنکھ پرانے پڑ رہے ہیں۔ پنکھ پرانے ہو جائیں تو کمزور ہو جاتے ہیں۔ میں ایک بے ارادہ سڑک بن گئی ہوں۔ کوئی گزرنا ہی نہیں چاہتا۔'

'نہیں ڈرومت۔'

کمرے کے آسیب اُسے گھیر رہے ہیں۔ خود سے باتیں کرتے ہوئے سارا دن گزار لیتی ہو۔ پتہ ہے بہن کیا کہتی ہے؟

'نہیں۔'

'بھائی پر ناراض ہوتی ہے۔ اسی لئے تو تمہیں وہاں سے نکالا گیا۔ تم کوئی کام ہی نہیں کرتی تھی۔ بس سوتی رہتی تھی۔'

'سوتی کہاں تھی۔ میں تو خود میں رہتی تھی۔ خود سے لڑتی تھی۔'

'کیا ملا۔ بہن نے بھائی کے یہاں بھیج دیا۔'

'بھیجا نہیں۔ میں خود آئی.....' کہتے کہتے ایک لمحے کو وہ پھر رُک گئی.....

'دراصل تم ٹیبل ٹینس کی بال ہو..... سمجھ رہی ہو نا، چھوٹی سی ٹن ٹن..... بجنے والی بال..... لیکن اس بال کو راستہ نہیں مل رہا ہے.....

'کیا کروں میں.....'

'افسوس، تم ابھی کچھ نہیں کر سکتی____ تم صرف آگ جمع کرتی رہو۔ سن رہی ہو نا۔ آگ..... اپنے آپ کو برف کی طرح سرد مت پڑنے دو۔ سرد پڑ گئی تو..... لاش کو اپنے گھر کون رکھتا ہے۔ وہ بھی بدبو دیتی لاش.....'

ٹیبل ٹینس بال کی طرح ادھر اُدھر لڑھکنے کا سلسلہ جاری رہا ___ پتہ نہیں، وہ کتنی بار مری۔ پتہ نہیں وہ کتنی بار زندہ ہوئی۔ بہن اور بھائی کے ہزاروں سوالوں سے لاتعلق، اپنے ہی آسیب سے لڑتی لڑتی تھک گئی تو اُس 'اِن ڈسنٹ پروپوزل' کے لئے اُس نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

اور یہ حیرت کرنے والی بات تھی ___ پہلی بار اُسے لگا۔ کمرے میں آسیب اکٹھا نہیں ہوئے ہوں۔ پہلی بار لگا، اُس کے اَن کہے مکالموں کی بھاپ سے کمرے میں 'کہاسے' نہیں جمع ہوئے ہوں ___ کمرے میں خوف کی چادر ہی نہیں تنی ہو ___ کمرے میں ڈھیر سارے چمگادڑ نہیں اکٹھا ہوئے ہوں۔ جیسے بہن، دھیرے سے ہنستی ہوئی ایک دن بھائی سے بولی تھی ___ آسیب، وہاں آسیب رہتے ہیں سمجھاؤ اُسے۔ کمرے کو اپنی خاموشی سے اُس نے آسیب زدہ بنا دیا ہے اور یقیناً اُسے بھائی کا چہرہ یاد نہیں۔ بھائی نے ہمیشہ کی طرح نظریں جھکا کر کچھ دھیرے دھیرے کہنے کی کوشش کی ہوگی۔

مگر آج ___

آوازوں کے تیر غائب تھے۔ شب خونی ہوا کا پتھراؤ گم تھا ___ آئینہ میں وہ پاگل لڑکی موجود نہیں تھی۔ جسے بار بار بہن کی پھٹکار سننی پڑتی تھی۔ نہیں لڑکی۔ ایسے نہیں۔ مانگ ایسے نکالو۔ لباس، کپڑے کیا ایسے پہنے جاتے ہیں۔ زلفیں کیا ایسے سنواری جاتی ہیں۔

وہ دھیرے سے ہنسی ___

آئینہ والی لڑکی جو بھی ہنسی۔

پھر وہ تیز تیز ہنستی چلی گئی ___

کمرے کی دیوار گھڑی پر ایک اُچٹتی نظر ڈال کر وہ کمرے سے ملحق باتھ روم میں چلی گئی۔ کمرے کا دروازہ اُس نے 'اڈ گا' کر رکھا تھا، تا کہ 'اُس کی' آہٹ کی اطلاع اُسے باتھ روم میں مل سکے۔ باتھ روم کا ٹائلس ذرا سا گندہ ہو رہا تھا۔ اُس نے شاور کے نیچے کے دونوں نل کھول لیے۔ گیزر چلا دیا۔ گرم گرم پانی جب تلووں سے ہو کر بہنے لگا تو وہ ٹائلس کو اپنے بے حد ملائم گورے ہاتھوں سے تیز تیز رگڑنے لگی۔ ٹائلس کے چاروں طرف صابن کے جھاگ پھیل گئے تھے۔ اُس نے اپنے لئے ایک بے حد خوبصورت اور سینسیشنل نائیٹی کا انتخاب کی تھا۔ یہ نائیٹی سیاہ رنگ کی تھی۔ جو اُس کے گورے 'جھنجھناتے' بدن سے بے پناہ میچ کھاتی تھی۔ نائیٹی اُس نے باتھ روم کے ہینگر میں ٹانگ دیا۔ صابن کے گرم گرم جھاگ اور فواروں سے، وہ کچھ دیر تک اپنے ننگے پاؤں سے کھیلتی رہی ___ پھر مدہوشی کے عالم میں ٹوٹتے بنتے جھاگوں کے درمیان بیٹھ گئی ___ ایک لمحے کو آنکھیں بند کیں۔ دوسرے ہی لمحے کپڑے اُس کے بدن سے آزاد ہو کر اُڑتے چلے گئے۔ اُس نے نل بند کیا۔ جسم میں مچلتے طوفان کا جائزہ لیا ___ صابن کے جھاگوں کو ہاتھوں سے اُڑایا ___ یا پھر اپنے ننگے بدن کے ساتھ وہیں لیٹ گئی ___

کمرے کا دروازہ چڑ مڑایا تو اچانک وہ، جیسے خواب کی وادیوں سے لوٹی ___ منہ سے بے ساختہ آواز بلند ہوئی ___

''آپ انتظار کیجئے ___ آرہی ہوں۔''

ایک لمحے کو وہ حیران رہ گئی ___ کیا یہ اُس کی آواز تھی ___ ؟ صوفیہ کی آواز ___ جس کے بارے میں مشہور تھا کہ صوفیہ کے تو منہ میں زبان ہی نہیں۔ کیا یہ وہ تھی ..... آج سارے موسم جیسے بدل گئے تھے ___ وہ بدل گئی تھی ___

ایک لمحے کو باتھ روم کی کنڈی پر ہاتھ رکھ کر وہ ٹھٹھکی ___، دروازہ بند کروں یا ___ نہیں ___ بند نہیں کروں گی ___ بند کرنے سے کیا ہوگا ___ آئینہ کے

سامنے برقع پہننے سے کیا حاصل۔شرط رکھنے والے کو تو سب کچھ دیکھنا ہے۔اُسے پورا پورا۔ایک وقت آتا ہے، جب مانگیں جسم سے آگے نکل جاتی ہیں۔جسم کی ساری حدود توڑ کر۔آگے۔بہت آگے..... اُس نے ہلکی سی انگڑائی لی۔بیسن کے آئینہ میں اپنے عکس کو ٹٹولا..... نہیں وہ ہے۔ایک مدہوش کر دینے والی 'صفت' کے ساتھ..... نہیں، یقیناً، وہ کسی بیوٹی کنسٹ میں شامل نہیں ہے۔مگر وہ..... ایک لمحے کو اُس نے پلکیں جھپکائیں ____ آئینہ میں گیزر چل رہا تھا۔نہیں یہ گیزر نہیں تھا۔یہ تو وہ تھی۔ مجسم، سرتاپا آگ.....

اُس نے گیزر بند کر دیا۔ٹھنڈے پانی کا شاور کھول دیا..... شاور کی بوندیں آگ میں گرتی ہوئی دھواں دھواں منظر پیش کر رہی تھیں۔چاروں طرف سے آگ کی جھاس اُٹھ رہی تھی۔ٹائلس سے ____ برہنہ دیواروں سے ____ آئینہ سے ____ اور ____ وہ ایک دم سے چونکی۔کمرے میں کوئی انتظار کر رہا ہے ____ آگے بڑھ کر اُس نے ٹوول کھینچا ____ ہینگر سے نائیٹی کھینچی۔آئینہ کے سامنے کھڑی ہوئی۔ آئینہ میں بھاپ جم گئی تھی۔تولیہ سے بھاپ صاف کرنے لگی۔پھر ایک بار اپنے آپ کو ٹٹولا..... اور دوسرے ہی لمحے دھڑاک سے اُس نے باتھ روم کا دروازہ کھول دیا ____

کمرے میں، یعنی وہ جو بھی تھا، دیوار کے اُس طرف منہ کئے کسی سوچ میں گم تھا۔ دروازہ بھڑاک سے کھلتے ہی وہ یکا یک چونکا۔اُس کی طرف مڑا اور یکا یک ٹھہر گیا ____

سلیولیس نائیٹی میں صوفیہ کا جسم کسی کمان کی طرح تن گیا ____ 'آئی ایم صوفیہ مشتاق احمد۔ڈاٹر آف حاجی مشتاق احمد۔عمر پچیس سال۔پچیس سے زیادہ لوگ تم سے پہلے مجھے دیکھ کر جا چکے ہیں ____ تمہارا کانمبر۔

'مجھے اس سے زیادہ مطلب نہیں.....' یہ لڑکا تھا۔مگر آواز میں کنپکی برقرار ____

جیسے پہلی بار جرم کرنے والوں کے ہاتھ کانپ رہے ہوتے ہیں......

'بیٹھیے۔' وہ آہستہ سے بولی۔

لڑکا بیٹھ گیا۔ اُس نے لڑکے کے چہرے پر اپنی نظریں گڑا دیں۔ چہرہ کوئی خاص نہیں۔ گیہواں رنگ۔ ناک تھوڑی موٹی تھی۔ بدن دبلا تھا۔ قد بھی پانچ فٹ سات انچ سے زیادہ نہیں ہوگا۔ وہ آسمانی جینس اور میرون کلر کی ٹی شرٹ پہنے تھا۔ مینل سفاری شوز اُس کے پاؤں میں بالکل نہیں جچ رہے تھے ___ لڑکا اُس سے آنکھیں ملانے کی کوشش میں پہلی ہی پائیدان پر چاروں خانے چت گرا تھا۔

'دیکھو مجھے......' وہ آہستہ سے بولی۔

'دیکھ رہا ہوں......' لڑکے نے اپنی آواز کو مضبوط بنانے کی ناکام سی کوشش کی۔

'نہیں تم دیکھ نہیں رہے ہو، دیکھو مجھے ___ نائٹی کیسی لگ رہی ہے......'

اس بار لڑکے نے ایک بار پھر اپنی مضبوطی کا جوا کھیلا تھا ___ 'اچھی ہے......'

'اچھی نہیں۔ بہت اچھی ہے......' وہ مسکرائی ___ 'کیسی لگ رہی ہوں میں......'

لڑکا ایک لمحے کو سکپکایا ___ وہ دھیرے سے ہنسی......' نظر جھکانے کی ضرورت نہیں ہے...... دیکھنے پر ٹیکس نہیں ہے۔ اور تم تو...... کسی بازار میں نہیں، اچھے گھر میں آئے ہو...... یقین مانو۔ ایک دن تو یہ ہونا ہی تھا۔ اسی لئے تمہاری شرط کے بارے میں سن کر مجھے تعجب نہیں ہوا ___ تمہارے لئے یہی بہت ہے کہ تم مرد ہو۔ مرد ہو، اس لئے تمہارے اندر کا غرور بڑھا جا رہا تھا۔ پہلے تم نے جہیز کا سہارا لیا۔ رقم بڑھائی، رقم دگنی تگنی کی اور پھر...... یقین مانو، میرے گھر والوں نے سوچا تھا کہ یہ موم کی مورت تو بُرا مان جائے گی۔ مگر میں نے ہی آگے بڑھ کر کہا...... بہت ہوگیا...... آخری تماشہ بھی کر ڈالو......'

باہر رات گر رہی تھی۔ نہیں، رات جم گئی تھی۔ جنوری ماہ کی ٹھنڈ لہریں جسم میں تیزاب برپا کر رہی تھیں۔ لیکن وہ جیسے ہر طرح کے سرد و گرم سے بے نیاز ہو کر ٹک ٹکی

باندھے اُسے دیکھ رہی تھی۔

'بستر پر چلو یا.....'

اتنی جلد..... اتنی جلدی کیا ہے.....' لڑکے کی آواز گڑبڑائی تو وہ پوری قوت لگا کر چیخ پڑی ____

'جلدی ہے۔ تمہیں نہیں۔ لیکن مجھے ہے۔ تم سے زیادہ بھوکی ہوں میں۔ کتنے بھوکے ہو تم ____ پتہ ہے یہاں آ کر، اس کمرے میں آ کر مجھ سے نظریں ملاتے ہوئے بھی شرم آ رہی ہے تمہیں ____ بس اتنے بھوکے ہو۔ نہیں۔ باہر..... باہر والوں کی پرواہ مت کرو۔ وہاں ایک بھائی ہے، جب تک میں باہر نہیں نکلوں گی۔ تیر کی طرح زمین میں گڑا، اپنے ناکارہ ہونے کے احساس سے مرتا رہے گا، سہمی سہمی سی ایک بہن ہوگی اور سہمے سہمے سے سوال ہوں گے ____ نہیں اُن سوالوں کی پرواہ مت کرو ____ میں کرتی تو اس وقت نائیٹی پہن کر تمہارے سامنے نہیں ہوتی ____ اُنہیں بس یہی پڑی تھی کہ میری شادی ہو جائے ____ پھر تم ملے۔ تم مجھے بستر پر آزما کر، میرے بدن کو منظوری دینے والے تھے۔ سچ، ایک بات بولنا۔ تم مجھ سے شادی کرنا چاہتے تھے یا میرے بدن سے.....'

'وقت ____' لڑکے نے پھر مضبوط لفظوں کا سہارا لیا ____ 'وقت بدل رہا ہے۔'

'وقت' ____ وہ زور سے ہنسی ____ 'بدل رہا ہے نہیں۔ بدل گیا ہے۔ لیکن تم کیوں کانپ رہے ہو۔ دیدار کرو میرا، دیکھو مجھے۔'

کمرے میں نور کا جھماکا ہوا ____

ایک لمحے کو اُس کے ہاتھ پیچھے کی طرف گئے ____ نائیٹی کے ہک کھلے اور نائیٹی ہوا میں اُڑتی ہوئی بستر پر پڑی تھی ____

لڑکا بستر سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ کانپ رہا تھا۔ اُس کی پلکوں پر جیسے انگارے رکھ دیئے گئے تھے ____ نہیں، انگارے نہیں ____ برف کی پوری سلی ____ وہ جیسے

پلک جھپکانا بھول گیا تھا ___ ہوش اُڑ چکے تھے۔ آنکھیں ساکت و جامد تھیں..... ایک دھند تھی جو روشندان چیرتی ہوئی کمرے میں پھیل گئی تھی۔

'دیکھو مجھے.....'

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی آئینہ کے قریب آ گئی ___ ''دیکھو مجھے۔ میں نے کہا تھا، نا۔ تم سے زیادہ بھوکی ہوں ___ پچیس لوگ تم سے پہلے بھی مجھے دیکھے بغیر واپس لوٹ چکے ہیں ___ سمجھ سکتے ہو۔ پچیس بار تو یونہی مری ہوں گی ___ شادی کے ہر احساس کے ساتھ بدن میں انگارے پلتے تھے ___ جانتے ہو نا، فرائیڈ نے کہا تھا، عورت مرد سے زیادہ اپنے بدن میں انگارے رکھتی ہے ___ اور میں تو بڑی ہوئی تب سے انگارے جمع کرتی رہی تھی..... فلم سے سیریل، ٹی وی، دوست سہیلیوں کی شادی ___ مجھ سے بے حد کم عمر لڑکیوں کے ہاتھ پیلے ہونے کے قصے..... ہر بار انگاروں کی تعداد بڑھ جاتی۔ میں ہر بار انگارے چھپا لیتی..... وہ زور سے چیخی ___ رنڈی نہیں ہوں میں۔ بازار میں نہیں بیٹھی ہوں۔ تم نے سودا نہیں کیا ہے میرا۔ میری میں نے بھی تسلی کی تھی کہ اگر تم میرے شوہر ہوئے تو تمہیں تو پورا پورا مجھے دیکھنا ہی ہے ___ اور پھر..... میرے گھر والے یوں بھی تھک گئے ہیں۔''

اُس نے بے حد مغرور انداز میں آئینہ میں اپنی ایک جھلک دیکھی۔ جیسے قلوپطرہ نے اپنی ایک جھلک دیکھی ہو اور فاتحانہ انداز میں سر اٹھا کر اپنے ملازموں سے کہا ہو ___ یہ آئینہ لے جاؤ، اس کا عکس بھی مجھ سے کم تر ہے۔ کوئی ایسا آئینہ خانہ لاؤ جو میری طرح دکھ سکے۔

وہ مغرور اداؤں کے ساتھ مڑی۔ بستر سے نائیٹی کو اٹھایا اور دوسرے ہی لمحے نائیٹی کے 'بدن' میں داخل ہو گئی ___

لڑکا ابھی بھی تھر تھر کانپ رہا تھا.....

'یہ کوٹھا نہیں تھا اور اتنا طے ہے کہ تم آج تک کسی کوٹھے پر نہیں گئے ___ دیکھو..... تم کانپ رہے ہو۔ نہیں، ادھر آؤ۔ اُس نے بے جھجک اُس کا ہاتھ پکڑا۔ مرر کے سامنے لے آئی۔ یوں نو، تم کیسے لگ رہے ہو۔ جوناتھن سوئفٹ کے گھوڑے ___ لیکن نہیں۔ تم گھوڑے بھی نہیں ہو..... تم ایک ڈرپوک مرد ہو جو ایک خوبصورت بدن کو آنکھ اُٹھا کر غور سے دیکھ بھی نہیں سکتا ___'

لڑکا بے حس و حرکت تھا۔ ساکت و جامد۔ لاش کی طرح سرد ___

صوفیہ مشتاق احمد کی آنکھوں میں برسوں کی ذلت چنگاری بن کر دوڑ گئی ___ بھوک، نفرت پر غالب آ گئی ___ 'دیکھتے کیا ہو ___ میں پوچھتی ہوں۔ اب بھی تم اس کمرے میں کھڑے کیسے ہو۔ تم تو شرط کا بوجھ اٹھانے کے قابل بھی نہیں ہو۔ نامرد کیڑے۔ نہیں۔ وہیں کھڑے رہو اور جانے سے پہلے میری ایک بات اور سن لو۔ میں نے کہا تھا نا تم سے زیادہ بھوکی ہوں میں مگر رنڈی نہیں تھی۔ ارے، تمہاری جگہ میں ہوتی، میں نے شرط رکھی ہوتی تو کم از کم یہاں آنے کی جرأت کے بعد، میں نے نہیں کم از کم تمہیں چھوا ضرور ہوتا۔ دھیرے سے، تمہارے ہاتھوں کو..... کہ بدن کیسے بولتا ہے ___ کیسے آگ اُگلتا ہے۔ لیکن تم..... تم تو بند کمرے میں، اپنی ہی شرط کے باوجود، چھونا تو دور اسے دیکھنے کی بھی ہمت نہیں کر سکے.....' ایک لمحے کو جیسے اُس کے اندر برقی لہر دوڑ گئی۔ بے حد نفرت کی آگ میں سلگتے ہوئے صوفیہ احمد نے اُسے زور کا دھکا دیا..... 'گیٹ لاسٹ'

لڑکا پہلے ہڑبڑایا۔ پھر سرعت کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گیا۔ ایک لمحہ کو صوفیہ مشتاق احمد مسکرائی۔ اپنا عکس آئینہ میں دیکھا ___ نہیں۔ اب اُسے مضبوط ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اُس نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ باہر کہاسے گر رہے تھے۔ سرد ہوا تیز ہوگئی تھیں۔ کھڑکی کھلی رہ گئی تھی۔ اُف، اس درمیان وہ جیسے وہ دنیا و مافیا سے بالکل بے خبر ہوگئی تھی۔ تیز، جسم میں طوفان برپا کرنے والی سردی کو بھی ___ اُس

نے اپنے ہی دانتوں کے کٹکٹانے کی آواز سنی اور اچانک ایک لمحے کو وہ ٹھہر گئی۔ وہی جانی پہچانی دستک ____ خوفناک آوازوں کا شور۔ جیسے دیواروں پر کوئی رینگ رہا ہو۔ کیا ویمپائر.....؟ ڈراکیولا.....؟ باہر یقیناً اس پُر اسرار تماشے کا حال جاننے کے لئے اُس کے گھر والے موجود ہوں گے ____ اور اُس کا بے چینی سے انتظار بھی کر رہے ہوں گے ____

مگر..... یہ دستک..... خوفناک آوازیں..... دیواروں پر رینگنے کی آواز ____ جیسے ہزاروں کی تعداد میں چمگادڑیں اُڑ رہی ہوں۔ پیڑوں پر اُلو بول رہے ہوں۔ شہر خموشاں سے بھیڑیوں کی چیخ سنائی دے رہی ہو ____ وہی رینگنے کی آواز ____ برفیلی، تیز ہوا سے کھڑکی کے پٹ ڈول رہے تھے..... وہ تیزی سے آگے، کھڑکی کی طرف بڑھی ____

گہری دھند کے باوجود شہر خموشاں کا منظر سامنے تھا اور وہاں دیوار پر چھپکلی کی طرح رینگتا ڈراکیولا، اس بار اُسے بے حد کمزور سا لگا ____ شاید وہ شہر خموشاں میں واپس اپنے 'کوفن' میں لیٹنے جا رہا تھا۔

جبکہ صبح کی سپیدی چھانے میں ابھی کافی دیر تھی ____

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

لیبارٹری

گندہ تالاب، کیکڑے اور وہ

یہ قیاس لگانا بہت آسان ہے کہ وہ کہاں پیدا ہوئے ہوں گے ـــــ وہ سابرمتی آشرم سے دلی کے آشرم چوک تک کہیں بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔ کہیں، کسی بھی طرح، کسی بھی حال میں ـــــ لیکن معاف کیجئے گا۔ اُنکی پیدائش کے عمل کو کسی بھی طرح میں 'کلوننگ پروسیس' سے جوڑنے کی اجازت نہیں دوں گا۔ اس لئے کہ کلوننگ کے ذریعہ چاہے وہ بھیڑ، ہو یا انسان ـــــ اور یقیناً آپ تسلیم کریں گے کہ سائنس کی تجربہ گاہیں، انسانی تجربہ گاہوں کے مقابلے، کم خطرناک ہیں ـــــ نہیں، اس بحث کے لئے ڈولی بھیڑ' یا پہلے انسان 'مکاؤف' کے تصور سے الجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اتنا کہنا کافی ہے کہ سائنس کا پیدا کردہ انسان بھی گوشت پوست کا ہی انسان ہوگا مگر اُس انسان سے کم خطرناک ہوگا ـــــ جو انسان کے ذریعہ، انسانی فضا میں، انسانی گھر، انسانی کمرے میں اور انسانی عمل کے دوران ان عالم وجود میں آ گیا ہے ـــــ (اس لئے تسلیم کر لیتے ہیں کہ کلوننگ کا انسان دوم درجے کا انسان ہوگا، کہ اُس کے اندر جنگ اور تہذیب کے جراثیم وہ شدت اختیار نہیں کر پائیں گے جو.....)

اس لیے فرض کرتے ہیں کہ وہ وہی تھے جو انسانی فضا میں، انسانی گھر میں، انسانی عمل کے دوران ـــــ

اور فرض کرتے ہیں کہ وہ سابرمتی آشرم سے دلّی کے آشرم چوک تک کہیں بھی پیدا، ہو سکتے ہیں ـــــ

○○

وہ کئی تھے۔ چار، پانچ چھ، سات، آٹھ..... یعنی کل ملا کر اتنے کہ اُنکی گنتی آسانی سے ہوسکتی ہے۔ وہ بیحد نرم ملائم، سادہ لوح یا ایسے تھے، جن کو لے کر پانیوں کی مثال دی جاسکتی ہے۔ یعنی کسی بھی برتن میں ڈال دو ـــــ وہ ایسے تھے کہ آپ اُن کا کچھ بھی استعمال کر سکتے تھے ـــــ اور جس دن کا واقعہ ہے، اُس دن دوپہر کا سورج آگ برساتا ہوا اپریل مہینے کو جلانے اور جھلسانے کی تیاری کر رہا تھا۔ دو بجے کا وقت ہوگا۔ 'وہ' بہر کیف، ساری رات کے تھکے ہوئے ـــــ ایک چھوٹے سے تالاب کے کنارے بیٹھے، گندے پانی سے بار بار نکلتے اور اندر جاتے کیکڑے کا لطف لے رہے تھے ـــــ

'کیکڑے کے کتنے پاؤں ہوتے ہیں۔'

دوسرا زور سے قہقہہ لگا کر ہنسا ـــــ کیکڑے کی آنکھیں کہاں ہوتی ہیں، سمجھ میں نہیں آتا ـــــ'

'سالے میں نے پاؤں کے بارے میں پوچھا تھا۔

ـــــ 'اور میں نے آنکھوں کے بارے میں۔'

اُن میں ایک سن رسیدہ تھا۔ اُس کی بڑی بڑی دانشورانہ، آنکھوں میں چمک لہرائی۔ 'دیکھو، کتے کو.....'

'کتا نہیں کیکڑا'

'ایک ہی بات ہے۔'

'ایک ہی بات کیسے، تم اور میں کیا.....'

وہ ہمیشہ کی طرح سنجیدہ تھا ـــــ ایک ہی بات ہے..... دیکھو..... دیکھو کیکڑا مٹی سے پھر باہر نکل آیا۔

'بارش ہوگی۔'

'ان سالوں کو پتہ کیسے چل جاتا ہے۔'

'بارش کی اطلاع ملتے ہی کیکڑے اپنے بلوں سے باہر نکل آتے ہیں۔'

'اسی سنجیدہ قسم کے دانشور نے اطلاع بہم پہنچائی۔ کیکڑے کے بارہ پاؤں ہوتے ہیں۔ کینکوے اپنے پاؤں کا حساب نہیں رکھ پاتے۔ انکے لئے زندگی کا کوئی تصور نہیں ہے۔ یہ اپنی حفاظت بھی نہیں کر سکتے۔ دیکھو۔ دیکھو..... سالا گرا_____

بارہ پاؤں نہیں۔ کینکوے کے دس پاؤں ہوتے ہیں_____

'آٹھ.....'

'چھ.....'

پہلے نے گفتگو کے رُخ کو ہی بدل دیا تھا۔ کیکڑے کے ہاتھ کہاں ہیں؟ آں؟ ہاتھ_____

'ہاں، ہاتھ کہاں ہیں؟'

پہلا پُر اُمید تھا_____ 'دراصل آپ لوگ جسے پیر سمجھ رہے ہیں وہ.....'

'ممکن ہے۔'

'نہیں_____ یا تو کیکڑے کے ہاتھ نہیں ہوتے یا پاؤں۔'

○○

دھوپ سخت تھی، لیکن اچانک بادلوں کا ایک کارواں دھوپ کے آگے سے گزر گیا

'بارش ہو سکتی ہے۔'

'نہیں بھی۔'

'کیکڑے زمینوں سے باہر آ رہے ہیں، اس لئے ممکن ہے.....'

کیکڑے زمینوں سے باہر نہیں آ رہے ہیں، جان بچا کر بھاگ رہے ہیں۔'

'جان بچا کر ــــــ'

'بارش کے موٹے موٹے قطرے، پتھر بن کر.....'

'معصوم کیکڑے۔'

'قطعی نہیں ــــــ' بیحد سنجیدہ نظر آنے والے دانشور نے منطق کا حوالہ دیا ــــــ ایسے بدنما، بدصورت، بدہیئت اور اس گندے آکٹوپس کی چھوٹی قسم کو کیا نام دیں گے۔ یہ کچھ بھی ہو سکتا ہے لیکن معصوم نہیں ہو سکتا۔

وہ دیر تک سر جوڑے بے بنیاد، غیر دلچسپ گفتگو میں الجھے رہے کہ کیکڑہ عالم وجود میں کیسے آتا ہے۔ کیکڑہ دیکھتا کیسے ہے؟۔ کیکڑا زندہ کیسے رہتا ہے۔ کیکڑے کی زندگی کتنے دنوں کی ہوتی ہے۔ یا، کیکڑوں کے پاس زندگی کا تصور کیوں نہیں ہے۔ کیکڑے اپنی حفاظت کے بارے میں کیوں نہیں سوچتے۔ وہ دیر تک سر جوڑے بیٹھے تھے کہ بادلوں کی اوٹ میں گم ہوتے سورج نے ان کی تفریح طبع کے لئے بارش کی کچھ موٹی بوندیں آسمان سے بھیج دیں۔ کیکڑا کچھ لمحے تک تڑپا۔ پانی کے چھوٹے سے گڈھے میں 'اچھلا' کودا ــــــ اوپر نیچے کیا۔ بارش ذرا تیز ہوئی تو چھوٹے سے گڈھے میں کیکڑے کی لاش تیر رہی تھی۔

وہ قہقہہ لگاتے ہوئے اُٹھے ــــــ

ــــــ 'جو اپنی حفاظت نہیں کر پاتے ہیں'

دوسرے نے جوڑا ــــــ جو زندہ رہنا نہیں جانتے ہیں۔

تیسرا مسکرایا ــــــ اور جو اقلیت میں ہوتے ہیں..... اقلیت، وہ اس لفظ پر دل کھول کر ہنسا۔

'ہم نے جو کچھ دیکھا، وہی اس کی زندگی تھی۔ یعنی بس اُتنی ہی زندگی، جتنی ہم

دیکھ سکے۔ اُس نے زرا سا ہاتھ پاؤں مارا اور ــــــــ'

'اس کی لاش کا کیا کیا جائے۔' دانشور، سنجیدہ تھا۔ بارش سے گیلی ہوئی مٹی اُس نے دونوں ہاتھوں میں بھری۔ کیکڑے کے 'جسم' پر ڈالی۔ عقیدت سے آنکھیں بند کرتے ہوئے بولا۔

'رام نام ستیہ ہے۔'

دوسرے نے تڑکہ لگایا۔ 'جھوم کے بولو ستیہ ہے۔

'ناچ کے بولو ستیہ ہے'

'گا کے بولو ستیہ ہے۔'

'رام نام ستیہ ہے.....'

بارش کی رم جھم جاری تھی۔ کپڑے بھیگ چکے تھے۔ چلتے چلتے 'یہ کئی' ٹھہر گئے۔ پہلے نے دوسرے کو ــــــ دوسرے نے تیسرے ..... تیسرے نے چوتھے ..... یعنی سب نے ایک دوسرے کو باری باری سے دیکھا ــــــــ

پہلے کی آواز مدھم تھی ..... 'رام نام .....'

اس کے بعد کوئی کچھ نہیں۔ سب خاموش ہو گئے۔ اور اٹھ کر یونہی آوارہ گردی کے لیے نکل گئے ــــــــ

کالی رات' مہذب لوگ اور تجربہ گاہ

وہ مہذب لوگ تھے۔ وہ اتنے مہذّب تھے کہ اپنے مہذب ہونے کی دلیلیں دے سکتے تھے۔ اور اُن کی دلیلیں اتنی باوزن ہوا کرتی تھیں کہ اُن دلیلوں پر چپ چاپ لوگ سر جھکا لیا کرتے تھے۔

محترم قارئین، یہاں اُن بہت ساری سیاہ راتوں کا ذکر ضروری نہیں ہے، جو 'تجربے' کے لئے اُن کی لیبارٹری میں رکھی ہوئی تھیں۔ لیبارٹری۔ وہ تہذیب سے

جڑی ہوئی ہر شئے کو اپنی تجربہ گاہ میں لے جاتے تھے۔ اُنہیں سائنس میں مکمل یقین تھا۔ ردرفورڈ' سے آئن اسٹائین اور گراہم بیل سے نیوٹنس لاء کے بارے میں اُن کی معلومات خاصہ وسیع تھیں۔ جیسے وہ جانتے تھے کہ ہر ایک عمل کا اُس کے مساوی اور مخالف ایک ردّعمل ہوتا ہے۔ مادّہ کے فزیکل اور کیمیکل ریکشن پر اُن کی خاص نظر ہوا کرتی تھی۔ اور وہ اس بات پر فخر کرتے تھے کہ ہم آج تک کی، اس سب سے زیادہ مہذب دنیا کے، سب سے زیادہ مہذب باشندے ہیں۔ اور یہ بات اُنہوں نے اپنی گرہ میں باندھ لی تھی کہ اِس مہذب دنیا کا اصول ہے، جو طاقتور ہیں، وہی زندہ رہیں گے۔ یعنی جو اقلیت میں ہیں، کیڑے مکوڑے یا کیکڑے وہ ویسے بھی مُردہ ہیں اور اُنہیں جینے کا کوئی حق نہیں۔

تو یہ مہذب لوگوں کی لیبارٹری تھی، جہاں یہ جاننے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی کہ تہذیب اور جنگوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ یعنی جنگیں ہی وہ بیش قیمت زیور ہیں، جن سے ہمیشہ سے تہذیبوں کو آراستہ کرنے کا کام لیا جاتا رہا ہے۔

تو فرض کر لیتے ہیں، یہ وہی تھے جو انسانی فضا میں، انسانی گھر میں اور انسانی عمل کے دوران ـــــــ

اور فرض کر لیتے ہیں کہ وہ سابرمتی آشرم سے دلّی کے آشرم چوک تک کہیں بھی پیدا ہو سکتے تھے ـــــــ

وہ 'کئی' تھے اور پچھلی کئی راتوں سے لیبارٹری کے لئے کام کر رہے تھے ـــــــ

اور یہ بھی جاننا ضروری ہے کہ وہ کوئی بہت دل سے اپنے کام کو انجام نہیں دے رہے تھے۔ نہ اُنہیں مجبور کیا گیا تھا۔ بلکہ وہ ایک 'چھوٹے' سے خوف کی بنیاد پر، کہ اس طرح مہذب لوگوں کی دُنیا سے اُنہیں 'دیش نکالا' مل سکتا ہے ـــــــ وہ اپنے ضمیر کی آواز پر اس کام کے لئے تیار ہو گئے تھے ـــــــ

اور اس لئے بھی ـــــ کہ ان میں سے سب کے پاس ایک خاندان تھا ـــــ خاندان میں ماں باپ تھے ـــــ بھائی بہن تھے۔ بیوی تھی اور بچے تھے.....

اور اس لئے بھی..... کہ بچے معصوم ہوتے ہیں ـــــ

اور اُن سے کہا گیا تھا۔ جو مضبوط ہوتے ہیں، بس اُنہیں ہی جینے کا حق ہوتا ہے۔ تہذیب کا فرمان بھی یہی ہے۔ اکثریت کی آواز بھی یہی ـــــ اور اقلیتوں کو..... اُنہیں چانکیہ کے اشلوک پڑھائے گئے تھے.....

nqjtZuLFk p liZL; oja liksZ u nqtZu %A

likZs na'kfr dkys rq nqtZuLrq ins insAA

(بُرے انسان اور سانپوں میں اگر موازنہ کیا جائے تو
سانپ بہتر ہے کیونکہ سانپ اُسی وقت ڈستا ہے
جب موت آتی ہے اور انسان تو قدم قدم پر ڈستا رہتا
ہے ـــــ)

اور اُنہیں بتایا گیا، اس سے پہلے کہ وہ آپ کو ڈسیں، آپ کی تہذیب کو۔ آپ.....

○○

وہ کئی تھے ـــــ

اور کئی' گیس کے سلنڈروں سے بھرے ٹرک پر 'لد' کر ساری رات تہذیب کے نام نئی نئی فنتاسی کو جنم دیتے رہے۔ یعنی ایسی فنتاسیوں کو جن کے تذکرے نہیں ہو سکتے۔ جن پر گفتگو نہیں ہو سکتی۔ زندہ معصوم بچوں کو نئے نئے دلچسپ طریقوں سے آگ میں زندہ جلانے سے لے کر، آبروریزی اور حاملہ عورتوں کی کوکھ میں ہاتھ ڈال کر ـــــ

نہیں جانے دیجئے۔ فنتاسی لفظوں کا لباس اوڑھ لے تو ذائقہ جاتا رہتا ہے۔

آپ ایسا کیجئے۔ آپ خود ہی اچھی سی فنتاسی گڑھ لیجئے۔ کیونکہ آپ نے ایک طرف جہاں 'اتہاس' کے قصے پڑھے ہیں، وہیں ہٹلر، مسولینی، چنگیز خاں اور نریندر مودی کے نام بھی سُنے ہیں۔ آپ بابر سے بابری مسجد تک سب کچھ جانتے ہیں——

اس لئے ذائقہ دار فنتاسیاں گڑھ لیجئے۔ جس قدر چاہے 'رس' یا 'گھول' ملالیں۔ آپ کی مرضی——

○○

محترم قارئین،

وہ کئی تھے——

اور وہ وہی تھے جو سابرمتی آشرم سے دلّی آشرم چوک تک.....

اور وہ وہی تھے جو انسانی فضا، انسانی گھر اور انسانی.....

○○

سب کچھ آناً فاناً ہو گیا تھا——

پچھلے کئی دنوں سے وہ 'تہذیب' کو بچانے میں لگے تھے۔ اور آپ جانتے ہیں، تہذیبوں کی حفاظت میں ایسی ہزاروں جانوں کا نقصان تو ہوتا ہی ہے——

ہزاروں جانیں لی گئی تھیں۔ وہ بھی ہزاروں طریقوں سے—— مگر——

اُس گھر میں جو کچھ ہوا، وہ نیا تھا۔ ایک اکثریتی فرقہ کے شخص نے اقلیتی فرقہ کے کچھ لوگوں کو 'پناہ' دی تھی، کہانی بس یہیں سے پیدا ہوئی تھی۔

وہ بس اُس آدمی کو دیکھ رہے تھے جو گھگھیائی ہوئی آواز میں اِن لوگوں کو دیکھ کر چیخ پڑا تھا۔

'مجھے نہیں۔ میں تو اکثریت.....'

'اکثریت!'

'ہاں۔ میری متی ماری گئی تھی.....' وہ پاگلوں کی طرح چیخا ــــــ یہ میری بیوی ہے یہ بہن۔ یہ بیٹی ہے۔ اور یہ بیٹا۔ یہ سب میرے ہیں۔ ہاں اُنہیں۔ انہیں لے جاؤ۔ جو بھی کرنا ہے کرو۔ کرو۔ میری متی ماری گئی تھی۔ میں بیوی کے بہکاوے میں آ گیا تھا۔ دوست ہے۔ بچالو۔ میں گھر لے آیا۔ مجھے کیا معلوم تھا۔ وہ چاروں..... لے جاؤ..... لے جاؤ.....' وہ اپنے گھر کے لوگوں کو ایسے گھیر کر کھڑا تھا، جیسے چڑیا انڈے سیتی ہے۔ اُس کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ بدن ڈول رہا تھا۔ آواز میں گھبراہٹ تھی۔ بیوی، بہن، اور بچوں کی حالت بھی وہی تھی۔

'تم نے بچایا کیوں؟'

'میں نے کہا نا۔ بیوی نے.....'

'میں نے نہیں۔' بیوی چیخی۔ جھوٹے ہو تم۔'

'م.....م..... میری بیٹی نے.....'

'خیر جو بھی ہو۔' یہ کئی' اُن کی طرف گھومے۔ وجہ جو بھی ہو لیکن تم نے بچانے کی کوشش کی۔ اس لئے کہ..... دوست!

'میں نے کہا نا متی ماری گئی تھی۔'

'یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ اقلیت ہے۔'

بیوی نے بیٹی کو ایک گندی سے گالی بکی' وہ اُس کے ساتھ پڑھتی ہے۔ اس لئے دوست لگتی ہے۔'

دوست کوئی نہیں ہوتا۔' دانشور سنجیدہ تھا۔ دوستی برابر والوں میں ہوتی ہے۔ اکثریت کی اکثریت سے اور.....'

'ہمیں چھوڑ دو..... چھوڑ دو..... انہیں لے جاؤ.....'

دانشور نے اقلیت کے چاروں گنہگاروں کی طرف دیکھا۔ وہ سچ مچ ایک لاش بن گئے تھے۔ چہرے سپید پڑ گئے تھے جسم میں خون نہیں۔ چاروں مذبح کے جانوروں کی طرح اُداس کھڑے تھے۔ یعنی کس کی باری پہلے آتی ہے۔ پھر کس کی باری ـــــ

دانشور نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھا۔

'باہر آؤ۔' اُس نے گھر کے لوگوں کو غصے میں اشارہ کیا۔ باہر کوئی نہیں بھاگے گا۔ جو جیسے ہے۔ جس حال میں ہے، ویسے ہی۔ میرا مطلب......

اکثریت والا اب بھی چلاّ رہا تھا۔ انہیں لے جاؤ...... میری تو مت ماری گئی تھی۔

OO

یہ کئی اب باہر تھے۔ باہر ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے۔

'دیکھو ـــــ' دانشور سنجیدہ تھا۔ زرا سوچو۔ یہ ایک بے حد حسین تجربہ ہوگا، یعنی اس سے پہلے جتنے تجربے ہم کر چکے ہیں، یا ہم کریں گے۔ یا ہم کرنے والے ہیں۔'

سب نے ایک دوسرے سے کانا پھوسیاں کیں۔ پھر پُر امید ہو گئے۔

'اب کیا ارادہ ہے!' ـــــ دانشور جلد از جلد اپنی 'پیاس' کو انجام دینا چاہتا تھا۔

'باس۔ مکان مالک کا کیا کیا جائے۔'

'وہ تو اکثریت کا......' پہلا بولتے بولتے ٹھہر گیا۔

دانشور غصے میں بولا۔ پریشانی اب ایسے ہی لوگوں سے پیدا ہوئی ہے۔ ایسے ہی لوگ...... یہی لوگ ہمارے اب تک کے تجربے کو ناکام کرتے رہے ہیں۔'

تو سب سے پہلے......'

دانشور نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ''ساری باتیں یہیں کر لوگے کیا۔ کچھ اُن لوگوں کے لئے چھوڑو۔ انہیں معلوم ہونا چاہئے۔ اُن کے ساتھ کچھ لمحوں میں، آنے والے کچھ لمحوں میں کیا ہونے والا ہے۔''

اگلے ہی لمحے، یہ لوگ اندر تھے ـــــ سامنے اکثریت اور اقلیت کے سہمے ہوئے

9افراد ان کے فیصلے کے منتظر تھے۔

'آہ، فنتاسی'، دانشور چلایا۔ دوسرے ہی لمحے اُس کی آواز بدل گئی ——

تہذیب ہر بار انصاف کرتی ہے۔ جیسے کوتیا۔ یہ تہذیب کا اصول ہے۔ یہ، یہ بہت زیادہ چلّا رہا تھا۔ اس کے منہ میں تیزاب کے قطرے ٹپکاؤ۔ تیزاب کے قطرے ......آہ، اور اُس کی بیوی۔ وہ بہت تیز بولتی ہے۔ مرچی کی طرح۔ پہلے اُس کے جسم پر، آنکھوں میں مرچی کے پاؤڈر ڈالو —— بیٹی نے بچانے کی کوشش کی تھی۔ ہے نا۔ ایک بیحد پیاری عمر۔ اور اس عمر میں ایک بیحد پیارا چہرہ۔ جیسا ہونا چاہئے —— اسے بانٹ لو۔ ایسا کرو۔ دونوں بچیوں کو بانٹ لو۔ ان کے سامنے تفریح کرو —— ان میں سے کوئی کچھ نہیں بولے گا۔ جسم تفریح کے لئے ہوتا ہے۔ کمسن کے گوشت زیادہ ذائقہ دار ہوتے ہیں۔

'اور —— اقلیت والوں کے لئے باس'

ایک بار میں ایک فنتاسی۔ ان کے لئے کچھ الگ سوچتے ہیں۔ سب سے پہلے اُس سنپولئے کو۔ اس کا بھیجا اُڑا دو۔ اقلیتی طبقے کا سنپولیا خطرناک ہوتا ہے۔ حرامی۔

بچے نے تھوک دیا تھا۔

پہلے نے ریوالور تان لیا —— اور اس درمیان ایک گندی گالی بکتا ہوا اکثریت کا بچہ سامنے آ گیا تھا۔

''تو بھاگ جا ——''

'دھائیں'

دوسرا بچہ ایک لمحے کے لئے دوسرے کمرے میں پھر...... رہ گیا۔ گولی دوسرے بچے کے سینے پر لگی تھی۔ سینے سے خون کے فوارے چھوٹ پڑے تھے۔ کوئی بھی نہیں چیخا ——

سب جیسے اس کھیل کے خاتمے سے پہلے ہی انجام' کو جان چکے تھے۔

دانشور نے کھیل کا طریقہ سمجھایا ـــــ اسے پنکھے سے لٹکا دو۔ اُس کی ساڑی ہٹاؤ۔ پہلے بلیڈ سے وہاں تک..... پھر ـــــ' اُس نے بچیوں کو جلتی آنکھوں سے دیکھا ـــــ یہ نئے کپڑے کی طرح ہیں۔ قینچی سے کبھی نئے کپڑے کو کاٹا ہے۔ ان کی چھاتیاں.....' وہ مسکرا رہا تھا۔ بلیڈ گھماتے ہوئے' تم ایک عجیب سے نشے میں ڈوب جاؤ گے۔'

تو یہ کمرہ اب ایک لیبارٹری تھا۔ تجربے چل رہے تھے۔ نئے نئے تجربے ـــــ موت۔ عورتیں اور مرد ـــــ جوان بچیاں اور فنتاسی ـــــ زندگی اور ایڈونچر ـــــ زمین پر ایک گھنٹے کی تفریح کے بعد آٹھ لاشیں سجی تھیں۔

'حکم باس۔' پہلا آہستہ سے بولا۔

یہ طے تھا کہ سب تھکن سے چور ہو گئے تھے۔

'ابھی آخری فنتاسی باقی ہے۔ یعنی آخری تجربہ۔ دونوں مرد کی لاش چھوڑ دو۔ باقی گھسیٹ کر اندر لے جاؤ۔ ہم ایک نیا تجربہ کریں گے۔'

'ان کے عضو تناسل کاٹ دو۔' دانشور سنجیدہ تھا۔ اور تم ـــــ تم سلائی جانتے ہو نا۔ ماڈرن ٹیلرس کے بچے۔ کپڑے سیتے سیتے انگلیاں ٹیڑھی ہو گئیں تیری۔'

'حکم..... حکم باس'

'ان کے عضو تناسل بدل دو۔'

'مطلب۔ مطلب باس۔'

''ان سالے سو کالڈ.....' اُس نے پھر گندی سی گالی بکی ـــــ ان سالوں کو بتانا ہے اب۔ سمجھانا ہے ـــــ دھرم کو کھیل سمجھنے والوں کو مزہ چکھانا ہے ـــــ یہ،

جو ہر بار ہمارے تجربوں کو ـــــ اُس نے پھر گالی کا سہارا لیا ـــــ اچانک چونکا ـــــ یہ آوازیں سن رہے ہو۔ ہمارے دوسرے ساتھی یہاں پہنچنے ہی والے ہیں ـــــ اُنہیں دیکھنے دو کہ ایسے لوگوں کے پاس نہ اپنا دماغ ہوتا ہے، نہ عضوِ تناسل۔ اب آپریشن شروع کرو ـــــ'

آپریشن شروع ہو گیا۔

پھر ٹیلر ماسٹر نے جیب سے قینچیاں، فیتے اور بلیڈ کا پیکٹ نکال دیا۔ وہ ایک منجھے ہوئے درزی کی طرح بدن کے 'چادر' کو لے کر بیٹھ گیا ـــــ چمڑے کی جھلّی، جو نئے انسانی وجود کے لئے زندگی کا امرت بن جاتی ہے۔ فنکاری اور صفائی سے بدل دی گئی تھیں۔ ٹیلر ماسٹر نے انتہائی مہارت سے اپنا کام انجام دیا تھا۔ ساتھیوں نے شاباشی دی۔ کندھے تھپتھپائے۔ دونوں لاشیں۔ باہر مین گیٹ پر ٹانگ دی گئیں ـــــ'

تجربہ کامیاب تھا۔

مگر کھیل اب شروع ہوا تھا ـــــ

تہذیب کے پیامبر ڈھول، تاشہ بجاتے آتے۔ عضو تناسل کو دیکھتے۔ گندی گالیاں بکتے پھر گزر جاتے ـــــ وہ دیر تک بلکہ کہنا چاہیے کئی گھنٹے تک اس کھیل سے مستفیض ہوتے رہے۔ چلتے وقت دانشور نے قہقہہ لگا کر کہا۔

'صرف بدن کی ایک چمڑی بدل دینے سے۔ تم سب سمجھ رہے ہو نا ـــــ آہ، کیا کیا دلکش کھیل تھا۔' آہ، اس کھیل کو ہم بہت دن تک بھول نہیں پائیں گے۔ اور ہمیں اُس۔ اُس مکار مکان مالک کو اُس کے کئے کی سزا بھی دینی تھی۔ اب اُس کی لاش دیکھو۔ اُس کی لاش کی تکا بوٹی ہو چکی ہے۔ جبکہ اقلیت کی لاش'

'باس' اُس پر تو پھول مالائیں چڑھی ہیں۔'

'اب چلو، اس کھیل کا سرورتا زندگی قائم رکھنا ہے۔'

وہ جھومتے ہوئے نشہ کی حالت میں آگے بڑھ گئے۔

○○

بچہ اور زندگی

'تمہیں وہ بچہ یاد ہے'

'بچہ؟'

'باس، وہ اقلیت کا بچہ، ہم تو اُس بچے کو بھول ہی گئے۔'

'اُسے بچانے مکان مالک کا بچہ آ گیا تھا۔'

'پھر ہم کھیل میں الجھ گئے۔'

'اور بچہ بھاگ گیا۔'

'وہ بچہ کہاں جا سکتا ہے ــــــ؟' دانشور کی آنکھوں میں چمک لہرائی۔

'اُس کی نیلی نیلی آنکھیں' پہلا مسکرایا۔ تمہیں اُس بچے کی یاد ہے۔ اُس کے چہرے پر زرا بھی ڈر یا گھبراہٹ نہیں تھی۔'

'اُس کے ہونٹ' دوسرا کہتے کہتے ٹھہرا.....

'بولو.....بولو.....' دانشور کی آنکھیں مند گئی تھیں۔

'کھٹے کھٹے بیر جیسے تھے۔ اور پیارے۔'

'اُس کا چہرہ۔' تیسرے نے اپنے خیال کا اظہار کیا ــــــ یقیناً وہ ایک بہت خوبصورت بچے کا چہرہ کہا جا سکتا ہے۔'

'وہ کہاں چھپا ہوگا؟' دانشور کو اپنی غلطی پر غصہ آ رہا تھا۔

'اُسے چھوڑنا مناسب نہیں ہے۔'

'اُسے مارنا.....' پہلا کہتے کہتے ٹھہر گیا.....

دانشور نے حیرانی سے پوچھا ـــــ 'کہیں تم سب اُس بچے پر رحم تو نہیں کر رہے۔'

'نہیں باس۔ قطعی نہیں۔'

'مگر کیا اُسے مارنا.....'

دانشور غصے میں گھوم گیا۔ مطلب۔ 'تم لوگ کہنا کیا چاہتے ہو؟

'بچہ ہے۔'

'بچے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔'

'کیوں نہ ہم اُسے اکثریت کا بنا دیں؟'

'اکثریت ـــــ؟' دانشور چونک گیا تھا۔

'ہاں۔ دھرم پریورتن۔ بچہ تو پانی ہوتا ہے۔'

دانشور کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ ابھی زیادہ گھنٹے نہیں ہوئے۔ بچہ بھوک پیاس سے بے حال ہو رہا ہوگا۔ وہ یقیناً چھپا اور زندہ ہوگا۔ ہمیں بچے کو تلاش کرنا چاہیے۔

'اور بچانا بھی۔'

پہلا ابھی بھی مطمئن نہیں تھا۔ کیا وہ وہاں موجود ہوگا ـــــ میرا مطلب ہے.....'

دانشور نے پُر امید لہجے میں کہا۔ فضول کی باتیں نہیں۔ ہم اس مدعے پر بہت باتیں کر چکے ہیں۔

'بچے کی زندگی ضروری ہے' ـــــ ٹیلر ماسٹر نے لمبی سانس لی۔

'ہاں، اُس کی زندگی بیش قیمت ہے' ـــــ یہ پہلا تھا۔

اُس کی زندگی سے، یعنی اب کی زندگی سے۔ نئی زندگی سے بہت کام لینے ہیں'۔

یہ دانشور تھا۔

○○

محترم قارئین!

تو یہ سارا کچھ اُس چھوٹے سے بچے کے لئے ہوا ـــــــ اُس چھوٹے سے آٹھ سالہ بچے کے لئے، جس کی آنکھیں نیلی تھیں، چہرہ خوبصورت تھا اور جس کا تعلق اقلیت سے تھا۔ تو یہ سب کچھ اُس چھوٹے سے بچے کے لئے ہوا، جس کے لئے اکثریت کے بچے نے، بچاتے ہوئے اپنی جان دے دی اور جو تہذیب کی اس جنگ کے دوران جان، بچانے کے لئے اپنے گھر میں ہی لاپتہ ہو گیا تھا۔ اور یقیناً ایسے بچے کو بچانا ایک اہم فریضہ تھا۔ اور جیسا کہ دانشور نے سوچا، تہذیب کے عروج کے لئے، مذہب کو ہی واحد ہتھیار کے طور پر سوچا جا سکتا ہے۔ بچے کا دھرم پریورتن ہو جائے تو.....

اور یقیناً یہ ساری جنگ تہذیب کے لئے، تہذیب کے نام پر لڑی گئی تھی۔ اور اُن کے سوچنے کا پڑاؤ وہی گندہ نالہ یا تالاب تھا، جہاں اُنہیں وہ کینکڑ املا تھا ـــــــ یا بلوں سے نکلتی برساتی کالی چیونٹیوں کو انہوں نے پاؤں تلے روند دیا تھا۔

وہ دوبارہ جلے ہوئے مکانوں اور جلی ہوئی شاہراہوں سے گزرتے ہوئے اُس مکان تک پہنچ چکے تھے۔ آسمان پر کوؤں اور گدھوں کی اُڑان دور تک دیکھی جا سکتی تھی..... ابھی بھی آس پاس کئی مکانوں سے دھوئیں نکل رہے تھے۔

'بچے طاقتور ہوتے ہیں۔'

دانشور مسکرایا ـــــــ 'ہاں'۔

'اور اسی لئے بچے سب کچھ سہہ لیتے ہیں۔ عذاب، بارش اور جنگ!'

'ہاں۔'

'بچے مرتے نہیں ہیں'

'ہاں'

'بچے مر کر بھی نہیں مرتے ہیں، دانشور پھر مسکرایا۔ 'اُسے آواز لگاؤ۔ کھوجو'

'لیکن ہم پکاریں گے کیا؟

'ہاں یہ مسئلہ تو ہے۔'

'بچہ۔ہم اُسے بچہ کیوں نہیں کہہ سکتے'

'بچے تو سب ہوتے ہیں..... اکثریت .....' پہلا کہتے کہتے ٹھہر گیا۔

دانشور کا چہرہ بجھ گیا تھا۔'نہیں' اُسے بچہ کہہ کر آواز لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔

'پھر ــــــــ؟'

'پھر۔سوچتے ہیں۔'

'اُس کی آنکھیں نیلی تھیں'

'ہاں۔

'بال بھورے تھے۔'

'ہاں۔

'نیلی آنکھوں والا بچہ؟'

'یہ مناسب معلوم نہیں ہوتا۔'

'بھوری آنکھوں والا ــــــــ؟'

یہ بھی نہیں'

وہ شاہزادے جیسا دکھتا تھا؟ کیا شاہزادہ کہہ کر.....'

'نہیں۔' دانشور سنجیدہ تھا ــــــ اقلیت پر شہنشاہیت برسوں پہلے ختم کر دی گئی۔نہ تاج نہ تخت ــــــــ نہ بادشاہ ــــــــ نہ شہزادے.....'

'لیکن اب تو وہ ہمارے ہو رہے ہیں۔یعنی دھرم پریورتن.....'

'اس کے باوجود نہیں۔'

پھر ــــــــ؟'

'دانشور فیصلہ کر چکا تھا۔اقلیت۔یہ نام بہت ہے۔چلو،ہم اُسے اسی نام سے پکارتے ہیں۔'

'اُس نے کسی فوجی کی طرح 'کمانڈر' کا رول نبھاتے ہوئے کہا۔ 'ایسا کرو۔ تم اس طرف۔ تم اُس طرف۔ ایک میرے پیچھے پیچھے آئے .....اور.....'

باس، الگ الگ ہٹ کر ہم کمزور نہیں ہو جائیں گے ـــــ ٹیلر ماسٹر کی آنکھوں میں چمک تھی۔

'پوائنٹ'

'اس طرح تو بچہ ہم پر حملہ بول سکتا ہے۔ وہ آٹھ سال کا ہے۔ آٹھ سال کے بچے کا دماغ انتہائی شیطان کا اور سازش سے بھرا ہوتا ہے۔'

'پوائنٹ'

'سب ایک ساتھ رہتے ہیں۔ بچہ سب کو ایک ساتھ دیکھ کر ڈر جائے گا۔' یہ بھی ٹیلر ماسٹر تھا.....

'بچے کو ڈرانا نہیں ہے ـــــ بچانا ہے ـــــ' دانشور کا چہرہ غصے سے پیلا پڑ گیا۔ چلو دیر مت کرو۔ تلاش کرتے ہیں۔ اقلیت.....اق لیت۔ بیٹے.....؟

'اقلیت.....'

'میرے اقلیت.....'

'اقلیت ڈارلنگ.....'

وہ بچے کو تلاش کر رہے تھے۔ گھر کی کوئی شئے سلامت کہاں تھی۔ زمین سے قالین، دیوار سے لے کر کمرے اور کمرے کے مہنگے سامان ـــــ لاش کی ہڈیاں کتے، گدھ اور کوّے کھا چکے تھے۔ سامانوں کے جنازے بکھرے تھے.....ٹوٹے ہوئے کھنڈر میں ان کی ملی جلی آوازیں بازگشت کر رہی تھیں۔

'اق.....لیت.....'

'میرے بچے اقلیت.....

'یہاں تو کوئی نہیں ہے۔'

'اوپر۔اوپر دیکھتے ہیں۔'

'بالائی منزل کی سیڑھیاں ٹوٹی ہوئی ہیں۔'

دانشور کی چیخ نکل گئی ــــــ 'سنبھل کر آنا'۔

پہلا چیخا۔'سر بچاؤ۔

چھت کا ایک چھوٹا سا حصہ بھڑ بھڑا کر تیز آواز کے ساتھ گرا ــــــ

دانشور مطمئن تھا۔بچہ اوپر نہیں ہوسکتا۔'

دوسرے کا خیال تھا۔چھت بُری طرح بیٹھ چکی ہے۔یعنی ایک کو اٹھنے کے تصور سے بھی ــــــ بچہ کا چھپنا تو دور کی چیز ہے۔'

'کیا بچہ اسی گھر میں ہوگا۔؟'ٹیلر ماسٹر نا امید تھا ــــــ 'یعنی وہ بھاگ کر کہیں اور بھی تو پناہ لے سکتا ہے۔کہیں اور.....'

دانشور مطمئن تھا۔'بچہ کہیں اور پناہ لے ہی نہیں سکتے۔'

'کیوں؟۔'

'کیونکہ آندھی تیز تھی۔درخت سارے گر گئے تھے۔'

دانشور اپنے جواب سے مکمل طور پر مطمئن تھا۔ایسی صورت میں بچے کے سامنے اس کھنڈر میں چھپنے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں بچتا ہے۔'

'آگے اندھیرا ہے۔'

'ٹارچ۔ٹارچ نکالو۔'

اُن میں ایک نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ٹارچ نکالا۔ٹارچ نکالتے ہوئے پھپھسایا ــــــ ''سنتے ہیں، کچھ ملک ایسے بھی ہوتے ہیں جہاں رات ہی رات ہوتی ہے، دن نہیں ہوتے۔'

'ہاں۔'

'باس یہاں بھی کچھ ایسا ہی لگتا ہے۔'

دانشور کا لہجہ غصے سے بھرا تھا ـــــ ’ہم ایک نیک مقصد کے لئے

ـــــ سمجھ رہے ہو نا، بچے کو بچانے کے لئے۔،

’وہ زندہ ہوتا تو ہماری آواز ضرور سنتا۔‘

’وہ زندہ ہے اور یقیناً ہماری موجودگی سے گھبرایا ہوا ہے۔‘

’اقلیت......‘

’اقلیت بیٹے......‘

مائی ڈارلنگ اقلیت،

آواز لگاتے ہوئے، وہ ایک بار پھر آگے بڑھ رہے تھے۔ آگے، ٹوٹے ہوئے کھنڈر کے ملبے میں ـــــ دروازے، کھڑکیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے۔ کہ

اچانک......

’کوئی ہے۔‘ آواز گونجی

’ٹارچ۔‘

’کوئی ہے ـــــ‘ دانشور اندر ہی اندر خطرے کے سائرن‘ کے طور پر کانپ گیا تھا۔ پہلے نے ٹارچ جلایا ـــــ‘

دوسری آواز اٹھی ـــــ بچہ ہے۔‘

’کہتا تھا، نا......‘

ٹارچ کی روشنی ٹوٹے ہوئے لاہوری اینٹے، بھربھرائی مٹی سے ہوتی ہوئی بچے کے چہرے پر ٹھہر گئی ہے......

’باس......‘

ٹیلر ماسٹر نے چیخ کر کہا ـــــ ’باس بچہ ہی ہے۔‘

’اوہ گاڈ۔‘

دوسری آواز آئی ۔ ’بچے کی نبض دیکھو۔‘

’کوئی ضرورت نہیں باس۔‘

ٹیلر ماسٹر کی آواز گونجی ـــــــــ ’بچے کی پیٹھ میں گولیاں لگی ہیں‘۔

پہلے نے فیصلہ سناتے ہوئے کہا ـــــــــ بچہ مر چکا ہے۔

دوسرا ٹارچ کی روشنی میں بھیانک بدبو دیتے ہوئے بچہ کی لاش پر جھک گیا۔ ’بچہ کو مرے ہوئے کافی عرصہ گزر چکا ہے۔‘

○○

محترم قارئین!

کہانی ختم ہو چکی ہے۔ لیکن یقیناً کچھ باتوں کا قیاس لگایا جا سکتا ہے۔ جیسے لوٹتے وقت یہ بہت مایوس رہے ہوں گے۔ ممکن ہے بچے کو نہیں بچا پانے کی صورت میں۔ یا اس سے زیادہ، ممکن ہے، دھرم پریورتن کے خیال کو عملی جامہ نہ پہنا پانے کی صورت میں ـــــــــ یا ممکن ہے۔

کوئی اچھا سا قیاس آپ بھی کیوں نہیں لگا لیتے۔

لوٹتے ہوئے ان کے چہرے جذبات سے عاری تھے اور ایسے چہروں کا فائدہ ہے کہ آپ کچھ بھی قیاس لگا سکتے ہیں۔

لیکن قارئین، سب سے ضروری جو بات ہے، وہ یہی ہے۔ کہ یہ وہی تھے جو سابر متی آشرم سے دلّی کے آشرم چوک تک ـــــــــ

اور جو انسانی فضا میں، انسانی گھر میں۔ انسانی کمرے میں...... اور انسانی عمل کے دوران ـــــــــ کیا اب بھی آپ کو یقین نہیں ہے کہ یہ ’کئی‘ کبھی پیدا بھی ہوئے ہونگے ـــــــــ!

○○○

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

بیٹی

(اپنی بٹیا صحیفہ کے لئے، کہ یہ کہانی بھی اُسی کے تصور سے پیدا ہوئی تھی)

خوف

بیٹی باپ سے ڈرتی تھی، اس کے برخلاف ماں کو اپنا دوست سمجھتی تھی ـــــــــ

ماں بیٹی سے ڈرتی تھی، اس لئے کہ بیٹی دنوں دن تاڑ جتنی لمبی ہوتی جا رہی تھی......

باپ کو بیٹی سے بالکل ڈر نہیں لگتا تھا۔ اس لئے کہ باپ مصروف رہتا تھا ـــــــــ اس لئے کہ باپ کا زیادہ سے زیادہ وقت اپنے کاروباری قسم کے لوگوں کے پاس گزرتا تھا...... اور اس لئے کہ بہت تھوڑے سے وقت میں، جو باپ اکثر اپنی بیٹی کے لئے چرالیا کرتا تھا، اور باپ یہ لمحے اپنی بیٹی کے ساتھ ہی گزارنا پسند کرتا تھا ـــــــــ یہ اور بات تھی کہ یہ لمحے سال میں کبھی کبھی ہی باپ کو میسر آتے تھے......

○○

بیٹی کی مٹھیوں میں راتیں دبی ہوتی تھیں......

بیٹی کی مٹھیاں اکثر تنہائی میں کھل جایا کرتی تھیں...... اور نیلے آسمان سے اتری راتیں خاموشی سے اس میں سما جایا کرتیں......

پھر یہ راتیں چپکے چپکے اسے چھیڑنے پر آمادہ ہو جاتیں......

سنو......

وہ جیسے نشے میں ڈوبی آنکھیں لئے کسی اور دنیا میں گم ہو جاتی......

نیلے آسمان سے اتری راتوں میں شوخیاں سما جاتیں......

......اب تم ویسے نہیں ہنستی ہو جیسے

......جیسے؟

ہاں، اب تم ویسے، پہلے کی طرح نہیں رہتی، جیسے......

تم بدل رہی ہو......

سُبک مسکراہٹ، فلک سے عربی نغموں کی سواریاں لے کر آ جاتیں......

تم بہت بدل گئی ہو...... کیا نہیں۔ ذرا اپنے آس کی ہواؤں کو دیکھو...... باغوں کو—— دریا کو—— دریا میں ہولے ہولے تیرتی کشتیوں کو...... کشتیوں کے کھلے، ہوا میں لہراتے بادبان کو—— پھولوں کو، خوشبو کو...... اپنے اطراف اٹھی ہوئی عمارتوں کو—— اور اپنے اردگرد منڈلاتے بھونروں کو......

'بھونروں کو......' وہ چونک گئی۔

نیلے آسمان میں اترتی راتیں اچانک سہم گئی تھیں—— سب کچھ نیا، ہے نا۔

بالکل تمہاری عمر کے گھوڑے جیسا—— ایرانی گھوڑے جیسا—— شکر کرو کہ ابھی اس بارے میں تمہارے گھر والوں کو پتہ نہیں ہے۔

پھر کیا ہوگا......؟

وہاں ایک سویا، سویا سا ڈر جاگ جائے گا اور......

اور کیا؟

گھر کی آنکھوں نے ابھی تمہارے جسم کی سرگوشیاں نہیں سنی ہیں—— پھر...... پھر وہ اچانک بے چین ہو جائیں گی...... اور تم...... قید کر دی جاؤ گی۔

رات کا سناٹا...... گہرا سناٹا......

بیٹی نے ہولے سے جھولتے ہوئے، جھولے پر سے ایک پھول توڑ لیا۔ پھول بالوں کے گچھے میں لگالیا، اور لہراتی ہوئی کسی خیال میں گم ہوگئی۔

تیزی سے آتے ہوئے باپ نے یہ منظر دیکھ لیا تھا۔

باپ الٹے پاؤں واپس لوٹ گیا تھا_____

○○

باپ حیرانی سے آئینے کے سامنے کھڑا تھا۔

باپ کو اپنا 'زمانہ' یاد تھا..... باپ کو سب کچھ یاد تھا..... لیکن دنیا، اسٹیٹس سمبل، پیسوں کے لئے بھاگ دوڑ میں الجھے باپ کے پاس سے جذباتی آنکھیں، آہستہ آہستہ غائب ہونے لگی تھیں..... پرانے منظر باپ کی یادوں سے پھسل کر غائب ہونے لگے تھے_____ لیکن باپ اس لمحہ، اچانک، بیٹی، جوڑے اور پھول کو دیکھ کر چونک گیا تھا۔

برسوں پہلے اس منظر کی زد میں کوئی اور تھا۔

سرسراتی ہوا، ہلتے ہوئے پیڑ_____ جھولا_____ جھولے پر بیٹھی ہوئی ایک لڑکی_____ جھولتے جھولتے لڑکی کے ہاتھوں میں ایک پھول آجاتا ہے اور پھول.....

باپ نے اس منظر کو وہیں فریز کرلیا۔

باپ پھر اس لڑکی کو گھر لے آیا..... بیوی بنا کر۔

پھر باپ، زمانہ، اسٹیٹس سمبل اور پیسہ کمانے والی مشین کا غلام بن گیا۔ باپ حیران تھا.....

تو کیا بیٹی.....؟

باپ کو تعجب تھا۔ لیکن ابھی تو..... گیلی گیلی پھلیاؤں، کے منظر تو_____ آنکھوں

کو ابھی بھی سہانے ہیں ـــــ ننھے ننھے ہاتھ پاؤں۔ توتلی باتوں کی پچکاریاں ـــــ وہ گود میں اٹھالیتا..... بھالو بن جاتا..... اور کبھی گھوڑا..... بیٹی کو جنگل پسند تھا اور جنگل میں رہنے والے۔

لیکن..... باپ کے پاس جنگل میں گھومنے کا وقت ہی کہاں تھا۔

بھالو، گھوڑا..... بیٹی رات رات، سارا سارا دن باپ کا انتظار کرتی ـــــ باپ جب کبھی گھر لوٹتا، مصروفیت کے بوجھ سے کندھے جھکے ہوتے ـــــ پھر بھی وہ تازہ دم بنے رہنے کی کوشش میں مصروف رہتا۔

بھالو، گھوڑا، جنگل..... باپ اچانک اس جنگل میں لوٹا تھا..... اور حیرانیوں کی بارش لے کر وہ بیوی کے پاس آ کھڑا ہوا۔

'تمہیں پتہ ہے، ہماری بیٹی اب.....

ہاں پتہ ہے۔

پتہ ہے؟ باپ چونک گیا تھا۔

''ڈرو مت..... پچھلے چار برسوں سے..... چار برسوں سے اس کا جسم میری آنکھوں کی دوربین میں ہے..... غلط مت سمجھو..... میں نے ایک لمحے کے لئے بھی اسے کھلی ہوا میں سانس لینے کا موقع نہیں دیا ہے۔''

''مطلب؟''

بیوی ہنسی..... ''مطلب وہ آدھا ہنستی ہے ـــــ آدھا میں نے قبضہ کر رکھا ہے ـــــ وہ آدھا اڑتی ہے ـــــ آدھی اڑان میرے قبضے میں ہے ـــــ اڑان، ہنسی، مسکراہٹ، خواب..... بڑے ہونے اور نافرمانی کرنے کے شک میں ـــــ میں نے ایک آدھا جسم اس کے پاس رہنے دیا ہے ـــــ اور

آدھا.....''

بیوی ہنس رہی تھی۔

بیوی اپنا زمانہ بھول گئی تھی۔

بیوی نے پھر پلٹ کر اس کی طرف نہیں دیکھا۔ جیسے بیوی کو، اس کا جواب، اس کی دلیل، کسی کی بھی ضرورت نہ ہو.....

○○

بیٹی حیران تھی..... جیسے بہت سے پلاش کے پھول اس کی ننھی منی ہتھیلیوں میں سما کر رنگ بن گئے ہوں..... رنگ..... پھر اس نے آدھے رنگوں کو اپنی ہتھیلیوں سے کھرچ دیا.....

تو اس کا مطلب؟

باپ برسوں بعد اپنی بیٹی سے شیئر کر رہا تھا۔

ہاں۔

تو تم آدھا ہنستی ہو اور آدھا تمہاری ماں کی تحویل میں ہے۔

ہاں۔

اور تم آدھا اڑان بھرتی ہو۔

ہاں۔

پھر تم مکمل کہاں رہ گئیں..... آدھا آدھا..... بڑے ہونے سے اڑنے تک ـــــ بچپن سے جوانی اور جسم سے روح تک..... گھر سے کالج اور کالج سے گھر تک ـــــ آنکھوں سے مسکراہٹ اور مسکراہت سے خواب تک.....

ہاں۔

''راتیں..... پُراسرار راتیں..... تمہیں پتہ ہے ـــــ تم ایک حسین زندگی کا صرف آدھا لطف لے رہی ہو..... ایک بے حد حسین کائنات کے صرف آدھے حصے

کو تمہاری آنکھیں چھو رہی ہیں ـــــــ جب کہ.....''

باپ افسردہ تھا.....

''تم نے پریم کیا ہے.....؟''

واپس لوٹنے سے قبل باپ کا جملہ نپا تلا تھا..... پریم آدھا نہیں ہوتا۔ پریم مکمل ہوتا ہے.....اور بیشک تم عمر کے اس حصے میں ہو، جہاں تمہیں پریم کے احساس سے..... یعنی میرا مطلب تو تم سمجھ رہی ہو نا.....

بیٹی ایک لمبی چپ لگا گئی تھی.....

لیکن بیٹی کو باپ میں پہلی بار ایک دوست نظر آیا تھا۔

باپ کی باتیں اس رات بہت دیر تک بیٹی کے کانوں میں گونجتی رہیں۔ وہ حیرت زدہ کرنے والی باتیں تھیں..... کسی بھی باپ کے منہ سے پہلی بار اس طرح کی باتیں اس کے کانوں میں گونجی تھیں۔ وہ ان جملوں کا ذائقہ ابھی بھی محسوس کر سکتی تھی.....

'تم سن رہی ہو، نا اور تمہیں احساس ہونا چاہئے ـــــــ' باپ کا لہجہ کچھ کچھ برف جیسا سرد تھا۔ یعنی دنیا کہاں جا رہی ہے ـــــــ اور دنیا کہاں تک جا سکتی ہے۔ خوف اور اینتھر یکس سے الگ بھی ایک راستہ جاتا ہے..... پریم کا راستہ..... ہم ہر برس کے خاتمے کے بعد اپنے لئے ایک اینتھر یکس کا خوف تلاش کر لیتے ہیں ـــــــ ہے نا کتنی عجیب بات ـــــــ اس مہذب دنیا میں اونچی اونچی عمارتوں کے درمیان ہمیں ڈرنے کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے ـــــــ اور تم اپنے آپ کو دیکھو لڑکی..... تمہارا چہرہ کیسے ہو رہا ہے ـــــــ یعنی سچ پوچھو تو کتنی ڈری سہمی دکھائی دے رہی ہو تم ـــــــ؟

'ہاں' میں ڈر گئی ہوں۔

باپ چپ تھے..... باپ نے صرف اتنا پوچھا۔

اپنے آپ سے.....؟

ہاں.....

اپنی بڑھتی عمر سے؟

ہاں.....

باپ کے ہاتھ کھلونوں کی طرح اپنی انگلیوں سے کھیلتے رہے.....

''کیوں ڈر جاتے ہیں ہم۔ اینتھر یکس وہ نہیں ہے جو ہر بار ورلڈ وار کے خطرے سے پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ کچھ اور بھی ہے..... باپ کے ہاتھ کھیلتے کھیلتے ٹھہر گئے تھے۔ لیکن نہیں..... بیٹی! سن رہی ہو نا تم۔ تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے..... لیکن کیا کرو گی..... سب ڈر رہے ہیں..... جیسے تمہارا چہرہ دیکھ کر لگتا ہے، تم اپنی ماں سے بھی ڈر رہی ہو گی۔ ماں، جو بیوی بننے تک ایک خوبصورت دنیا میں جیتی ہے اور ماں بنتے ہی ایک Cruel اور ایک کروسیڈر ـــــ اس کے وجود میں پناہ لینے لگتا ہے.....''

باپ نے نظر نہیں ملائی..... صرف اتنا کہا.....

'تمہیں اپنی ماں سے ڈرنا نہیں چاہئے۔ اپنی ماں کو سمجھانا چاہئے۔'

ماں

بیٹی اچانک بڑی ہونے لگی تھی ـــــ اور اس بڑی ہونے کے خطرے کو ماں نے بھانپ لیا تھا ـــــ ماں کمانڈوز کی طرح بیٹی کے پیچھے پڑ گئی تھی۔ کہاں جا رہی ہو تم ـــــ نہیں۔ فون ہمیشہ نہیں سننا ہے..... اتنی دیر تک کس سے باتیں کر رہی تھی..... ماں کبھی کبھی اسے شکاری کی طرح گھیر کر بیٹھ جاتی ـــــ ماں ایک فلاسفر کی طرح نان اسٹاپ شروع ہو جاتی..... اور اپنی ہر گفتگو میں ماں اتنی اوباؤ، اتنی بوجھل باتیں کرتی نظر آتی کہ وہ اندر ہی اندر ایک عجیب سے دکھ کا شکار ہو جاتی۔

اسے، بس یہ الجھن گھیر لیتی کہ ماں اپنا زمانہ بھول گئی ہے یا ــــــ ماں ..... کبھی بیٹی تھی ہی نہیں۔

'دیکھو تو ــــــ بدن پر کتنا گوشت آ گیا ہے۔'

'زیادہ سونا لڑکیوں کے لئے خطرناک ہوتا ہے ــــــ چربی چڑھ جاتی ہے۔'

'ڈائٹنگ ..... ڈائٹ کنٹرول ..... بوائل ..... سب کچھ بوائل کھانا ہے تمہیں۔'

ماں کی ہر بات پر وہ اندر ہی اندر بوائلڈ ہوتی چلی گئی ..... کبھی ماں ایک چھتنار درخت کی طرح لگتی ــــــ جس کے سایہ میں اس کی زندگی محفوظ ہے۔

لیکن کتنی محفوظ ہے؟

ماں کیا چاہتی ہے، یہ آہستہ آہستہ اس پر منکشف ہو رہا تھا ..... یعنی ماں اسے دنیا کی نظروں سے بچائے رکھنا چاہتی تھی۔ ایک بے حد خاص موقع کے لئے ..... بے حد خاص ..... جیسا کہ اس کی ماں نے سوچ رکھا تھا ..... ایک بڑی تپسیا اور ..... ایک دن اچانک اسی، ان چھوئے پودے کو نمائش گاہ میں رکھ دینا۔

یعنی ماں کے لئے، اس کے بڑے ہونے کا عمل، سب کچھ سوچی سمجھی اسکیم کے مطابق ہو رہا تھا ..... ماں، اس میں اپنے 'مستقبل' کو تلاش کر سکتی تھی۔ یعنی ایک ایسے برائٹ فیوچر کو، جہاں اس کے ساتھ ماں کی تقدیر بھی کھل سکتی تھی۔

'آہ، تم نہیں جانتی!'

یا پھر ..... آہ، تمہارے لئے میں نے کیا کیا سوچ رکھا ہے، نادان لڑکی ..... ماں کے ان جملوں کا مطلب تھا ..... دیکھتی رہو۔ تمہیں صرف اشارے سمجھنا ہے اور چلنا ہے۔ بس اس سے زیادہ نہیں۔

ماں نے بہت زیادہ اس کے بارے میں سوچ رکھا تھا۔ ماں اس سے کہیں زیادہ اس کے بارے میں سوچ سکتی تھی ــــــ لیکن بیٹی ــــــ جیسے ہر بار معصوم چڑیا

کی طرح اڑتے اڑتے وہ کسی خوفناک گدھ کو دیکھ لیتی.....

ڈائٹ کنٹرول..... لیکن نتیجہ کے طور پر کیا برآمد ہوا تھا..... آنکھوں میں پڑے گہرے حلقوں میں خواب کہیں گم ہو گئے تھے..... کسی مخملی فرش پر کیٹ واک کرنے والے اس کے پاؤں تھرتھرانے لگے تھے..... ماں اسے لے کر انسٹی ٹیوٹ آف منٹل ہیلتھ اینڈ سروسز گئی تھی۔

ڈاکٹر موانا برا سا منہ بنا کر بولی تھی۔ 'تم لڑکیاں..... کھانے کو دشمن کیوں بنا لیتی ہو.....'

اس نے ماں کو دیکھا۔ ماں نے بیٹی کا ہاتھ دبا دیا۔

'اینوریکسیا۔ وزن میں کمی..... ڈاکٹر مونا نے برا سا منہ بنایا_____ کیلشیم اور فاسفورس کی کمی سے کیا ہوتا ہے_____ جانتی ہو..... ہارمون، ڈس بیلنس ہو جاتے ہیں_____ اور امینوریا_____ سمجھتی ہو نا_____ پھر کچھ بھی ہو سکتا ہے_____ عورتیں بانجھ ہو سکتی ہیں۔

○○

'بانجھ ہارمون کا ڈس بیلنس ہونا..... بیٹی دکھ گئی ہے۔ زندگی سے کیلشیم اور فاسفورس تو ماں نے لے لئے ہیں..... وہ سچ مچ ڈس بیلنس ہو گئی ہے_____ نہیں..... اس نے توازن کھو دیا ہے..... وہ لڑکھڑا رہی ہے۔ وہ کبھی بھی گر سکتی ہے..... وہ جیسے ایک ٹھونٹھ درخت ہے۔ بانجھ..... امینوریا کی شکار.....

''ایک دن جب تم خود کو دیکھو گی تو..... ڈاکٹر تو بولتے ہی رہتے ہیں۔''

اس نے دیکھا۔ ماں کی آنکھوں کی سوکھی پڑی جھیل کو۔ لیکن یہ کیا..... اس جھیل میں کوئی ہے..... کوئی ہے، جو کیٹ واک کر رہا ہے.....

کون ہے؟

وہ اس چہرے کو پہچان سکتی ہے۔

ارے، یہ چہرہ تو اس کے خود کا چہرہ ہے ـــــــ لیکن یہ چہرہ اتنا مرجھایا ہوا کیوں ہے؟

پہلی بار بیٹی نے اپنا جائزہ لیا تھا۔ اپنے جسم میں وہ کتنی ہے..... اپنی روح میں ـــــــ؟ اپنے وجود میں ـــــــ؟ اور اپنے آپ میں ـــــــ؟

اس نے ماں اور باپ دونوں کو اپنے آپ میں رکھ کر دیکھا ـــــــ پھر مطمئن ہوگئی ـــــــ باپ کو وقت کہاں تھا اور ماں..... روح سے جسم اور جسم سے وجود تک ماں نے کسی بھی حصے کو ـــــــ اس کی اپنی آزادی کے نام نہیں کیا تھا..... آدھا بھی نہیں۔ وہ مکمل ماں کے قبضہ میں تھی۔

اس لئے پہلی بار ـــــــ باپ کی باتوں میں اسے ایک دوست نظر آیا تھا۔ دوست، جس کے سہارے وہ اپنی جنگ لڑ سکتی تھی۔

باپ

لیکن شاید بیٹی ابھی بھی مطمئن نہیں تھی۔ یا پھر بانجھ ہونے کا ڈر اس کے اندر کچھ زیادہ ہی بیٹھ گیا تھا..... بانجھ۔ عورت کے لئے سب سے بڑی گالی..... ایک ایسی گالی، کم و بیش بیٹی جس کا سامنا کرنے کو تیار نہیں تھی..... وزن کم کرنے کے لئے وہ امینوریا کی پیشنٹ بننے سے خود کو روکنا چاہتی تھی۔ دراصل بیٹی، باپ کو آزمانا چاہتی تھی۔ شاید اسی لئے کسی ایک مضبوط لمحہ، وہ چپ چپ باپ کی آغوش میں سر چھپا کر بیٹھ گئی۔ باپ آہستہ آہستہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے رہے۔

''میں کچھ بھی کرسکتی ہوں؟'' ذرا دیر بعد بیٹی کے لب ہلے۔

.....'ہاں۔'

.....'کچھ بھی؟'

.....'تمہیں شک کیوں ہے؟'

'شک نہیں..... ماں کہتی ہے، لڑکی پیدا ہوتے ہی اپنا ایک پنجرہ لے آتی ہے۔'

باپ ہنسا..... 'لیکن تم سے پہلے تمہاری ماں اس پنجرے کو توڑ چکی تھی۔ اس نے لو میرج کی تھی_____'

ماں کہتی ہے 'اس کے باوجود ہم پنجرے میں رہتے ہیں۔'

باپ نے مزاحیہ انداز اپنایا_____ 'پنجرے میں پنچھی بھی نہیں رہتے!'

بیٹی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ 'تو میں کچھ بھی کرسکتی ہوں۔ اڑ سکتی ہوں۔ باہر جاسکتی ہوں۔ ڈسکو۔ تھیٹر، اور.....

باپ نے اسے غور سے دیکھا..... بیٹی کے کندھے تھپتھپائے_____ پھر بولا_____ 'سنو بیٹی۔ غور سے سنو..... تم پیدا ہوئیں، ہم نے سکھ تلاش کرلیا..... ڈھیر سارا سکھ_____ جو تمہارے رونے سے ہنسنے تک_____ کلکاری سے سوچنے سمجھنے تک_____ بولنے سے شرارت تک_____ کھڑے ہونے، گرنے سے انگلیاں تھامنے اور چلنے تک..... یعنی تم نے جو دیا، یا جو تم ہر لمحہ دیتی رہی ہو، کسی خزانہ سے بھی زیادہ تھا..... ہم تول مول نہیں کرسکتے تھے_____ باپ کو تول مول کرنا بھی نہیں چاہئے_____ کہ اس زندگی میں بچہ اپنے وجود کے احساس تک جو سکھ دیتا ہے_____ وہ امید کے خزانے سے کہیں زیادہ ہوتا ہے، ہے نا؟

باپ کو شاید اپنے باپ کی کہانی یاد آگئی تھی۔ یکلخت وہ ٹھہر گیا تھا۔ بیٹی کے ہونٹوں پر معصوم مسکراہٹ تھی۔

'اس لئے بیٹی'..... باپ نے اپنی گفتگو جاری رکھی۔'اس لئے جب تم اپنی جوانی کی زندگی شروع کرنے جارہی ہو۔ سمجھ رہی ہونا۔ اپنی اب کی زندگی..... تو اس زندگی پر صرف اور صرف تمہارا حق ہے۔ اپنے حصے کا سکھ ہم لے چکے ہیں اور اس کے بعد کے سکھ پر.....'

'تو پنجرہ.....؟'

باپ لڑکی کے بڑا ہونے کے احساس سے دکھ گیا تھا۔

'پنجرہ کوئی بھی اپنے ساتھ نہیں لایا تھا_____ اور سنو بیٹی۔ اب تم بڑی ہوگئی ہو۔ اپنے حصے کے خواب، خوشیاں_____ عمر_____ رونا، ہنسنا_____ سب کچھ اپنی ممی سے واپس مانگ سکتی ہو_____ اور بے شک تمہاری ممی کو تمہیں یہ سب واپس کر دینا چاہئے۔'

اس کے بعد باپ ٹھہرے نہیں۔ باپ کو آنکھوں میں امڈ آئے قطرے دکھانا گوارہ نہیں تھا۔ باپ واپس لوٹ گئے تھے۔

حسین شامیں

پھر بیٹی نے اڑنا شروع کیا۔

بیٹی کو اب ماں کے پنجرے پر یقین نہیں تھا۔

بیٹی کو اب کسی بھی ایسے پنجرے پر یقین نہیں تھا_____

بیٹی کو صرف اور صرف اڑنے پر یقین تھا_____

پہلی بار جب وہ رات کو دیر تک ڈسکو تھے کلب سے گھر لوٹی تو ماں اس کے کمرے کے دروازے پر آ کر کھڑی ہوگئی_____ ماں کے ہاتھوں میں ایک ٹوٹا ہوا پنجرہ تھا۔

'آہ! تمہارے باپ جیت گئے۔'

'اور اسی لئے تم نے پنجرہ توڑ دیا۔'

'ہاں..... اس پنجرے میں ایک Sea-gull تھا۔ اس، سی گل کی کہانی سنو گی۔'

'مجھے کہانیاں اچھی نہیں لگتیں۔'

ماں مطمئن تھی..... 'کوئی بات نہیں۔ تم نے اپنے لئے راتیں چُنیں ـــــ اور رات سے انٹرنیٹ اور ڈسکو تھیے بنالیا ـــــ ہے نا۔ پھر بھی تمہیں یہ کہانی سننی ہوگی۔

اس نے نائیٹی پہن لی۔

ماں کی کہانی جاری تھی۔ بے چارہ ننھا سا سی گل ـــــ شام میں جب دوسرے پرندوں کے پر، اڑان سے خالی ہوجاتے تو وہ اپنی اڑان شروع کرتا ـــــ پا گل کہیں کا ـــــ تھوڑی تھوڑی اڑان اور ایک دن.....

'تم یہ کہانی پہلے بھی سنا چکی ہو ماں۔'

ماں نے پہلے دھیان نہیں دیا..... ایک دن جونا تھن، یہی اس سی گل کا نام تھا ـــــ وہ اُڑا اور اپنے ننھے پروں سے آسمان ناپ لیا..... اس کی خوشی کی انتہا نہ تھی ـــــ اتنی اڑان تو اس کے پروجوں میں سے بھی کسی نے آج تک نہیں بھری تھی..... اسے یقین تھا۔ وہ واپس لوٹے گا اور اس کی تاجپوشی ہوگی۔ سر آنکھوں پر بیٹھایا جائے گا۔ انعام سے نوازا جائے گا۔

'پورفیلو، بیٹی آہستہ سے بولی۔

ماں کی آنکھیں بند تھیں..... ''لیکن اس غریب کو کیا معلوم تھا، دھرتی پر واپس لوٹتے ہی، ضرورت سے زیادہ اڑنے کے جرم میں اسے.....''

ماں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

بیٹی نے سر پر چادر کھینچنے سے پہلے کہا ــــــ 'جواڑتے ہیں، وہ کسی بھی چیز کی پرواہ نہیں کرتے۔'

○○

انٹرنیٹ پر Chatting سے برآمد لڑکے نے ڈسکو تھے میں، اچانک اس کے سامنے آ کر حیرت زدہ کر دیا تھا۔

پھر بیٹی کی شاموں میں ٹوئٹرس کی لاطینی حسین شامیں لکھ دی گئیں..... پہلی بار وہ اداس تھی۔

لڑکا زور سے چیخا تھا..... 'Cry'

وہ پھر ذرا سا ہنسا ــــــ 'چیخو، چلاؤ، ناچو۔ بھول جاؤ کہ عمر کے گھوڑے کی رفتار کیا ہے۔ آگے کیا ہے اور پیچھے کیا ہے۔'

'بھول گئی۔'

وہ دیر تک نائٹ اسپاٹ پر تھرکتے رہے۔ لانج میں کچھ دیر 'ڈام موریس' کی پوئٹری کا لطف لیا ــــــ پھر کچھ دیر تک ٹوئٹرس کی آرٹ گیلری میں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ٹہلتے رہے۔ بیٹی خاموشی سے کمرے کی پیلی چھتوں، نیلی دیواروں اور پینٹنگس کی آڑی ترچھی لکھیروں کو گھورتی رہی۔ واپس آ کر نائٹ اسپاٹ پر دونوں نے ایک ایک پیگ اور لیا۔ ریستوراں کی ڈم لائٹ میں 'چلڈ' یعنی ہر طرح کے پروگرام چل رہے تھے..... بیٹی نے اپنے جسم کو پورا پورا لڑکے کے بدن پر ڈال رکھا تھا۔ اطالوی کھانے سے فارغ ہو کر دونوں نے ایک دوسرے کو ریستوراں کی ڈم روشنی میں، چلنے والے چلڈ پروگرام کے حوالے کر دیا۔

○○

رات گہری ہو گئی تھی۔ بیٹی ابھی تک گھر نہیں لوٹی تھی۔ ماں نے کمرے میں ٹہلتے ہوئے کہا۔

.....'دنیا بدل رہی ہے۔'

'دنیا ہمیشہ ایک جیسی رہتی ہے۔'

.....'ہمارے زمانے کی دنیا اور تھی؟'

اس زمانے کی دنیا بھی وہی ہے۔'

.....'کیا ہم اس طرح رات گئے.....؟'

پہلے ہمارے شہر نے اس طرح رات پر قبضہ نہیں کیا تھا۔'

ماں گھبراہٹ میں ٹہل رہی تھی۔'

باپ مطمئن تھا۔ وہ اپنی فکر میں ڈوبا تھا۔ یعنی اس عمر میں..... اس عمر میں جب کہ اس کی بیوی کو، کوئی بھی ٹینشن نہیں لینا چاہئے.....' وہ آہستہ سے مسکرایا۔

'بیٹی کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔'

'کیوں؟'

کیوں کہ اب اس کی آزادی کا دور شروع ہو گیا۔'

'آزادی؟'

'ہاں، ایک عمر آتی ہے، جب ہمیں ایک دوسرے کو ازسرنو سمجھنا ہوتا ہے۔ ازسرنو ـــــــ سمجھ رہی ہو نا..... یہ وہ وقت ہوتا ہے، جب بچے اپنی عمر کے رتھ پر سوار ہو جاتے ہیں..... بیٹھو.....'

باپ نے اسے اپنے بانہوں کے حصار میں لیا..... اب ہماری اپنی ایک نئی زندگی شروع ہو رہی ہے۔ بیٹی کی اپنی..... اس عمر کو سمجھنا بڑا کام ہے۔ نہیں سمجھو گی تو بوڑھی ہو جاؤ گی۔'

ماں ڈر گئی تھی.....

باپ ہنسے..... ''بچوں کی آزادی میں اپنا حصہ نہیں ہوتا ـــــــ ان کی عمر کا حصہ

ہوتا ہے..... بیٹی اپنی آزادی سے بندھی ہے۔وہ سنبھلتی ہے یا گرتی ہے، یہ اس کا کام ہے۔ہم نہیں سنبھلے تو؟ یا بچے اور اپنے بیچ ایک دیوار نہیں اٹھائی تو..... ہم اچانک بوڑھے ہو جائیں گے۔''

لیکن..... وہ بیٹی ہے.....

'ہمارا کام ختم..... باپ کا لہجہ سخت تھا..... 'جتنی خوشیاں، جتنے سکھ اس سے حاصل کرنے تھے، کر چکے۔'

'اور اب اسے گرنے کے لئے.....'

باپ مطمئن تھا..... 'یہ اس کی سمجھ داری پر منحصر ہے' باپ نے پھر موضوع بدل دیا تھا..... 'کل سے میں نے دفتر کا کام کم کر دیا ہے۔جلدی گھر آجایا کروں گا۔صبح کی چائے ختم۔ناشتے میں.....'

ماں اب کچھ بھی نہیں سن رہی تھی۔

کھلے دروازے سے بیٹی اندر آ گئی تھی۔

بیٹی کی زلفیں بکھری ہوئی تھیں۔

بیٹی کی آنکھیں.....

بیٹی کے پاؤں.....

بیٹی کا جسم.....

باپ نے ماں کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا..... ''سو جاؤ۔اس نے اپنی آزادی خرید لی ہے۔''

ماں نے سہمے ہوئے میمنے کی طرح خود کو باپ کے حوالہ کر دیا۔

خاتمہ

قارئین!

کہانی ختم ہو چکی ہے۔یا آپ کہہ سکتے ہیں۔کہانی کو یہیں پر ختم ہو جانا چاہئے تھا۔

ایسی کہانیوں کا کوئی خوشگوار انجام نہیں ہوتا ہے۔ ایسی کہانیاں ہر تبدیلی اور تاریخ کے جبر کے ساتھ پیدا ہوتی رہتی ہیں..... زندگی نے اپنا دامن وسیع کیا تو لڑکیوں کے لئے سوچ اور فکر کے نئے دروازے بھی کھل گئے..... یعنی تاریخ کے اس مقام پر جہاں لڑکیاں آزادانہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہیں، ایسی کہانیوں کا انجام یہی ہونا چاہئے کہ.....

- لڑکی نے اپنی ایک آزاد زندگی کا انتخاب کر لیا۔
- لڑکی پھسلتی چلی گئی اور بالآخر اس کی زندگی کا انت ہو گیا..... یا
- لڑکا اسے چھوڑ گیا اور لڑکی نے آتم ہتیا کر لی۔

قارئین!

ایسا کچھ بھی اس کہانی کے ساتھ نہیں ہے۔ اس لئے ـــــ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ـــــ تاریخ کے اس موڑ پر..... اس بے حد اہم موڑ پر..... بیٹی اچانک چونکتی ہے۔ جیسے کسی ڈراؤنے خواب سے جاگتی ہے اور کئی دن گھر سے غائب رہنے، بدن کے جبر کو سمجھنے کے بعد ـــــ ایک اندھیری صبح..... جس وقت سڑک پر اکا دکا سواریاں بھی نہیں چل رہی تھیں ـــــ وہ اپنے گھر کے دروازے پر آ پہنچتی ہے۔ اور..... بیل پر انگلی رکھتی ہے۔

تو قارئین یہ اس کہانی کا انت ہے..... اور اس انت کے لئے میں اپنے آپ کو کتنا مجبور محسوس کر رہا ہوں، یہ میں جانتا ہوں۔

○○

بیٹی کی آنکھیں نیم غنودگی میں ڈوبی تھیں۔ قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ باہر کہرا چھایا ہوا تھا۔ اس کا بدن ابھی بھی اطالوی جن کے دھویں سے بھرا تھا۔ سردی بڑھ گئی تھی۔ بیل بجانے والے ہاتھ سردی سے ٹھٹھر گئے تھے۔ اسے غصہ آ رہا تھا۔ سب کہاں مر گئے۔ بیل کی آواز سن کر کھولنے کے لئے کوئی آتا کیوں نہیں.....

اس نے قدموں کی آہٹ سنی......

'آزادی......' اسے باپ کے لفظ اب بھی یاد تھے۔ اپنے حصے کا سکھ ہم لے چکے ہیں اور اس کے بعد کے سکھ پر......'

وہ باپ سے لڑائی کرنے آئی تھی...... نائٹ اسٹاپ کی رنگینیاں اچانک تھم گئی تھیں۔ ڈسکو تھیے کے Cry, Cry نغموں نے اسے لہولہان کر دیا تھا۔ Chatting سے برآمد لڑکے نے اس کے بدن پر ہزاروں خونی لکیریں کھینچ دیں——اور ایک نیپالی لڑکی کے ساتھ کسی دوسرے ٹوئٹرس کے چلڈ پروگرام میں کھو گیا تھا......

بیٹی نیند سے جاگی تو ماں کا پنجرہ ٹوٹا ہوا اس کے بازو میں پڑا تھا...... وہ چیخنا چاہتی تھی...... وہ لڑنا چاہتی تھی۔ پیسے ختم ہو گئے تھے......

وہ کئی دنوں سے گھر سے غائب تھی۔

اسے امید تھی۔ گھر پہنچتے ہی، جذباتی پاگل پن کے مظاہرے شروع ہو جائیں گے۔ شاید باپ نے پولیس میں ایف آئی آر بھی درج کی ہو——ماں کی آنکھیں روتے روتے سوج گئی ہوں اور......

ایک بے حد سرد صبح، کہرے میں ڈوبی ہوئی صبح...... وہ گھر پہنچے گی اور......

دکیلشیم فاسفورس...... ماں بولے گی...... وہ اسے ایک بے حد خاص موقع کے لئے تیار کر رہی تھی......

باپ کہیں گے...... تم کہاں چلی گئی تھیں بیٹی۔

اور ماں...... وہ اس جذباتی لمحے کی منتظر ہو گی، جب وہ اس کے بازوؤں میں گم ہو جائے گی......

○○

کوئی آرہا ہے..... قدموں کی آہٹ..... بیٹی کا جسم سردی سے تھرتھرا رہا ہے۔ دروازہ کھولنے کی آواز..... باپ نے لائٹ آن کر دیا ہے۔ دروازہ کھولنے والی ماں ہے۔ لیکن.....

وہ اچانک ٹھٹھک گئی ہے_____

کیا یہ ماں ہے۔ سچ مچ ماں ہے۔ ماں ہے تو ماں جیسی کیوں نہیں لگ رہی۔ ماں اپنی عمر سے کتنی چھوٹی ہوگئی ہے۔ چھوئی موئی سی۔ اس کے چہرے پر، بیٹی کو لے کر مستقبل کے اندیشے یا فکر کی جھریاں نہیں ہیں ____ یہ کوئی اور ہی ماں ہے_____ تروتازہ_____ ابھی ابھی جوان ہوئی اور لباس تو دیکھو..... ریشمی ساڑی۔ چہرے پر اتنا نکھار.....

پیچھے باپ کھڑے تھے..... ہمیشہ کی طرح اسمارٹ..... اس وقت کچھ زیادہ ہی جوان.....

ماں کی آنکھوں میں حیرانی امڈتی ہے.....

'کون؟'

باپ کی آواز میں نشہ سا ہے.....

'کون؟'

'' 4 راسکیم پارلے_____ ماؤنٹ روڈ سے ذرا آگے_____ تھرڈ لین۔ مسٹر آئی جے کے..... ریسیڈینس نمبر.....' کہتے کہتے وہ ٹھہر گئی ہے۔ ''ایک زمانہ میں یہاں ان کی بیٹی رہتی تھی۔''

ماں نے پیار سے دروازہ بند کرتے ہوئے جواب دیا_____

'آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے..... اب وہ یہاں نہیں رہتیں.....'

بیٹی نے انجانے راستوں پر ٹھٹھرتی ہوئی کہرے کی اس صبح، اپنے قدموں کو ڈالتے ہوئے ماں کا جملہ پورا کیا.....

’کیوں کہ اس نے اپنی آزادی خرید لی ہے۔ اب وہ کہیں اور رہتی ہے۔‘

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

نور علی شاہ

کو

اداس ہونے کیلئے کچھ چاہئے

جو سچ تھا، وہ تواریخ کے پنوں میں چھپ گیا نہیں، چھپا دیا گیا۔ تواریخ کے گدلے نالے میں..... اور نالے سے اٹھتی ہوئی بدبو سونگھنے والے بھلا کیسے سوچ پائیں گے کہ کبھی سلطنت اور شہنشاہیت کے گذرے قصوں میں ان کی بھی ساجھے داری رہی ہوگی۔ نہیں نور علی شاہ۔ اس جھانسے سے کام نہیں چلے گا۔ جو کبھی تھا، وہ گزر چکا ہے، اور جو ہے وہ اس گندے نالے سے بھی بدتر ہے، جس کے اردگرد جانے سے بھی لوگ کتراتے ہیں، دور بھاگتے ہیں۔

چار کھمبے والی گلی۔ گلی کے اندر ایک چھوٹا سا مکان۔ کبھی اپنا بھی مکان وہتا۔ یہ آرزو دل کی دل میں رہ گئی۔ زندگی کٹ گئی تو اسی کرائے کے اصطبل میں۔ باہر دروازے پر ٹاٹ کا جھولتا ہوا پردہ۔ بہت تھک جاتے تو آلتی پالتی مار کر دروازے پر ہی بیٹھ جاتے۔ دروازے کے سامنے زیادہ تر کنجڑے، قصابوں کے گھر تھے۔ جن کے آوارہ بچے دن بھر ادھم مچاتے ہوئے گلی کا ستیاناش کءرہتے۔ بچوں کے چیخنے، ہنگامے کرنے کی آواز انہیں زیادہ پریشان کرتی تو وہ گلیوں سے بارہا سنی گالیوں کی تھال لئے غصّے میں بچوں کو مارنے دوڑ پڑتے..... مادر..... حرامیوں..... ماں باپ نے سکھایا نہیں کہ گلیوں میں کیسے کھیلتے ہیں۔ تمیز وتہذیب سے دور کا بھی واسطہ نہیں اور واسطہ رہے بھی کیسے یہ سب چیزیں تو خاندانی ہوتی ہیں۔ خون میں تہذیب دوڑ رہی ہوتی تو جانتے کہ اچھے گھرانوں کے بچے زندگی کس طرح گزارتے ہیں۔'

بہت زیادہ غصے میں آجاتے تو فراٹے دار گالیاں بکتے ہوئے ہاتھ میں اینٹ یا پتھر

اٹھا لیتے اور گلی کے کسی مقام پر کھڑے ہو کر بچوں کے ماں باپ کی ساتھ پشتوں کی فضیحت کر بیٹھتے۔ اس بیچ بچوں میں سے کسی کی جان پہچان والا آجاتا تو سمجھئے مہابھارت شروع ہوگئی۔ اگر کوئی نہیں آتا تو بچے خود ہی ہلے رے..... رے..... کرتے ہوئے نور علی شاہ کو دوڑا دیت۔ بچوں میں سے کوئی دبی آواز میں منہ بنا کر بولتا۔ بیٹا..... اور نور علی شاہ سرپٹ بھاگ رہے بچوں کو مغلذات گالیاں بکتے ہوئے ''رگید'' دیتے۔ کمبخت، کمینے..... آگئے نا اپنی اوقات پر..... نور علی شاہ کو بیٹا کہنے کی جرات کرتے ہو..... جس کا خاندان نواب امجد علی شاہ کے گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ کم بختو، میرا مذاق اڑاتے ہو، ہے ہے۔ افسوس اب ہمارا زمانہ نہیں ہے۔ ورنہ مصاحبوں سے کہہ کر خانہ بدوشوں کی طرح یہاں سے نہ اٹھوا دیا ہوتا تو پھر میرا نام بھی بدل دیت..... نا اہلو..... بدبختو.....'۔

ایک بار جو گالیوں کی برسات شروع ہوئی تو پھر کہاں تھمنے والی تھی۔ اس بیچ اسلم کو اس کی خبر لگ جاتی تو وہ جبراً انہیں کھینچتا ہوا اندر لے آتا۔ نور علی شاہ جھٹکے سے ہاتھ چھڑا کر پھر دروازے پر آجاتے اور باقی بچی گالیوں کی تھال پروسنے میں لگ جاتے۔ اسلم یعنی اسلم علی شاہ.....

تب بڑی مشکل سے سر پر آنچل ڈالے، بڑی بی دروازے پر آتیں، نمودار ہوتیں۔ بے پردگی کا مظاہرہ ہی ان کے احتجاج کی آخری کڑی ثابت ہوتا۔ لو بہت ہوگیا۔ اب اندر بھی آجاؤ۔ ذرا پرانے وقتوں کی لاج رکھیو۔ امجد علی شاہ کے خاندان پر رحم کریو..... ذرا سوچیو۔ ان کی روحیں قبروں میں اس منظر کو دیکھ کر کیسے تڑپتی ہوں گیں۔

بڑی بی کو دیکھتے ہی نور علی شاہ کے بدن میں اضطرابی کیفیت چھا جاتی۔ ارے تم کیوں آگئیں۔ چلو اندر جائیو..... گرد و غبار میں ڈوبی ہوئی تیز آندھی جیسے ایک جھٹکے میں تھم جاتی۔ بدن میں تہذیب اور اخلاق کے گرگٹ تھرکنا اور کانپنا شروع

کر دیتے۔ وہ بغیر رکے جھٹ سے اندر چلے آتے اور گالیوں سے کوسنے کی طرف دن کا دوسرا حصہ بھی ڈھلنے لگتا۔ وہ بڑبڑاتے رہے..... لو دیکھو..... دیکھو بھائیو..... امجد علی شاہ کے خاندان پر کیا بدنصیب وقت آن پڑا ہے..... اب وہ پالکیاں کہاں کہاں کے کہار۔ زنانیاں نامحرموں کو شکل دکھانے باہر نکلنے لگی ہیں..... ہے ہے..... زمین پھٹ جائے پاک پروردگار..... اب کون سا دن دیکھنے کو یہ آنکھیں باقی ہیں۔

دن بھر کے اکتائے قصوں میں یہ سارے منظر روز کا حصہ تھے۔ لیکن ابھی ایک اور منظر بچ رہا ہوتا۔ منحنی سا اسلم لاکھ ضبط کے بعد بے قراری کے عالم میں ابا کے سامنے، ہوا کے زور سے ہلتی کمزور دیوار کی طرح تننے کی کوشش کرتا..... ہڈیوں کے ڈھانچے میں جیسے کرنٹ بہنا شروع ہو جاتا۔ اٹھنگا سا پائجامہ اور کرتا پہنے اسلم اپنی پتلی پتلی بیت جیسی ٹانگوں پر کھڑا ہو جاتا۔

''ابا بہت مذاق بن چکا ہمارا۔ ایسا کیوں کرتے ہیں آپ؟''

وہ ایسے دیکھتا جیسے ایتھنز کے خداؤں کو نہ پوجے جانے کے جرم میں سزائے موت کے طور پر زہر کا پیالہ پینے کی تجویز رکھنے والوں نے سقراط کو دیکھا تھا اور سقراط آنکھیں جھکا کر اپنے بدصورت پیروں کو تکنے لگا تھا اور خوش ہوا تھا کہ اس کا انتہائی بدصورت ٹنڈ منڈ پیر بیوقوفوں اور ناسمجھوں کے چہرے سے زیادہ چمک رہا تھا۔

نور شاہ نے ٹھیک ایسے ہی جھک کر اپنے پیروں کو دیکھا اور بس دھیرے سے مسکرا دیئے۔ پھر چپ سے اچھے اور اپنے بیٹھکے میں آ گئے۔

بیٹھکے میں آنے تک وقت ٹھہر چکا ہوتا۔ حال سے اوقات کی سنکری گلیوں میں داخل ہونے تک وقت کا مارا خبطی بوڑھا دوسروں کی نظر بچا کر کب کا ان میں پورا کا پورا اتر چکا ہوتا۔

ایسے بھی دن ڈھلتا ہے کیا؟ راتیں آسمان پر ٹمٹماتے ستاروں کی طرح اتنی چھوٹی

کیوں ہوتی ہیں، بچپن سے، اماں کے ہاتھ سے بیلن چوکی چھین کر بنائی گئی ٹیڑھی میڑھی چھوٹی چھوٹی روٹیوں کی طرح..... عمر کے پاؤں پاؤں چل کر تو اریخ کے گلیارے میں احساس اور جذبات سے دھینگا شتی کرتے ہوئے گزرا وقت چہرے پر گہری جھریاں چھوڑ گیا تھا..... ان جھریوں میں بیتے دنوں کی خلش موجود تھی..... اب نقاہت سما گئی تھی۔ سانسیں تھمنے اور ٹوٹنے لگی تھیں۔ زندگی میں حاصل کے نام پر بس شونیہ کی خالی خالی یاترائیں تھیں..... اور سنہرے ماضی کے آبشار کے شور تھے کہ ب ابھی ابھی تو سلطنت، جاگیریں اور شہنشاہیت کے قصبوں سے نکل کر ٹرین جمہوریت کے بے حال اسٹیشن تک پہنچی ہے..... آنکھوں میں آنسو نہیں ہوتے بس..... سوکھی سی گرد ہوتی جو وقت کو گالیاں اچھالت وقت چپکے سے آنکھوں میں پڑ گئی ہوتی۔ آنکھوں کو صاف کرتے۔ پائجامہ تھوڑا سا اوپر چڑھا کر، اکڑوں بیٹھ کر دونوں پاؤں کے پنجوں کو برابر برابر پھیلا دیتے..... غور سے پنجوں کو دیکھتے۔

ہاں اسے کہتے ہیں خاندانی پیر..... محراب نما انگوٹھا اور مسجد کے ستونوں کی طرح ایک دوسرے سے جڑی تنی تنی لمبی لمبی انگلیاں، خوبصورت عورت کے سینے کے گداز کی طرح ابھرا ہوا تلوا، تلوے سے انگوٹھے کی طرف جاتی ہوئی خمیدہ فلائی اوور کی طرح چمکتی سڑک۔ اسی پر تو وہ جان نثار کرتے تھے وارا بامرحوم لیاقت علی شاہ فخر سے بتایا کرتے تھے کہ نور علی شاہ دھیان سے سن، خاندانی لوگ اپنے ہاتھ اور پاؤں سے بھی پہچانے جاتے ہیں..... خوبصورت، سانچے میں ڈھلے ہوئے..... واللہ کیا کہنے..... ہم تو خیر نوابوں کے خاندان سے ہیں۔ ہماری برابری بھی کیا ہے۔

نواب اور نوابوں کا خاندان..... بدلت وقت کے سانچے میں نہیں ڈھلے تو بس اسی وجہ سے کہ قدم قدم پر یہ نوابی ہونا ریڈ سنگل کی طرح انہیں روک دیتا تھا۔ زندگی میں کچھ بھی نہیں کیا تو بس اسی لئے کہ نوابی خاندان پر حرف نہ آجائے۔ اللہ نوابی خاندان کے زوال کے بعد بھی ان کی نسلوں نے اس نوابیت کی لاج تو رکھی تھی.....

ابا میاں لیاقت علی شاہ نے بھی کیا کیا، بس زندگی بھر اسی کفن کو اٹھائے ڈھوتے رہے۔ نوابوں کی یادگار کے نام پر بس ایک صندوق تھا جو نسل در نسل ہوتا ہوا اب ان کے پاس تھا۔ خدا کی مار، کہ اب اس شاہی صندوق کو بھی اس کباڑ نما دو چھوٹی چھوٹی کوٹھریوں والے دربے میں کون سی جگہ ملی تھی۔ پائخانہ جانے والے راستے کے پاس اسٹور کے استعمال کے لئے تھوڑی سی جگہ تھی۔ جہاں گھر کی بیکار چیزیں بے قرینے، پھینک دی جاتیں، وہیں کنارے۔ یہاں چار کھمبے والی گلی مکان ملنے کے بعد بس اس صندوق کو یہی جگہ نصیب ہوئی تھی۔ صندوق کا پھیلاؤ اتنا تھا کہ کوٹھریوں میں رکھنے کے بعد جگہ اور بھی تنگ ہو جاتی۔ آخر سوچ سمجھ کے بعد انتہائی صبر اور آہ کے ساتھ تعفن کو جانے والے راستوں پر صندوق کو رکھ دیا گیا۔ پائخانہ آتے جاتے نور علی شاہ اس موروثی صندوق کو دردانگیز نظروں سے دیکھتے اور وقت کی بے مروتی، بے رحمی پر گیلی لکڑی کی طرح نم ہو جاتے۔ ماضی کی بھول بھلیاں میں گم ہونے کی خواہش ہوتی تو افسردگی سے صندوق کا تالہ کھولتے۔ صندوق کی گرد صاف کرتے ہوئے کرتا پائجامہ دھول میں اٹ جاتا۔ کہتے ہیں صندوق قیمتی صندل کی لکڑیوں کا بنا تھا۔ کئی پشتوں تک صندل کی خوشبو نسل در نسل اپنی مہک کی خیرات باٹتی رہی بالآخر یہ خوشبو بھی وقت کے سانحے میں گھوگئی۔ اب ناک لکڑی میں گھسا کر بھی رگڑیے تو کم بخت خوشبو نہیں بلکہ ایک عجیب سی بدبو ناک کے ذریعہ منہ میں داخل ہو جاتی۔ لیاقت علی شاہ نے مرنے سے پہلے صندوق کی تالہ کنجی نور علی شاہ کے ہاتھوں میں سونپی تھی۔ لے بیٹا بس یہی تیرے خاندانی ہونے کی نشانی ہے۔ اسے سنبھال کر رکھیو۔ انہوں نے تالہ اچھی طرح بند کر کے دیکھا، کنجی جیب میں رکھی، پھر ابا کی طرف مڑے تو ابا جگ سے منہ موڑ کر انتہائی آرام کی نیند سو چکے تھے۔ جیسے بیٹے کو جاگیر سونپتے ہی چین و قرار آ گیا ہو۔

لیاقت علی شاہ کو حکومت ہند کی طرف سے کل جمع 80 روپیہ شاہی بھتہ ملتا تھا۔ بھتے کی

رقم میں بدلتے ہوئے وقت کے ساتھ نہ کمی آئی نہ زیادتی۔ بس یہ بھتہ بندھا رہا۔ یہ بھتہ ان کے خاندان کو مل رہا تھا۔ زندگی ٹھکانے لگانے کے لئے اسی بھتہ کا گزارا تھا۔ کبھی کبھی نئی سرکاریں بدلنے کے دوران اس بھتہ کے ملنے میں مشکلیں بھی پیش آئیں۔ کورٹ کچہری کے دس چکر لگے تو یہ بھتہ پھر جاری ہوگیا۔ کبھی کبھی کوئی بڑا سرکاری افسر اچانک ان پر ترس کھا اٹھتا، ''اوہ، اتنے بڑے خاندان سے ہیں آپ۔ لگتا نہیں ہے، جیسے ان کی خستہ، بے گوروکفن لاش میں وہ اس دور کی نوابیت تلاش کررہا ہو۔ پھر ایک طنزیہ ہنسی۔ وہ اس ہنسی کو اچھی طرح پہچانتے تھے۔ جی حضوری کے وہ قائل تو نہیں تھے مگر مجبوری تھی اور نتیجہ میں بھتہ اب 150 روپیہ پہنچ گیا تھا جس میں 50 روپیہ تو مکان کا کرایہ ہی نکل جاتا۔ آسودگی کے نام پر محض نواب گھرانے کے ہونے کا احساس تھا اور وہ اس احساس کو پورے طمطراق سے نسل در نسل ڈھوئے جارہے تھے۔

پڑوس میں ہی مختار بنیے کی دکان تھی۔ جب تب اسی دکان کا آسرا تھا۔ لیکن جہاں کمائی کا کوئی راستہ نہ ہو وہاں اکیلا بنیا بے چارہ کہاں تک سودہ سامان ادھاری دیتا رہتا۔ سو ایک دن غصے میں آکر نور علی شاہ کا ادھاری کھاتہ بند کردیا۔ پڑوسی ہونے اور نوابی شان، سب واسطہ دھرا کا دھرا رہ گیا۔ مختار کی اکڑ اور ہٹ میں پیٹ کی دوزخ پگھل پگھل گئی۔ گھر میں دو روز سے فاقہ تھا۔ جام شہادت قبول کرنے کا وقت آچکا تھا۔ وہ جیسے پہلی بار مختار کے آگے سرنگوں ہو گئے۔

''لو ننگے آیا ہوں۔ اب بولو۔ امجد علی شاہ کے خاندان کا کوئی آدمی خواب میں بھی کبھی اس طرح ننگا نہ ہوا ہوگا میاں جیسے میں ہورہا ہوں، تمہارے سامنے۔ چاہو تو مجھے گروی رکھ لو۔ میرا تماشہ بنالو۔ مگر ادھاری مت بند کرو۔''

اور مختار نے جیسے قربانی کے جانور کے ذبح کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔

''ٹھونگا بنا سکتے ہیں آپ۔ میاں جی ٹھونگا بنائیے۔ ہم خریدیں گے۔ آس پاس کی

کئی دکانوں میں بھی بات کرادیں گے۔ ہر طرح کے چھوٹے بڑے۔ کیلو دو کیلو والے۔ دام مناسب ملیں گے۔''

تب سے وہ ٹھونگا ہی تو بنا رہے ہیں۔ شروع شروع میں گھر میں رکھی پرانی کتابیں اور کاپیاں اس کام میں آ گئیں۔ پھر سڑکوں سے بیکار پڑے کاغذ اٹھا اٹھا کر گھر لائے جانے لگے۔ بیوی بچے سارا دن روزی کے تلخ نوالے گلے سے اتارنے پر مجبور تھے۔ مہینے میں 250-200 روپے تک کے ٹھونگے بن جاتے۔ مختار نے دو چار جگہوں پر بات کرادی تھی۔ شروع شروع میں تو ٹھونگے پہنچانے وہی جایا کرتے تھے پھر اسلم بھی جانے لگا۔ ہاں کبھی کبھی دل سے آہ اٹھتی تو زور زور سے چیخنا چلانا شروع کر دیتے..... ہے ہے..... دیکھو لوگو..... کیا نازک زمانہ آ گیا ہے..... امجد علی شاہ کے خاندان والے ردی کے ٹھونگے بھی بنانے لگے ہیں۔''

سب کچھ حسب معمول چل رہا تھا کہ ایک چھوٹا سا واقعہ ہو گیا۔ ممکن ہے دوسروں کی نظر میں اس کی بہت اہمیت نہ ہو مگر نور علی شاہ کے لئے اس کی اہمیت اتنی تھی، جتنی سمندر میں بھٹک رہے جہاز کے لئے قطب تارہ کی۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر ہکسلے اپنی کتاب کے سلسلے میں ہندوستان آئے ہوئے تھے۔ دراصل وہ ہندوستان کے شاہی گھرانوں اور ان کے زوال پر ایک اہم کتاب ترتیب دے رہے تھے۔ اس سلسلے میں پورے ملک میں گھوم گھوم کر انہوں نے کافی مواد جمع کر لئے تھے۔ پروفیسر ہکسلے کو جب نواب امجد علی شاہ کے گمنام خاندان کا پتہ چلا تو وہ خود کو ملنے سے نہیں روک پائے۔ چار کھمبا کی گندی گلی میں کار کے داخل ہونے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے کار باہر ہی کھڑی کرنی پڑی۔ پروفیسر ہکسلے کے ساتھ ان کا ایک انڈین فرینڈ بھی تھا۔ جس سے ان کی پرانی خط و کتابت تھی۔ کتاب سے متعلق مواد کی فراہمی میں اس نے خاصہ مدد کی تھی۔

تنگ گلی میں گورے چٹے انگریز کو دیکھتے ہی چہ میگوئیوں کا بازار گرم ہو گیا۔ بچوں کے علاوہ مختار کی دکان پر بھیڑ لگانے والوں نے بھی حیرت سے گورے چمڑے والے کو دیکھا۔ یقیناً ان کی حیرت کی اس وقت انتہا نہ رہی، جب اس کے ساتھ والے شخص نے کسی سے نور علی شاہ کے بارے میں دریافت کیا۔

مختار نے گردن اچکا اچکا کر نووارد کو کسی آٹھویں عجوبے کی طور پر دیکھا اور پاس کھڑ گاہک سے طنزیہ لہجے میں بولا..... ''یہ انگریز سالے تو بھارت سے چلے گئے تھے، پھر واپس کیسے آ گئے۔؟''

''نور علی شاہ'' کو پوچھ رہا ہے۔''

''نور علی شاہ'' مختار کی ہنسی چھوٹتے چھوٹتے رہ گئی۔ جیسے اچانک اس نے نور علی شاہ کے سراپا میں ان کے بنائے ٹھونگوں کا عکس دیکھ لیا ہو اور حیرت یہ کہ اس وقت بھی اس ک ہاتھ میں وہی ٹھونگا تھا جو نور علی شاہ کے یہاں سے بن کر آیا تھا اس میں کسی گاہک کا سودا پیک کر رہا تھا۔

پروفیسر ہکسلے اور ساتھ والا حیدر آبادی چھوٹے چھوٹے گندے بچوں کی فوج پار کرتے ہوئے نالے پر بنے مکان پر چڑھ گئے، جہاں دروازہ پر بھورے رنگ کا ٹاٹ کا پردہ گرا ہوا تھا۔ کسی محلے والے نے دروازہ کی کنڈی ہلا کر بانگ لگائی۔ ''نور علی، ودیش سے کوئی ملنے کو آئے با۔'' نواڑ کی پلنگ س، دھب سے کودے نور علی شاہ، پائجامہ کا ازار بند بند کرتے ہوئے دروازہ کی طرف تیزی سے دوڑ گئے۔ سچ مچ سامنے ایک خوش شکل 45-40 سال کی عمر کا ایک گوری چمڑی والا انگریز کھڑا تھا۔

''ٹوم نور علی شاہ'' اس نے بے انتہائی نرمی اور ملائمیت سے ہاتھ بڑھایا.....

حیدر آبادی نے شستہ اردو میں مکالمہ جڑا۔ ''یہ آکسفورڈ سے آئے ہیں۔ آپ سے خصوصی طور پر ملنے کے متمنی تھی۔ دراصل آپ کے شاہی خاندان کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہتے ہیں۔''

اس نے محسوس کیا، ہکسلے بھی ٹوٹی پھوٹی زبان آسانی سے بول پا رہا تھا۔

نور علی شاہ کا چہرہ کھل اٹھا۔ ''آیئے..... باہر کیوں کھڑے ہیں۔ اندر آجایئے۔''

مگر اندر کون سی جگہ تھی، بیٹھنے بیٹھانے کے لائق۔ دنیا بھر کے کپڑے پھیلے ہوئے تھے چھوٹے سے برآمدے میں الگنی میں پسرے کپڑوں سے پانی اب بھی چو رہا تھا۔ وہیں ایک طرف اسلم اور فاطمہ بیٹھے ٹھونگے بنا رہے تھے۔ بڑی بی سر جھکائے گندے برتنوں کو انہماک سے دھونے لگی تھیں۔

غصہ جیسے چڑے کی طرح اچانک نور علی شاہ کی ناک پر بیٹھ گیا۔

''یہ دیکھئے نوابوں کا خاندان، شاہی خاندان..... مگر ٹھہریے۔ میری عورتیں پردہ کرتی ہیں.....''

انہوں نے غصّے میں ڈانٹ کر بیوی اور لڑکی کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ غصّے میں اپلاتے ہوئے چیخ پڑے۔ اب ہماری قدر کہاں۔ قدر تو انگریز جانتے تھے۔ آپ جانتے تھے اور بھارت سرکار نے ہماری بولی لگائی ہے صرف ڈیڑھ سو روپے ''جس میں سرکاری افسر کے لئے ایک اچھی سی شراب تک نہیں آسکتی۔''

پروفیسر ہکسلے نے ان کے کندھے پر پیار سے ہاتھ رکھا۔ ہم کو معلوم۔ یہی تو جاننے اور پوچھنے ہم آیا.....

اس نے پیار سے، بےحد معصوم دکھنے والی نیلی نیلی آنکھوں سے کسی بچے کی طرح ان کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے گردن ہلائی۔ تب تک مختار رنیے کا بھیجا ہوا لڑکا دو لڑکا دو بینت کی کرسیاں لے آیا تھا۔ ہکسلے اور حیدرآبادی ان کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ نیواڑی کی پلنگ پر نور علی شاہ پیروں کو لٹکائے سوچ میں گم ہو گئے۔ یہاں ان کے ملک سے تو کبھی ایک چڑیا بھی ان کی کھوج لینے نہیں آئی اور یہاں باہر سے..... باہر والوں کی بات ہی نرالی ہے۔

''کوئی تکلف نہیں۔ ہم صرف کچھ پوچھنے آئے ہیں۔'' حیدرآبادی نے ٹائی کی

ناٹ درست کی۔ ترچی نظروں سے گھر کا جائزہ لیا۔ اڈگی کواڑ سے سہمی ہوئی نظریں ادھر ہی دیکھ رہی تھیں۔ اس بیچ ایک بچہ دو گلاس اسپیشل چائے لے کر آ گیا۔ حیدرآبادی کو گلاس تھامتے ہوئے تھوڑی ہڑبڑاہٹ بھی ہوئی مگر گوری چمڑی والے نے آسانی سے شکریہ کہتے ہوئے گلاس تھام لیا۔ اور دھیرے دھیرے چسکی لینے لگا۔

''ہاں امجد علی شاہ کے بارے میں..... ٹوم جو بولے گا، ہم لکھے گا۔ اس کے لہجے میں وہی ملائمیت تھی۔ پھر جیب سے نوٹ بک نکال کر، خالی گلاس نیچے رکھ کر وہ ہمہ تن گوش ہو گیا۔

تواریخ کی سبز وادیوں کی یادگار پر گرد جم چکی تھی۔ نور شاہ دھیرے دھیرے اس گرد کو صاف کر رہے تھے۔ سب کچھ تو وقت نے چھین لیا۔ کیسی ریاستیں اور جاگیریں..... پرانے قصوں کے پٹارے کھل گئے تھے۔ راجہ مہاراجہ کی شان و شوکت کی انوکھی البیلی کہانیاں، عیش و عشرت کی عجیب داستانیں وہ سناتے رہے..... بتاتے رہے۔ سب کہانیاں وقت کی تحویل میں دفن ہوتی رہیں۔ ہندوستان تبدو پاٹ نہیں ہوا تھا لیکن نواب امجد علی شاہ کے پرپوتوں کے نصیب کو گہن لگ چکا تھا۔ ریاست ختم ہو چکی تھی۔ جاگیریں حکومت نے چھین لیں۔ جو محل تھا، شاہی اصطبل تھا، وہ سب حکومت نے بطور میوزیم اپنی نگرانی میں لے لیے۔ اب ٹورسٹ آتے ہیں، جاتے ہیں، لاکھوں کے وارے نیارے ہیں اور یہاں یہ بندہ بیراگی جسے نواب امجد علی شاہ کا وارث بتاتے ہوئے بھی شرم آتی ہے، بھوک سے بے حال ہے، کپڑوں سے ننگا ہے، اور اس پھٹ حالی میں صرف داستان گو بن کر رہ گیا ہے..... آہ..... امجد علی شاہ کا اصطبل دیکھئے جہاں شاہی گھوڑے بندھتے تھے، وہ آج کے حالی شان عمارتوں اور کوٹھیوں سے بھی بہتر ہیں.....

وہ سناتے رہے۔ انگریز بیچ بیچ میں روک روک کر کچھ سوال کرتا۔ حیدرآبادی دھیمے سر میں کچھ جواب دیتا۔ انگریز سر ہلا کر پھر لکھنے میں محو ہو جاتا.....

دوپہر کا سورج منڈیروں سے کچھ دور چلا گیا تھا۔ آنگن میں کچھ بدلی سی چھا گئی تھی۔ نور علی شاہ پھر سیاسی زمانے میں پہنچ گئے تھے۔ شدت جذبات سے آواز کبھی لڑکھڑا جاتی تھی۔ گلوگیر ہو جاتی۔ اچانک وہ ٹھہرے آنکھوں میں گزرے وقت کی گرد پڑ گئی تھی۔ ''نشانی..... آپ نشانی پوچھتے ہیں۔''

''ہاں۔ یس''..... انگریز نے متاثر کن انداز میں سر کو دوبارہ جنبش دی اور بے قراری میں اٹھ کھڑا ہوا۔ گردن سے جھومتا ہوا کیمرہ نکالا اور معصومیت سے بولا.....

نور علی شاہ ہم ایک پوز چاہتا..... جھٹ سے فلیش چمکا..... اور نور علی شاہ جھٹ سے کمیرے میں سما گئے۔

لیجئے لیجئے..... آواز شدت جذبات سے بھاری تھی..... اس مرغی کے دربے کی بھی تصویریں لیجئے۔ جہاں ہم رہتے ہیں۔ مگر نہیں معاف کیجئے گا۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ عزت کی اتنی پاسداری ہے کہ خواتین کو آپ کے سامنے حاضر نہیں کر سکتا۔ نہیں۔ بے شک نہیں۔ کبھی نہیں۔ آپ ادھر ادھر کی جتنی مرضی تصویریں لیجئے۔

انگریز کے کیمرے کی فلیش گھر کی خستہ حالی پر کئی بار چمکی۔ اس کی آنکھوں میں شکریہ کا مفہوم چھپا تھا۔ حیدر آبادی نے شائستہ لہجے میں پوچھا۔ کوئی نشانی جو محفوظ رہ گئی ہو.....؟''

''ہاں ہے تو سہی.....'' ان کے دل سے سرد آہ نکل گئی۔ ''آیئے۔ چلیے۔ آپ بھی دیکھئے۔''

وہ رندھ قدموں سے پائخانہ جانے والے راستوں کی طرف بڑھے۔ پھر تھم سے گئے تعفن کا ایک تیز ریلا کھلے سنڈاس سے نکل کر ہوا میں گھل مل گیا تھا۔

''یہ ہم ہیں.....'' وہ چبا چبا کر بولے۔ گوہ اور موتر میں نہائے ہوئے۔ دن رات اسی تعفن کو برداشت کرتے ہیں اور جیتے ہیں۔ بس۔ انہوں نے اسلم کو آواز

لگائی۔ اسلم جوکواڑ کے پیچھے چھپ کر کھڑا تھا۔ تیزی سے آیا۔ انگریز اور حیدرآبادی کو جھٹکے سے سلام کیا اور ابا کی آنکھوں میں جھانکا۔

یہ صندوق..... اسے باہر نکالیو..... انہوں نے پھیلے کباڑ کی طرف اشارہ کیا۔ پھر انگریز کی جانب توجہ سے دیکھتے ہوئے بولے۔ اس کے اندر جو کچھ بھی ہے وہ نا قابل دید ہے نہ آپ کے کسی کام کی..... مگر نشانیاں تو ہیں اور دیکھئے تو سہی۔ ان نشانیوں کو کیسی جگہ نصیب ہوئی ہے۔

انگریز کے فلیش چمکتے رہے۔ تالہ کھلنے پر بھی۔ صندوق کے اندر سے گرد و غبار کا ایک تیز جھونکا اٹھا۔ انگریز نے متجسس ہاتھوں سے ان نشانیوں کا لمس محسوس کیا۔ بے آن، بے رنگ، بے رونق اور اپنی آب کھوتی نشانیاں.....

اس نے پھر ایک تصویر لی۔ اس کا چہرہ مسکرا رہا تھا، دوسرے ہی لمحے اس کا ہاتھ اپنی جیب میں گیا اور کچھ کرنسی نوٹ اس نے مضبوطی سے نورعلی شاہ کے ہاتھ میں پکڑا دیئے۔ دھیرے دھیرے ان کے ہاتھوں کو تھپتھپایا اور حیدرآبادی کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکل آیا۔

وہ کب گئے، گاڑی کب روانہ ہوئی، انہیں کچھ پتہ نہیں۔ وہ بس بے خبری میں کھوئے رہے ایک عجیب سی آگ تھی جو اچانک ان کے اندر بھٹی کی طرح روشن ہوگئی تھی۔ بدن تپ رہا تھا۔ سر پھٹا جا رہا تھا۔ نشانیاں..... وہ صرف نشانیوں کے بارے میں غور کر رہے تھے..... نواب امجد علی شاہ کے خاندان کی آخری نشانی..... اب اس نشانی کو دیکھنے کے لئے بھی لوگ آیا کریں گے۔ پھر جاتے جاتے دیکھنے کا ٹیکس بھی ادا کریں گے.....''

وہ بار بار بھڑک رہے تھے..... بار بار پروفیسر ہکسلے کے کیمرے کا فلیش ان کی آنکھوں میں چمک رہا تھا۔

وہ دیکھ رہے تھے..... وہ کھڑے ہیں..... گندہ سا، اٹھنگا سا پائجامہ اور اس پر چور

مچور شکن آلود کرتا..... چہرے پر پڑی ہوئی جھائیاں اور اجھڑائے بال..... ان کا دبلا پتلا جسم..... اور فلیش چمک رہا ہے.....

سنڈاس کے پاس کباڑ کے ڈھیر میں پڑا تواریخی صندوق..... صندوق میں پڑی بوسیدہ، گرد و غبار میں ڈوبی صدیوں پرانی نشانیاں اور فلیش چمک رہا ہے..... زمین پر چھترائے ہوئے برتن، الگنی پر سوکھتے ہوئے کپڑے..... اور فلیش چمک رہا ہے.....

نور علی شاہ! وہ بہت دھیرے سے مردہ لہجے میں بڑبڑائے..... تم محض نشانی رہ گئے ہو..... اپنے پرکھوں کی آخری یادگار۔

زمین پر دونوں پاؤں کو جوڑ کر وہ غور سے دیکھتے رہے..... ایک عجیب سی کراہیت ان کی نس نس میں بس چکی تھی۔ وہ بہت غور سے تھکے ہوئے اپنے پاؤں کو دیکھ رہے تھے مگر اب سب کچھ انہیں ٹیڑھا میڑھا لنج پنج نظر آ رہا تھا.....

بازار، طوائف اور کنڈوم

بازار

پہلے بازار اِس طرح نہیں پھیلا تھا۔

وہ بازار کے، اِس طرح پھیلنے پر اُداس تھا۔ پہلے بازار میں اتنی بھیڑ نہیں ہوا کرتی تھی۔ پہلے بازار میں اِتنی ڈھیر ساری دکانیں نہیں ہوا کرتی تھیں۔ پہلے دکانوں میں اِتنے سارے کام کرنے والے مزدور یا 'چیزیں' نہیں ہوا کرتی تھیں۔ پہلے گلیاں اِتنی تنگ نہیں تھیں۔ سڑک پر آدمی آرام سے گزر سکتا تھا۔ آجکی طرح نہیں کہ پیچھے سے آنے والی بھیڑ آہستہ آہستہ آپ کو آگے کی جانب دھکا دے رہی ہے اور جسم پر پڑنے والا 'بوجھ'—— بازار کی بھیانک شکل کے سامنے ہر لمحہ آپ کو بے بس اور لاچار کرتا جا رہا ہو——!

پہلے بازار میں اچھے آدمی ہوا کرتے تھے۔ دیسی چیزیں ملا کرتی تھیں۔ اِس بار بازار میں غیر ملکی اشیاء کی باڑھ آئی ہوئی تھی۔ سچی بات یہ ہے کہ بازار کی شکل ہی بدل گئی تھی۔ وہ اِس شہر میں دو تین برس کے بعد آیا تھا۔ دو تین برس میں شہر کا چہرہ اتنا بدل جائے گا، اُسے یقین نہیں ہو رہا تھا۔ جو دکان والے اُسے دیکھتے ہی آواز دے کر بلاتے—— چائے پلاتے—— سامان خریدتے—— انہوں نے جیسے اُسے پہچاننے سے ہی انکار کر دیا تھا——

نہیں، اُسے پختہ یقین تھا۔ یہ وہ لوگ نہیں تھے۔

''پھر اُن کے بیٹے ہوں گے؟''

نہیں بیٹے بھی نہیں۔ بازار کے ساتھ، اخلاق، زبان اور لوگ بھی بدل گئے تھے۔ شاید اِسی لئے اُس کے دیسی برانڈ کو دیکھ کر کچھ لوگ ہنسے تھے۔

'یہ کیا ہے.....؟'

'وہی جو ہمیشہ سے ہم سپلائی کیا کرتے ہیں۔'

ہنسنے کی آواز ـــــ ''معنی، دیسی ہے ـــــ پھر ہنسنے کی آواز۔''نہیں ـــــ نہیں چلے گا۔''

''نہیں چلے گا ـــــ؟''

''لیکن دور دراز، گاؤں، قصبوں کے لوگوں کو تو.....''

''جواب میں کہا گیا ـــــ ''اب دور دراز کچھ بھی نہیں ہے۔ گاؤں، قصبے ـــــ سب لوگوں کو غیر ملکی چیزیں پسند ہیں ـــــ اور ہاں ـــــ بازار میں ہم وہی کچھ فروخت کرتے ہیں، جس کے آرڈر آتے ہیں ـــــ جو سکہ چلتا ہے، ہم وہی لیتے ہیں ـــــ

اِس بار ہنس کر کہا گیا تھا ـــــ ''بازار بدل گیا ہے۔ تم بھی اپنے کو بدل ڈالو۔''

○○

وہ جیسے سناٹے میں تھا ـــــ حوصلہ پست ہو چکا تھا۔ ایسا تو پہلے کبھی نہیں ہوا۔ وہ آتا تھا۔ سامان فروخت کرتا تھا۔ رات گئے ہوٹل میں آرام کرتا تھا ـــــ بازار کے درمیان دو ایک 'دھندے' کی دکانیں تھیں۔ اُن میں سے کسی ایک طوائف کو پٹا کر لے آتا۔ ساری رات عیش کرتا۔ پھر دوسرے دن بڑا مال آرڈر لے کر اپنے گھر روانہ ہو جاتا۔

مگر اِس بار بازار نے جیسے اپنا مکمل چہرہ ہی تبدیل کر لیا تھا ـــــ اُس نے سوچ لیا تھا ـــــ یہ بازار اب تمہارا نہیں رہا۔ تمہیں اپنے لئے چھوٹے بازار تلاش کرنے ہوں گے۔ جہاں تمہارے سکے، تمہارے 'ٹکسال' چلتے ہوں۔ جہاں سستی دیسی

سامانوں کی خرید وفروخت اب بھی ہوتی ہو ـــــ اُس نے گھبرا کر واپس لوٹنے کا فیصلہ کرلیا۔لیکن لوٹنے سے قبل آج کی رات ہوٹل میں وہ آرام سے اور کچھ کچھ 'عیش' سے گزارنا چاہتا تھا ـــــ ایک عدد طوائف کے ساتھ ـــــ اُس نے واپسی کا پروگرام انتہائی خوبصورتی سے ترتیب دیا تھا۔'دھندے' کی جگہ تلاش کرنے میں اُسے دشواری نہیں ہوئی اور ایک بار پھر وہ چونک گیا تھا۔

○○

پہلے یہاں دو تین چھوٹی چھوٹی دھندے کی دکانیں ہوا کرتی تھی۔اب اِنہیں توڑ کر ایک بڑے بازار میں تبدیل کیا جاچکا تھا ـــــ رنگین بورڈ۔خوبصورت غالیچہ۔ گھماؤ دار سیڑھیاں۔ریموٹ سے کھلنے والا دروازہ۔دروازے کے اندر کھلنے والی جنت کی کنجی ـــــ اوپر نیچے خوبصورت، حسین وجمیل، جنت کی اپسراؤں کو لے کر آتی جاتی نرم ونازک کانچ کی تعمیر شدہ ایک ایسی لفٹ ـــــ جس کے آر پار کا تمام 'جغرافیہ' آسانی سے دیکھا اور پڑھا جاسکتا تھا ـــــ ہر طرف پاگل اور مدہوش کرنے والی عطر کی مہک ـــــ شاندار صوفے ـــــ وہ اِس نئے بازار کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا تھا ـــــ اچانک 'وہ' نظر آگیا ـــــ وہ ـــــ وہ بالکل نہیں بدلا تھا۔پہلے وہ اِس دھندے میں 'دلّا' کہلاتا تھا۔سر پر ترچھی ٹوپی ـــــ پاؤں میں لنگی ـــــ منہ میں پان، گلے میں لال رومال اور ایک گندہ سا کُرتا ـــــ پچھلے دو تین برسوں میں وہ جانے کتنی کتنی بار اِسی 'دلّے' سے اپنے لئے طوائف کا انتخاب کرکے، اپنے ساتھ لے گیا تھا۔اُسے تعجب اِسی بات پر تھا ـــــ بازار کے ساتھ 'دلّا' بھی بدل گیا تھا اور اس کے طور طریقے بھی ـــــ 'دلّا' سفاری سوٹ میں تھا۔ بال 'ہیئر بیونگ' سے، قائدے سے سیٹ کرائے ہوئے ـــــ دلّے کے ساتھ کچھ

بے حد خوبصورت لڑکیاں تھیں۔ ایک لڑکی پر جیسے اُس کی نظر ایسے چپک کر رہ گئی کہ ہٹنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی ـــــ وہ کسی فلمی ایکٹریس سے زیادہ خوبصورت تھی ـــــ لیکن اِس وقت وہ کسی گہری سوچ میں گُم تھی ـــــ دلّے کا چہرہ بھی دوسری طرف تھا ـــــ ایک لمحے کو اس نے سوچا ـــــ بازار بدل گیا ہے۔ اور یہ طوائف بازار بھی ـــــ دلّا بھی بدل گیا ہے۔ بہتر ہوگا، وہ چُپ چاپ یہاں سے کھسک لے۔ دلّا بھی اُسے کہاں پہچانے گا۔

مگر دوسرے ہی لمحے دلّے کی نگاہیں اُس کی جانب گھوم گئی تھیں ـــــ اُس کی آنکھوں میں پہچان سے زیادہ ایک شکاری کی چمک آ گئی تھی ـــــ

'آیئے صاحب.....'

'جی.....' وہ ہکلا رہا تھا۔

''اب غریب خانے میں آ ہی گئے ہیں تو، شوق فرما کر ہی جانے دیں گے ہم.....''

دلّے نے انتہائی مہذب انداز میں اُسے سیلوٹ مارا ـــــ آیئے۔ یہاں..... یہاں تشریف رکھئے۔ اُس نے لڑکیوں کو وہیں رہنے کا اشارہ کیا۔ پھر اُس کی طرف گھوما۔

'سب کچھ بدل گیا..... کیوں.....؟'

'ہاں۔'

'لیکن آپ نہیں بدلے صاحب ـــــ یہ جگہ نہیں بدلی ـــــ وہ کسی فلاسفر جیسے انداز میں، گہری سوچ میں ڈوبا ہوا کہہ رہا تھا ـــــ 'جگہ نہیں بدلتی صاحب، بس رنگ بدل جاتے ہیں۔ روپ بدل جاتا ہے ـــــ اور بازار تو بدلنے کے لئے ہی ہوتا ہے صاحب.....'

'تم بھی تو بدل گئے.....؟'

'نہیں ...... میں ...... وہی دلا ......' وہ قہقہہ مار کر ہنسا ـــ صرف کپڑے بدلے ـــ کپڑے بدلے۔ اِس لئے زبان بھی بدلنی پڑی۔'

اِس درمیان وہ اپسرا جیسی خوبصورت لڑکی دلّے کی طرف گھومی تھی ـــ

'میرے لئے کیا حکم ہے۔ یا سونے جاؤں؟'

'نہیں ...... ابھی ٹھہرو ...... وسندھرا ......'

'و ...... سن ......' وہ جیسے اِس نام کے نشے میں ڈوب گیا۔ ایک بے حد پیارا سا خوبصورت چہرہ ـــ ایسے خوبصورت چہرے بھی دلّے کی جنت میں مل سکتے ہیں، اُس کے لئے سوچنا بھی مشکل تھا۔ ایک بڑے بازار کی اپسرا کا مطلب تھا ـــ مہنگی ہوگی۔' اُس کی جیب سے کہیں زیادہ مہنگی ـــ انگور کھٹے ہیں ـــ کھٹے انگور اُس جیسے تاجروں کے لئے نہیں ہیں، جسے بازار میں یہ کہہ کر ننگا کر دیا گیا ہے کہ اُس کے 'مال' بازار کے قابل نہیں ہیں ـــ اُس کے لئے تو کوئی دیسی، 'قصبی' ہی چلے گی۔ مگر اس بڑے بازار میں کیا ایسی قصبی ملے گی ـــ؟ اُس کے سوچنے کا سلسلہ ٹوٹ گیا ـــ دلّا اُسی اپسرا کے بارے میں اُس سے پوچھ رہا تھا۔

'صاحب۔ یہ چلے گی......؟'

'یہ......'

'ہاں، اِسی کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔'

'مگر یہ تو......'

''میں نے کہا تھا نا۔ گھبرائیے مت صاحب۔ بس آپ کے چُننے بھر کی دیر ہے۔ آپ کے پسند کرنے کی دیر۔''

اپسرا جیسی لڑکی ابھی بھی دوسری طرف دیکھ رہی تھی۔ جیسے اُسے فکر ہی نہیں ہو کہ ایک بڑے بازار کے ایک چھوٹے سے حصے میں اُس کی بولی لگنی شروع ہو گئی

ہو ـــــ دوسری لڑکیاں اپنے اپنے کمروں میں لوٹ گئی تھیں۔ لفٹ کے اوپر نیچے جانے کا سلسلہ جاری تھا ـــــ کولڈ رنکس کی بوتل کے درمیان ـــــ اِس جنت نما کمرے میں ـــــ جنت جیسی 'حور' کے لئے ـــــ لڑکھڑاتے ٹوٹتے الفاظ میں اُس نے اپنی بولی بڑھائی ـــــ اور ایکدم سے چونک گیا۔ 'بولی' ایک مقام تک آ کر سمجھوتے میں بدل گئی تھی۔

''بازار میں ہم اپنے ہر طرح کے گاہک کا خیال رکھتے ہیں صاحب۔ لڑکی اب آپ کی ہے۔ آپ چاہیں تو یہاں بھی کمرہ ہے۔ ہوٹل جانے کی فیس الگ سے..... قبول.....؟''

'قبول!'

معاملہ طے ہو چکا تھا۔ کسی روبوٹ کی طرح 'وسو' اُٹھ کر اُس کے سامنے کھڑی تھی۔ بالکل علاء الدین کے جن کی طرح ـــــ اُس کے قدموں میں بچھ بچھ جانے کے لئے تیار۔

'میرے آقا! کیا حکم ہے۔'

پھر اُس نے دیر نہیں کی۔ ٹیکسی پکڑی اور ٹیکسی اُس کے ہوٹل کی طرف روانہ ہو گئی۔

طوائف

ہوٹل کے چھوٹے سے کمرے میں نور ہی نور پھیلا تھا۔ وہ آج کی رات کو کچھ کچھ 'تاریخی' یا یادگار بنانا چاہتا تھا۔ پتہ نہیں کہاں سے اُس کے اندر ایک شاعر آ گیا تھا۔ شاعر ـــــ وہ اِس شاعر کو، جنت سے اُتری ہوئی اپسرا کے سامنے کچھ زیادہ ہی 'قرینے' سے پیش کرنا چاہتا تھا۔ حقیقت میں اِس طرح سے رومانی وہ کبھی نہیں ہوا۔ 'مال' کی سپلائی۔ آرڈر۔ گاڑی اور بسوں کی تھکان ـــــ پھر ایک عدد ویشیا کا ساتھ ـــــ جنگلی پن کا مظاہرہ اور ایک ٹھنڈی ندی کا بہاؤ۔ لیکن ـــــ یہاں تو

معاملہ ہی دوسرا تھا۔

لڑکی، شہزادیوں کی طرح بستر پر لیٹ گئی تھی ـــــ مخمور آنکھیں ـــــ گہری جھیل کی طرح لگ رہی تھیں۔ سنگ مرمر کی طرح شفاف، چمکتا ہوا بدن۔ ایک لمحے کو اُس نے کہا بھی۔

'کپڑے اُتاروں؟'

'نہیں۔ ابھی نہیں..... ابھی تو رات پڑی ہے.....'

لڑکی نے کندھے اُچکائے۔ اُس کی بانہیں ننگی تھیں ـــــ گوشت کا ایک بے حد حسین ٹکڑا۔ جینس کے پینٹ اور سلیولیس ٹی شرٹ میں اُس کا 'مغرور بدن' انگاروں کی بارش کر رہا تھا۔

ایک لمحے کو وہ ٹھہر گیا۔ لڑکی اُسی کی طرف دیکھ رہی تھی ـــــ اُس کی پریشانی یہ تھی کہ بات کہاں سے شروع کروں۔ مطلب کہاں سے رومانی ہوا جائے۔ وہ سوچ میں گرفتار تھا۔ اتنا بڑا شہر ـــــ پھیلتا ہوا ـــــ تیزی سے بڑھتا بازار ـــــ آلودگی ـــــ شور ـــــ شروعات شہر سے ہی کرنی چاہئے۔

اب وہ مطمئن تھا۔ ہونٹ گول ہو گئے۔ آنکھوں میں نشہ پیدا کیا۔ اپسرا کے چہرے کی طرف دیکھا اور لگا ـــــ الفاظ کے 'فوارے' چلنے خود بخود شروع ہو گئے ہوں.....

''تمہارا شہر..... تمہیں یاد ہے ـــــ پیڑ پودے..... کھلکھلاتا ہوا گلشن..... گیت گاتی ہوئی ٹھنڈی ہوا..... یہ سب مجھے میرے اپنے لگتے تھے۔ جیسے ہوا صرف میرے لئے جھوم رہی ہو..... درخت صرف میرے لئے گا رہے ہوں..... اور شہر ـــــ میں یہیں پیدا ہوا ہوں..... اسی مٹی سے ـــــ یا پھر 'پنر جنم' کا کوئی گہرا

لگاؤ ہوگا۔ میں کبھی یہاں بزنس کے خیال سے نہیں آیا ـــــ بس۔ یہاں کا ـــــ یہاں کی آب و ہوا بار بار مجھے اپنی طرف کھینچ لاتی تھی۔ جیسے شہر بین بجا رہا ہو..... میرے لئے..... بلا رہا ہو مجھے..... تمہیں آنا ہی ہوگا اور دیکھو ـــــ''

'یہ شہر میرا نہیں ہے ـــــ'

لڑکی نے درمیان میں ہی بات کاٹ دی۔ جیسے ہوا رُک گئی۔ 'بین' کا بجنا بند ہوگیا۔ سرسراتے پیڑ خاموشی میں بدل گئے ـــــ گیت رُک گیا.....

وہ ایکدم سے چونکا ـــــ 'تمہارا نہیں، مطلب.....؟'

'مطلب میرا نہیں ہے.....'

'پھر ـــــ؟'

'میں ابھی حال میں آئی ہوں۔ پھر کہاں جاؤں گی۔ کہہ نہیں سکتی.....'

'چلو..... کوئی بات نہیں.....'

آگے بڑھ کر اُس نے کھڑکی کھول دی ـــــ کھڑکی سے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اندر آ گئے تھے۔

'ٹی وی چلا دوں.....؟'

'نہیں ـــــ اُس کی آواز خاموش لہروں کی طرح 'ساکت' تھی۔

وہ بھی کچھ دیر تک کھڑکی سے باہر بے مطلب دیکھتا رہا۔ جیسے اپسرا سے دوبارہ گفتگو کے لئے نئے لفظ تلاش کر رہا ہو ـــــ اُس نے آئینہ میں اپنا جائزہ لیا۔ سفید کرتا، پائجامہ۔ آنکھوں کا نشہ ابھی اُترا نہیں تھا۔ ہونٹ ابھی بھی گول تھے۔ اندر رومانی انسان موجود تھا۔ 'شہر' والا کارتوس تو فیل کر گیا۔ جانے دو۔ کیا ہوا۔ لڑکی اب کھڑکی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ایک لمحے کو وہ اُٹھی۔ لہرا کر کھڑکی کے پاس کھڑی ہوگئی ـــــ جیسے کشتی کے 'بادبان' کھل گئے ـــــ ہوا کے رتھ پر ایک خوبصورت سا

چہرہ، 'جھولے' جیسا جھول رہا تھا۔

'وسو.....' اُس کی آواز میں نشہ تھا..... وسندھرا..... کتنا پیارا نام ہے..... تمہیں پتہ ہے وسو..... دلے نے ـــــ نہیں معاف کرنا مجھے ـــــ پہلے ہم اُسے اِسی نام سے پکارتے تھے..... چلو، چھوڑو اِس بات کو۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا۔ دلے نے جیسے ہی تمہارا نام لیا..... و..... سن..... دھرا..... پتہ ہے..... مجھے کیا لگا..... کبھی تم نے ریگستان میں، خاموشی کی ریت پر چلنے والے اونٹوں کی گھنٹیاں سنی ہیں ـــــ نہیں۔ میں مندر یا گرجا گھر کی گھنٹیوں کی بات نہیں کر رہا..... ریت کی اُڑتی آندھی میں، ایک قطار سے چلے آ رہے، اونٹوں کے گلے میں بندھی گھنٹیاں..... جیسے 'جلترنگ' بجتا ہے..... جیسے دنیا کے سب سے میٹھے ساز نے تمہارا نام پکارا ہو۔ و..... سن..... دھ..... را..... جیسے ـــــ'

'وسندھرا میرا نام نہیں ہے ـــــ'

وہ کھڑکی سے ہٹ گئی تھی۔ میں نے جائزہ لیا۔ وہ خاصی لمبی تھی۔ ایک خوبصورت اور پُرکشش جسم ـــــ لیکن جیسے، دھیمی دھیمی آنچ پر جلتے پگھلتے جسم کی اُسے کوئی فکر ہی نہیں تھی۔ وہ اُٹھ کر کرسی پر بیٹھ گئی ـــــ

'تمہارا نام نہیں.....' میں اٹک رہا تھا۔ لفظ ٹوٹ رہے تھے ـــــ

'ہاں.....'

'مگر دلے نے تو.....'

'ہاں' وہ ہر روز نام بدل دیتا ہے.....'

ہر روز..... مطلب تمہارا اپنا کوئی نام نہیں۔'

وہ گہری سوچ میں گم تھی اور ایک ٹک میرے چہرے کو تکنے لگی تھی ـــــ

'تم سونا چاہتی ہو تو.....'

'نہیں'۔۔۔۔اس کے الفاظ میں سختی نہیں تھی۔۔۔۔وہ سب کچھ ایک روبوٹ کی طرح کر رہی تھی..... 'تم نے خریدا ہے مجھے۔آج کی رات کے لئے۔ مجھے حکم ہے، میں وہی کروں جو تم چاہو گے.....'

کہنے کے لئے تو اس کے پاس متعدد سوالات تھے۔۔۔۔زندگی اور مجبوری سے جڑے سوالات۔۔۔۔یہاں، اِس منزل تک کی تکلیفوں سے الجھے ہوئے سوالات۔۔۔۔مگر ایسے 'بے رحم' سوالوں کی شروعات سے ایک اچھی، خوبصورت اور رومانی رات کا ستیاناس نہیں کرنا چاہتا تھا۔وہ ایک بار پھر بڑی ادا سے بستر پر لیٹ گئی تھی۔ 'قلوپطرہ، مونالیزا سے لے کر جنیفر لوپیز تک کتنے ہی نام ہونٹوں تک آ کر ٹھہر گئے۔۔۔۔یہ جسم، یہ لباس.....وہ اُس کے لباس کا جائزہ لے رہا تھا۔آج جینس تو ہر دوسری تیسری لڑکی پہنتی ہے۔سلیولیس فینسی شرٹ تو سبھی پہنتے ہیں..... مگر اتنا بولتا ہوا لباس.....چوائس کتنی اچھی ہے۔۔۔۔ہیرا اپنی قیمت پہچانتا ہے۔

ہوا تیز ہو گئی تھی۔کھڑکی کے پٹ ڈول رہے تھے۔۔۔۔وہ آہستہ سے بولی۔

'کھڑکی بند کر دو.....'

'اچھا۔'

وہ اپنی جگہ سے اُٹھا۔کھڑکی سے، بادلوں کے کچھ ٹکڑوں کے درمیان، آنکھ مچولی کھیلتا ننھا سفید چاند آ گیا تھا۔دروازہ بند کرتے ہی وہ تیزی سے مڑا۔چاند اپسرا کے لباس میں گُم تھا.....سفید ٹی شرٹ، بادل کے ٹکڑوں میں تبدیل ہو گئے تھے۔چاند اِن ٹکڑوں میں سمٹ آیا تھا.....

اپسرا دھیرے سے ہنسی۔۔۔۔

'کیا دیکھ رہے ہو.....'

'تمہارا لباس.....'

'لِ.....باس ـــــ' اپسرا کہتے کہتے رُک گئی۔

'کتنا خوبصورت۔کتنا پُرکشش ہے۔جیسے.....'

اُس کی کھنک دار ہنسی نے ایک بار پھر کمرے کا سکوت توڑ دیا تھا ـــــ 'یہ لباس بھی میرا نہیں ہے۔'

'مط.....لب۔'

اپسرا چپ تھی ـــــ ''مطلب میرا نہیں ہے۔کل والی پارٹی نے دیا تھا۔گفٹ۔ ایک رات کا تحفہ..... کچھ سر پھرے ایسے بھی ہوتے ہیں۔ قیمت کے ساتھ ساتھ گِفٹ بھی دے جاتے ہیں.....پاگل۔''

باہر جیسے ہوا کا شور رُک گیا۔ بند کھڑکی سے بادلوں کے ٹکڑے، جیسے 'کُہر ا' بن کر کمرے میں سمٹ آئے۔ گھُپ اندھیرا۔نمی کی پتلی سی چادر۔ پھر جیسے دھیرے سے چادر ہٹی۔اندھیرا ختم ہوا۔بادل کھڑکی سے باہر لوٹ گئے۔وہ فکرمند تھا ـــــ کیسی لڑکی ہے۔نام بھی اپنا نہیں ـــــ لباس بھی نہیں ـــــ شہر بھی نہیں.....

باہر جیسے ڈرم پیٹے جا رہے ہوں۔

وہ یکا یک چونک پڑا تھا۔لڑکی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔پھر یکا یک اُٹھ کر بیٹھ گئی۔اب وہ اس کی آنکھوں میں کچھ پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

ہوا پھر سے تیز ہوگئی تھی.....وہ..بستر پر دوبارہ لیٹ گئی تھی.....اُس کے ہاتھ بارش بن گئے تھے.....اپنے ہی جسم پر مچلتے ہوئے ـــــ

'ہوا تیز ہے.....ہے.....نا.....'

'ہاں.....'

اُس نے ایک جھٹکے سے جینس ہوا میں اُڑا دی.....

'کھڑکی کے پٹ ڈول رہے ہیں.....'

'ہاں.....'

سفید ٹی شرٹ، اس کے مخملی بدن سے الگ ہو چکی تھی۔ وہ سر سے پاؤں تک آگ تھی۔ نہیں جل مچھلی..... نہیں جل مچھلی نہیں..... فرانس کی شنگو رافش کے بارے میں اُس نے سنا تھا ـــــ ایک پانی میں تیرنے والی عورت ـــــ بستر جیسے ہوا میں اُڑ رہا تھا..... ایک بے حد حسین چہرہ۔ لمبی گردن۔ قلوپطرہ کی طرح، تنا ہوا حسین، گٹھا ہوا جسم ـــــ جیسے کمان سے تیر چھوٹنے بھر کی دیر ہو۔ دو ننگے پاؤں ـــــ جیسے پانی میں لہراتی دو ننگی حسین ڈالیاں.....

گفتگو کا سناٹا، اُس کے حسین مچلتے جسم نے توڑ دیا تھا..... وہ کانپ رہا تھا۔ جذبات کی تپش میں..... بہتے سیلاب میں ـــــ ٹھنڈے پانی اور گرم آگ میں..... وہ اُڑ رہا تھا..... نہیں بہہ رہا تھا ـــــ یہ لڑکی۔ نہیں ویشیا۔ نام بھی نہیں۔ شہر بھی نہیں۔ لباس بھی نہیں..... مگر یہ حسین جسم..... یہ حسین چہرہ.....

سمندر میں چھلانگ لگانے سے پہلے وہ اُسے خوش کرنا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا۔ لڑکی اُس کے سوالوں سے بوجھل ہو گئی ہے۔ مگر اب آخری سوال ـــــ آخری ہتھیار..... بستر پر آگ کا دریا بہہ رہا تھا..... اُس نے آگ کے دریا کو مدہوش ہوتی آنکھوں سے دیکھا۔ آنکھوں میں خمار چھا گیا۔ ہونٹ گول ہو گئے۔ وہ ایک بار پھر رومانی تھا۔

''یہ..... تمہارا چہرہ..... تمہارا جسم..... تم یقین کرو گی۔ وسو..... یا جو بھی تمہارا نام ہو..... تم یقین.....'

''یہ جسم میرا نہیں ہے، یہ چہرہ میرا نہیں ہے.....' وہ کسی روبوٹ کی طرح اپنا پرس

کھول رہی تھی —— ہاں ۔چونکومت ۔اس میں کچھ بھی چونکنے جیسا نہیں ہے……''

وہ ایک لمحہ کو رکی ——

باہر طوفان یکا یک تیز ہو گیا تھا۔کھڑکی کے پٹ تیز تیز بجنے لگے تھے —— جیسے ابھی ہوا کا زور، پوری طاقت سے کھڑکی کے پٹ توڑ ڈالے گا۔وہ کہہ رہی تھی……

'سنو…… اس میں کچھ بھی نیا نہیں ہے۔ یہ چہرہ، یہاں تک —— ماں بتاتی تھی —— اس کا ہے —— یہاں…… یہاں سے یہاں تک یہ والا حصہ میرے باپ کا…… ماں میری ہاتھ کی انگلیوں کے بارے میں بتاتی تھی کہ…… ماں کہتی تھی پیر تو بالکل اس کے جیسے……اور یہ حصہ…… ماں کہتی تھی…… ماں کا ایک بوائے فرینڈ تھا……''

تیز ہوا سے کھڑکی کی سٹکنی ٹوٹ کر گر گئی تھی ۔وہ بچوں کی طرح تالیاں بجا رہی تھی —— ہا…… ہا…… یہاں بھی تم ہار گئے……'

بچوں کی طرح پرس میں ہاتھ ڈال کر اس نے کنڈوم نکال لیا تھا ——

''یہ میرا ہے۔اسے میں ساتھ لے کر چلتی ہوں……''

وہ بچوں کی طرح 'کنڈوم' کو پھونکنے، پھلانے کی کوشش کر رہی تھی —— کمرے میں یکا یک طوفان بڑھ گیا تھا۔

○○○

بھنور میں ایلس

(۱)

ادھر آنکھیں بوجھل ہوئیں، ادھر خواب کے در کھل گئے..... پھر جیسے کسی نے انتہائی معصومیت سے صدا لگائی ہو..... ''ایلس آنکھیں کھولو..... آنکھیں کھولو نا ایلس.....''

''جاؤ نہیں کھولتی۔ ابھی مزے مزے کے سپنے جو دیکھ رہی ہوں..... آنکھیں کھلیں تو سپنا ہٹ ٹوٹ جائے گا.....''

آواز پھر گونجی۔ ''اچھا خیر چھوڑو، یہ بتا، سپنے میں کیا دیکھ رہی تھی.....؟''

''میں نے دیکھا کہ..... ایلس کہتے کہتے ٹھہر گئی..... نہیں پہلے تم بتاؤ..... لوگ مرنے سے گھبراتے کیوں ہیں؟''

''مرجانا ایک بھیانک ڈراونے خواب کی طرح ہے۔ جہاں آنکھیں بند ہوتے ہی ہم سب سے دور چلے جاتے ہیں۔ وہاں آسمان پر ٹمٹماتے تاروں کی طرح..... خود کو نہیں پانے، کھوج نہیں پانے اور ہمیشہ کے لئے کہیں گم ہو جانے کا احساس..... نہیں ایلس۔ تم نے بے وجہ مغالطے میں ڈال دیا ہے۔ ہنس مت پگلی، بتاؤ نا، خواب میں کیا دیکھا؟''

''بتاؤں گی تو ہنسنے لگو گی۔ میں نے دیکھا کہ میں مرگئی ہوں..... اور وہاں..... آسمان پر جو تارہ چمک رہا ہے نا وہ میں ہوں..... اچھا بتاؤ..... رات میں آسمان پر چمکنے والے تارے کتنے بھلے اور سندر لگتے ہیں..... اچھا سمجھ لو ہم مر گئے ہیں اور مر کر وہاں آسمان میں گل بوٹوں کی طرح چپک گئے ہیں۔ اس تارے کی طرح..... تو اس میں گھبرانے کی بات کیا ہے؟''

''گھبرانے کی بات کیسے نہیں ایلس..... ہم اکیلے تھوڑے ہی ہوتے ہیں، ایک خاندان ہوتا ہے اور خاندان سے بچھڑ کر آنکھیں موند لینا..... ایک دم سے ہنستی

مسکراتی جیتی جاگتی دنیا سے کٹ کر گم ہو جانا..... ہوا میں تحلیل ہو جانا..... اب جیسے تم ہی سوچ کر دیکھو نا ایلس..... تمہارے شوہر ہیں، تمہاری ایک لڑکی ہے۔ اسکول سے آنے میں ذرا سی دیر ہوئی تو کیسے بوکھلا جاتی ہو تم؟ بوکھلا جاتی ہو نا..... اب ذرا سو چو..... آنکھیں بند ہو گئیں تو..... ان سب کی خیر خبر کون لے گا.....؟''

''کون لے گا؟..... ایلس ہنستی ہے..... ارے تب اپنی خیر خبر یہ خود لیں گے..... اس میں گھبرانے کی بات کیا ہے۔ ذمہ داری سب سکھا دیتی ہے۔ ہاں تم نیپو چھا نہیں..... میں نے کیا خواب دیکھا..... میں نے دیکھا کہ..... نہیں ڈرو مت..... اپڈیش مت دو۔ مرنا سب کو ہے۔ ہم امر بیل کھا کر تھوڑا ہی آئے ہیں جو ہمیشہ زندہ رہیں گے..... ہاں تو میں نے دیکھا کہ..... اب کیا بتاؤں..... ایسی روشنی..... چکا چوند روشنی..... دودھ کی نہریں..... سیب کے باغات..... مخمل و کم خواب میں لپٹے حسین خوبصورت چہرے..... میں نے دیکھا..... ندی کی لہروں کی طرح ان میں سے ایک میں بھی ہوں..... خوب سفید براق لباس میں..... اور ہوا کی طرح..... لہروں کی طرح میں ان کے درمیان تیر رہی ہوں..... میں نے دیکھا کہ میرا جسم بالکل ایسا ہی ہے جیسے ابھی ابھی ہے۔ نہیں اس سے بھی کچھ ہلکا ہو گیا..... جیسا کہ کالج کے دنوں میں تھا..... اور میں ان دنوں سے زیادہ سندر اور پریوں جیسی ہو گئی ہوں..... اور میں نے پایا کہ..... جسم کے باقی اعضا اپنی جگہوں پر ہیں..... مگر ایک شئے نہیں ہے..... دماغ والی جگہ خالی ہے، جیسے مرنے کے بعد نکال لیا گیا ہو..... یا صاف کر دیا گیا ہو..... اس لئے میں صرف تیر رہی ہوں۔ تیر رہی ہوں..... بس تیر رہی ہوں..... یوں کہ سوچ نہیں پا رہی ہوں کسی کے بارے میں بھی..... اچھا چھوڑ..... سپنے کی باقی باتیں رہنے دے..... یہ بتا نا، لوگ مرنے سے گھبراتے کیوں ہیں؟''

لیٹے لیٹے کتاب پڑھتے ایلس کی اچانک آنکھ لگ گئی تھی۔ کتاب ہاتھ سے چھوٹ کر سینے پر آ گئی ـــــ لاشعور طور پر دایاں ہاتھ سینے پر چلا گیا..... جلتے ہوئے پھوڑوں کی جگہ..... جیسے کسی نے کباب لگانے والی تیخ اچانک اس کے سینے میں اتار دی ہو۔ ''تھلے'' کی مڑیتڑی چمڑی میں اٹھن پڑ گئی ہو ـــــ کہتے ہیں سینے پر ہاتھ آ جائے تو ڈراونا خواب آ جاتا ہے ـــــ مگر ڈراونا کہاں..... وہ تو جیسے خواب جزیروں کی نا آفریدہ وادیوں کی سیر میں گم تھی..... ہاں نیند اس وقت ٹوٹی جب اشرف کے مکڑے کی طرح رینگتے ہوئے ہاتھ اس کے کندھے تک آ کر ٹھہر گئے۔ اس نے دونوں آنکھیں بند کر کے اشرف کے چہرے کو پڑھنا چاہا۔ پھر مزہ لینے کے لئے ایک آنکھ ذرا سی کھول دی۔

اشرف کے تھرتھراتے ہاتھوں نے کتاب اٹھالی.....

''ایلس، سوئی ہو کیا.....؟''

وہ شرارت سے دونوں آنکھیں کھول کر مسکرا پڑی..... ''نہیں تو ـــــ ہاں، ہلکی سی نیند لگ گئی تھی۔''

''کتاب پڑھ رہی تھی؟''

وہ تیزی سے بچوں کی طرح اٹھ کر بیٹھ گئی ـــــ

اشرف نے اطمینان کی سانس لیا۔ پھر کتاب کی طرف دیکھا..... 'روشو مین! یہ پڑھ رہی تھی؟''

''ہاں.....'' وہ علی الصباح، سناٹے کو توڑنے والی..... اور نیند سے بوجھل ہو رہے لوگوں کو جگانے والی..... چڑیا کی طرح چہچہائی ـــــ ''جاپانی ناول ہے۔ میں اب تک سمجھتی تھی کہ یہ جاپانی کمبخت ایجادوں کے سوا اور کچھ جانتے ہی نہیں۔ چھوٹے ٹھگنے قد والے، ان کے دماغ میں دنیا کو جنت بنانے والے سپنے ہی بستے ہوں

گے..... مگر دیکھو نا، کتنی عمدہ کہانی ہے.....''

اشرف نے غور سے اس کے چہرے کو پڑھا ـــــ کہا کچھ نہیں۔

ایلس نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔ جاپان کی قدیم راجدھانی کیوتو کا عظیم الشان گیٹ روشومین وقت کے ساتھ کھنڈر بن چکا ہے۔ وہاں لاوارث لاشوں کا پایا جانا بہت معمولی بات ہے..... کیوتو شہر قدرتی آفات کی زد میں آ گیا۔ ادھر سمورائی کے گھر سے نکالے جانے والا ایک بے بس نوکر ہے جس کے لئے سب سے ضروری شئے ہے؟ اس کا زندہ رہنا۔ نیکی اور بدی سے اوپر اس نوکر کے ساتھ حقیقت صرف اتنی سی تھی..... زندہ رہنا اور سوزاکو کے کسی دیوار کے سامنے دم توڑنا..... اور اچانک روشومین کے ہولناک کھنڈر میں وہ ایک بوڑھی عورت کو دیکھتا ہے جو لاشوں کے سر کے بال اتار رہی تھی۔ نوکر خوفزدہ ہو کر اصلیت پوچھتا ہے..... تو معلوم..... بوڑھی عورت نے کیا جواب دیا..... اس نے کہا..... میں لاشوں کے سر کے بال اتارتی ہوں، اور ان کی ٹوپیاں بنا کر بیچتی ہوں۔''

''غلط تو میں بھی ہوں۔ مگر تمہاری طرح ذلالت بھرے کام تو نہیں کرتا، نوکر نے پوچھا، تمہیں ایسا کرتے ہوئے شرم نہیں آتی؟''

بڑھیا نے کہا: ''ہو سکتا ہے یہ کام تمہارے نزدیک ذلت بھرا ہو..... مگر بھائی جس عورت کی لاش سے یہ بال میں نے اکھاڑے ہیں کیا وہ مجھ سے بھلی تھی؟ بولو، مجھ سے بھلی تھی وہ؟ نہیں جواب دے سکتے پھر؟ مجھے ایک بُری اور مردہ عورت کے سر کے بال اتارنے کا حق کیوں نہیں؟''

ایلس نے اشرف سے کہا۔ جانتے ہو، اس پر سوزاکو کے یہاں سے نکالے گئے چور نے کیا کہا۔ اس نے کہا..... بھولی بڑھیا! یہ اچھی بات ہے۔ گویا زندہ رہنے کے لئے دوسرے کا لٹنا بھی ضرور ہے۔ سو اگر میں تمہیں لوٹ لوں تو یہ بھی کہیں سے غلط نہیں ہوگا کیونکہ اس کے عوض میں اپنی دوزخ شانت کروں گا اور زندہ ہوں گا۔''

ایلس کی آنکھوں میں تجسس کی موجیں تھی..... اشرف، لوگ زندہ کیوں رہنا چاہتے ہیں، ممکن ہے موت زندگی سے کہیں زیادہ خوبصورت ہو.....''

''پھر وہی موت، اشرف زور سے چیخا۔ کسی نے کہہ دیا کہ تم مرنے والی ہو؟''

''اشرف..... اس نے جیسے آنکھوں کے رستے پلاش کے پھول بچھا دیئے ہوں..... ''غصہ کیوں کرتے ہو..... موت حقیقت ہے تو اس سے بھاگتے کیوں ہو..... میں ہوا میں تحلیل ہوگئی تو زمانہ کی چال نہیں رک جائے گی یہ ایسے ہی اس وقت بھی قائم رہے گی جیسے ابھی ہے جیسے اس سے پہلے..... جیسے اس وقت تم ہو.....''

وہ اپنی دھن میں کہے جارہی تھی..... ''ایک کھنڈر ٹوٹتا ہے اس پر دوبارہ ایک نئی عمارت تعمیر ہوجاتی ہے..... پھر؟ ایک شناخت مٹتی ہے نئی شناخت بنتی ہے ـــــ ہم گم ہوجاتے ہیں..... ہم سے بھی اچھے لوگ اس دنیا میں آجاتے ہیں..... کوئی کسی پر مسلط، حاوی یا ٹکا نہیں ہے۔ سب اپنی ضرورت ہیں..... جیسے وہ لاشوں سے بال اکھاڑ کر ٹوپیاں بناتی ہوئی بڑھیا! روشومین کے کھنڈر میں بڑھیا کو لوٹ کر اپنے زندہ رہنے کا سامان کرنے والا سوزاکو کا نوکر.....''

پھر وہ تیز آواز میں بولی۔ ''میں کھو جاؤں گی تب بھی یہ کارخانہ ایسے ہی چلتا رہے گا، اشرف..... سمجھے!''

وہ ہنسی تو ایک کھنک دار ہنسی کمرے میں گونجتی چلی گئی۔ لیکن اس ہنسی میں کہیں کوئی درد انگیز کیفیت نہ تھی۔ ایک بے باک سی بیگانہ روش تھی جو ہمیشہ سے ایلس کے مزاج کا ایک حصہ رہی تھی۔

(۲)

کچھ سال پہلے کی بات ہے.....

بس کچھ سال..... اور کچھ سال میں بہار دروازہ تک آتے آتے ٹھہر گئی تھی۔ سیڑھیاں چڑھتے ہی دائیں طرف ایلس کا کمرہ تھا۔ کمرے کے ٹھیک باہر جنگل

ساتھا۔کھڑکی کھول کر وہ گھنٹوں فرصت کے اوقات ہری بھری وادیوں کو دیکھتی رہتی۔اشرف دفتر چلے جاتے تھے اور شاہانہ اسکول......وہ گھر پر ہوتی تو خالی وقت میں ساتھی یا تو کتابیں ہوتیں یا قدرت کے یہ گل بوتے......

تب کڑاکے کی ٹھنڈی کم ہونے لگی تھی۔آموں میں بور آنے لگے تھے۔کوئل کی کوک سنائی دینے لگی تھی۔سامنے جلتے انگاروں جیسے، پھولوں سے لدے پلاش کے پیڑ تھے۔پیڑوں کے بارے میں جاننا اور پہچاننا اسے اچھا لگتا تھا۔وہ ہاتھ کے اشارے سے بتاسکتی تھی......کہ یہ ڈھاک ہے......یہ ٹیسو، یہ کھاکھر......چھیولا......

اور یہ پلاش......بیوٹیما مونوسپرما یعنی فلیم آف دی فاریسٹ Flame of the forest

پلاش کے پھول......بچپن میں ان سے رنگ گندھا کرتی تھی وہ......پانی میں گھول کر کتنے کتنے رنگ چرالیتی تھی۔

ہوا تیز تیز چل رہی تھی۔پلاش کے سرخ پھول ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے۔پھر کوئی تیز ہوا آئی۔سردی ہوا اسے چھوتی ہوئی گزر گئی۔اس نے دروازہ بند کیا۔کچھ دیر تک وہیں پر، برف سی جمیکھوری رہی......یہ سینے کے پاس اینٹھن کیسی ہے؟ چمڑی کے اندر اندر اتر جانے والی اینٹھن؟

رات میں شاہانہ سوگئی تو بے اختیار ہو رہے، اشرف کے، بدن پر مکڑے کی طرح رینگتے ہاتھوں کو اس نے چھاتی کے گڈھوں پر لاکر ٹھہرادیا......یہاں چھوؤ تو ذرا......یہاں......دیکھو''

''ہاں......کیا ہے؟''

''کچھ محسوس ہوا......؟''

''نہیں تو......؟''

''نہیں تو.....؟''

''کچھ جلن سی ہے..... دیکھو نا یہاں کچھ ابھر رہا ہے.....''

اشرف کے ہاتھوں کی آوارگی میں جیسے خلل پڑ گیا۔ وہ چونک پڑا۔ رات کے اندھیرے میں مکڑے سے سانپ بنتے ہاتھ اچانک خرگوش جیسے نرم اور خوفزدہ ہو گئے۔ ''ہاں ہے تو..... کچھ کچھ..... ابھرا سا..... ڈاکٹر کو دکھالینا۔ اب سو جاؤ۔''

اسی کے ساتھ وہ کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔ ابھی کچھ دیر پہلے تک کیسا اتاؤلا ہو رہا تھا۔ اور ابھی اچانک..... اس کے ہونٹوں پر ایک شرارت بھری مسکان اتر گئی۔ خود غرض، مطلبی..... وہ بچوں کی طرح ہنسی..... لیٹ تو گئی مگر ہوا سے گرتے پلاش کے پھول نظروں میں گھومتے رہے..... اس سے ذہن گھومتا تو پھر وہیں چلا جاتا..... یہاں چھاتی میں اندر کا گوشت کوئی ایسے گھوڑ موڑ رہا ہے، جیسے دودھ کو اسٹیل کے برتن میں رکھ کر فریج کے Chiller میں رکھ دیا جائے تو.....؟ کیسے ایک دم سے سوکھ کر برف ہو جاتا ہے..... اور اوپر اوپر برف کی تہہ جم جاتی ہے۔ ٹھیک ایسے ہی..... چھاتی میں جمے دودھ اور خون کو کوئی چور مچور کر، نچوڑ کر، برف کی جھلیاں بنا کر پیس رہا ہو..... اندر تک پورا بدن کنکنا رہا تھا.....

ایلس کمرے میں آ گئی۔ کمرے میں سوئی ہوئی شاہانہ کو ہولے سے چھوا۔ شاہانہ نیند میں بے خبر تھی۔ ایک دو بار مداخلت بُری لگنے کے انداز میں چونکی پھر کروٹ بدل کر نیند میں کھو گئی۔ ایلس نے شاہانہ کے بے حد معصوم شگفتہ لبوں پر انگلی پھرائی۔ یہاں سے ہو کر بیسن کے پاس لگے آئینہ کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

بلب روشن کیا پھر دھیرے سے نائیٹی کا، آگے کا ہوک کھولا۔ دو بھڑکتے شعلے نائیٹی سے باہر چھلچھلا پڑے اس نے چھاتیوں پر ہاتھ پھیرا..... یہاں.....

مگر چھاتیاں ویسی ہی روشن تھیں۔ ویسی ہی بھری ہوئی اور کسی کنواری لڑکی کے لپستان کی طرح کٹھور..... شاہانہ دس برس کی ہو گئی اس نے ان دس برسوں میں اپنا

فیگر کتنا مین ٹین کر کے رکھا تھا۔ ایک بار پھر پستان کو چھو کر مطمئن ہو جانا چاہا مگر..... چھاتیوں میں پڑی کوئی گرہ اس کے ذہن پر بھی پڑ گئی تھی۔

ایک لمحے کو گھبرا کر، آئینہ میں اپنا خوفزدہ چہرہ دیکھا اس نے۔

''ایلس! کیا تم خوفزدہ ہو؟''

''بولو ایلس! کیا اس لئے کہ ایک دن گم ہو جاؤ گی تم.....''

''ہاں، ابھی عمر ہی کیا ہے صرف 35 سال مگر 35 سال کی عمر بھی تو کوئی کم نہیں ہوتی۔ مان لو اگر گم ہو گئی تو.....؟ کیا اسی لئے خوفزدہ ہو..... وہاں، کمرے میں اشرف ہوئے ہیں۔ ایک بہت ہی پیار کرنے والے شوہر..... بچوں کی طرح غیر ذمہ دار اور بے ترتیب..... اور ننھی سی شاہانہ..... تم سوچتی ہو۔ سب تمہارے سہارے زندہ ہیں؟''

ایلس نے نائیٹی کا ہک بند کیا..... کوئی کسی کے سہارے زندہ نہیں ہے ایلس..... بس زندہ رہنے کا عمل ہے یہ کہ اصول، قاعدے اور ضابطے کی ایک دیوار اٹھ جاتی ہے..... اور اس دیوار کے اندر ہی زندگی تلاش کرنی پڑتی ہے..... یہ دیوار ٹوٹ بھی گئی تو، کہیں کوئی فرق نہیں پڑے گا ایلس.....''

وہ دھیرے سے مسکرائی..... ابو ہ پوری طرح مطمئن تھی..... ایک بار پھر اس نے اپنے سراپا کو غور سے دیکھا..... اور کچھ گنگناتی ہوئی کمرے میں آ گئی۔

اس رات ایلس صبح دیر تک گھوڑے بیچ کر سوتی رہی۔ آرام کی نیند.....

(۳)

کچھ ہی دنوں میں مسز گروور اس کی دوست بن گئیں۔ مسز گروور وہی عورت ہیں، جن سے اس کا علاج چل رہا تھا ـــــ سبک اور متین لہجہ..... آنکھوں میں مادرانہ شفقت کی بو باس..... ہونٹوں میں نرمی اور مٹھاس..... بھرے بدن کی ادھیڑ عمر کی

عورت۔ بالوں میں سفیدی جھانکنے لگی تھی۔ چہرے سے گھریلو دکھنے کے باوجود کافی باوقار لگتی تھیں گرووَر......

تین چار چھوٹی چھوٹی ملاقات کے بعد ہی مسز گرووَر نے دھماکہ کیا تھا۔

''......ایلس کنگو جرا اور تل چٹا دیکھ کر تمہیں ڈر تو نہیں لگتا؟''

''......نہیں تو مگر کیوں؟''

''......میں ایک انکشاف کرنے جا رہی ہوں۔ انکشاف ہمیشہ چونکانے والا ہوتا ہے ـــــ ہوسکتا ہے میرا شک ہو......''

''آپ کہیں تو سہی وہ نہی تھی۔ میں دل برداشتہ تب بھی نہیں ہوئی تھی جب شاپن ہار کو اس کی تخلیق میں شکست خوردہ محسوس کیا تھا۔ لوگ اتنے نراشوادی کیوں ہوتے ہیں او شاپن ہار جیسا آدمی؟ اور مونٹا نجین جیسا شخص خودکشی کے بارے میں دلیلیں دے دے کر اس کو صحیح ثابت کرتا ہے۔ کمزور اور بزدل۔ میں اس Spiritual Pessimism پر یقین نہیں رکھتی۔

''Spiritual Pessimism''......مسز گرووَر زور سے ہنسیں۔ اسی لئے تم سے باتیں کرتے ہوئے مزہ آتا ہے ایلس۔ ناامیدی میں بھی موہوم سی ہی سہی مگر امید کی کرن ہوتی ہے۔ اچھا بتاؤ تو سہی۔ اگر میں انکشاف کروں کہ تمہیں بریسٹ کینسر ہے تو......''

وہ جیسے اچانک ایک پل کو برفانی بارش میں نہا گئی۔ حلق میں کچھ الفاظ اٹک سے گئے۔ آنکھوں میں سراسیمگی تیر گئی۔ اس نے خود کو نارمل بنانے کی کوشش کی۔

''کیا یہ صحیح ہے مسز گرووَر؟''

''میرا شک بھی ہوسکتا ہے......اور بھگوان کرے میرا شک ہو۔ تمہارے عمر کی کی عورتوں کو ہمیشہ اس جانب سے فکرمند رہنا چاہئے۔ اگر سینے میں گانٹھ سوجن ہو چھاتی یا آس پاس کی چمڑی دھنس گئی ہو۔ پستان سے پانی رستا ہو۔ ان باتوں پر یوں غور

کرو کہ یہ موضوع بھی تمہارے ہاتھ میں دبی کسی دلچسپ کتاب کی طرح ہے۔تو کیا تم اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کی کوشش نہیں کرو گی..... اگر ہے بھی..... بھگوان نہ کرے..... تو کوئی غم مت رکھنا..... انسانی جسم امراض کا گھر ہے۔ کیوں ایلس تم گھبرا تو نہیں گئی.....؟''

ایلس دونوں ہونٹ آپس میں بھینچتے ہوئے مسکرائی۔مسز گروور..... میں بالکل نہیں ڈری۔ مجھے اچانک کچھ یاد آ گیا۔ وہ جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ الگزینڈر رسولزے نیٹسن..... یہ نام یاد ہے نا آپ کو۔آپ نے اس کی کینسر وارڈ پڑھی ہو گی۔ مجھے بس وہ عورت یاد آ گئی۔یاد ہے نا جو اچانک اپنا سینہ کھول کر اپنے بوائے فرینڈ کے سامین جذباتی ہو گئی تھی۔Suck it..... اسے منہ میں لے لو۔چوسو! اس کا یقین کرو یہ دہکتا ہوا انگارہ۔اس کا یقین کروا بھی یہ اس جگہ ہے اور گواہ رہنا کہ یہ اس جگہ موجود تھا۔کل یہ آپریشن کے بعد کسی گٹر یا ڈسٹ بن میں پھینک دیا جائے گا..... مگر گواہ رہنا یہ اس جگہ موجود تھا..... اپنی تمام تر شعلہ سامانیوں کے ساتھ..... یہ دہکتا ہوا انگارہ.....''

اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے.....

مسز گروور نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔''ایلس! کیا تم ڈر گئی ہو؟''

''نہیں تو..... آنسو پونچھتے ہوئے وہ پھر مچل گئی۔''ہولناک مسز گروور۔انتہائی ہولناک۔ میں کینسر وارڈ کی حقیقت میں گم ہو گئی تھی ـــــ مسز گروور آپ قطعی پریشان نہ ہوں ـــــ کردار کی حقیقت نگاری نے مجھے کچھ دیر کے لئے گمراہ کر دیا تھا۔''

(۴)

اس انکشاف کے بعد گھر میں اچھا خاصا زلزلہ آ گیا تھا۔اسے لگا ہر کوئی اس سے

نظریں چرانے کی کوشش کر رہا ہے۔ کئی کئی رات اس نے اشرفلو پاگلوں کی طرح بستر پر کروٹیں بدلتے ہوئے بھی پایا۔ کئی بار اندھیرے میں اس نے محسوس کیا کہ اشرف آنکھوں میں سمٹ آئے آنسوؤں کو پونچھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اسے دیکھتا پا کر مسکرانے کی کوشش میں وہ اور بوجھل ہو جاتا ـــــ وہ دیکھ رہی تھی، شاہانہ کے چہرے پر غم کی کالی کالی بدلیاں تیر گئی ہیں ـــــ شاید وہ بھی اس انکشاف کے پردے میں بہت کچھ جان گئی ہے کہ ایک حقیقت جیسی شئے، ماں جیسی شفقت کا سایہ ہولے سے ایک دن آنگن کی دھوپ کی طرح گم ہو جائے گا۔

صبح میں اگر وہ دیر سے اٹھتی تو دیکھتی کہ اشرف نے اپنے سارے کام خود ہی انجام دے دیئے ہیں۔ شاہانہ کو اسکول کے لئے تیار کرنا، بریک فاسٹ کے لئے ٹوسٹ اور آملیٹ کا ریڈی میڈ ناشتہ تیار کرنا، کپڑے دھونا، استری کرنا، دھوبی دودھ والے کا حساب رکھنا..... اسے لگا، وہ کہیں سے چھوٹ تو نہیں رہی ہے..... وہ کچھ کرنا بھی چاہتی تو اشرف نظریں چراتا ہوا اس کے سامنے چھا جاتا.....

''ریلیکس ایلس۔ کبھی کبھار آرام بھی تو کر لیا کرو۔''

''اب آرام ہی تو کرنے جا رہا ہوں ہمیشہ کے لئے.....''

وہ چاہتی تھی، اشرف اس جملے ہمیشہ کی طرح Wit محسوس کرے مگر اشرف اچانک ہی غمگین ہو اٹھتا، آنکھیں بھر آجاتیں تو وہ نظریں پھیر لیتا۔ زیادہ جذباتی ہو جاتا تو اس کو بانہوں میں بھینچ لیتا۔ پاگلوں کی طرح..... ''تمہیں کچھ نہیں ہوگا ایلس! کچھ نہیں ہوگا.....''

ایک معمولی سی سرکاری نوکری جس کی امید میں آنکھیں جیسے مستقبل کی زمین میں دفن قارون کا خزانہ دیکھنے کی سعی کر رہی ہوتیں..... زندہ رہنے اور مطمئن کر دینے کے احساس سے زیادہ کا ''اتاولا پن'' اسے بے چین بنا دیتا۔ وہ محسوس کرتی۔ سرد

وگرم موسموں کی تمازت جذب کرتا ہوا اشرف اب بکھر سا رہا ہو......وہ محسوس کرتی تو کھلی کتاب کی طرح اس کی آنکھوں میں اتر جاتی پھر جھانکنے اور پڑھنے لگتی......

''میں نے کبھی تم سے کچھ زیادہ کی مانگ تو نہیں کی......''

''کبھی خود کو تم پر مسلط تو نہیں کیا؟''

''نہیں......''

''میں گرم ہوا کی طرح تم پر بار تو نہیں رہی۔ میں نے اتنا ہی چاہا نا، جتنا خود کو چاک کر کے چاہ سکتی تھی۔ پھر پاگل کیوں بنتے ہو، خوفزدہ کیوں رہتے ہو؟ مر جاؤں گی تب بھی کچھ نہیں بدلے گا۔ سب ایسا ہی رہے گا۔''

''وہ اشرف کی سانس سانس میں اتر کر کہتی......''ممی ڈیڈی گزر گئے۔ جب زندہ تھے تب ان کی ہلکی سی آہ کراہ اٹھتی تھی، لرز جاتی تھی......اور سوچتی تھی، دعا مانگتی تھی کہ اللہ میاں انہیں ہمیشہ زندہ رکھیو۔ وہ گزر گئے تو اب گزر جانے کے سوا کوئی سا بھی احساس باقی نہیں ہے۔ آنکھیں کھلنے تک جذبات جسم سے روح کی طرح چمٹے ہوتے ہیں......بس......ڈونٹ بی ایموشنل۔''

''اس نے دیکھا، اشرف نے ایک جھٹکے سے ہاتھ چھڑا لیا۔ کرسی پر دھم سے بیٹھ گیا۔ کچھ اور نہیں ہوا تو بلند آواز میں رونے لگے۔

وہ جھکی ——''Spiritual Pessimism......مجھے معلوم ہوتا کہ تم شاپن ہار میں سے ہو تو میں کبھی تم سے شادی نہیں کرتی......''

(۵)

اندھیرے کمرے میں جب کوئی نہیں ہوتا تو ایلس دیر تک خلاء میں اپنے سوالوں کا جواب تلاش کرتی رہتی۔ کیا سچ مچ وہ ایک دن گم ہو جائے گی؟ یوں غبارے سے نکلی ہوا کی طرح......پھر کہاں جائے گی...... اسے لگتا کہ کوئی اس کے قریب کھڑا ہے......یہاں اس قبر میں لوسی سو رہی ہے۔ تم بھی سو جاؤ گی۔

وہ چونک کے اٹھتی ہے۔ پھر تالستائے کے ایوان ایلچ کے بارے میں سوچتی ہے۔ ایوان ایلچ مر گیا ہے ـــــ کمرے میں اس کا جنازہ رکھا ہے۔ سوگوار گم سم کھڑے ہیں۔ حالانکہ ماحول ہی کچھ ایسا ہے مگر سب سوگوار ہونے کا ناٹک کر رہے ہیں۔ ایوان کے دوست رشتے دار یہاں تک کہ اس کی بیوی ..... سب آخری رسوم کے جلد سے جلد فارغ ہونے کے انتظار میں ہیں۔ انتشار اور اضطراب سے الگ ایک ابدی سکون۔

وہ ٹھہری ..... روح سب سے پہلے بدن سے، اپنا رشتہ کہاں سے منقطع کرتی ہے وہ آہستہ سے جانگھوں پر سے ساڑی ہٹاتی ہے۔ کمرے میں در آئی تیز ہوا کھڑکی کے پردے، جھٹکا کر اس کے پوشیدہ مقام، سے ہوتی ہوئی چپکے سے گزر جاتی ہے۔ یہاں سے ..... ممکن ہے، یہیں سے عورت اپنے خالق کہلانے کا درجہ حاصل کرتی ہو۔ یہیں سے تسکین کے سوتے پھوٹتے ہوں اور عجب کیا کہ روح کی نجات بھی یہیں سے ہوتی ہو!

پیروں کو عریاں کئے۔ وہ دھیرے دھیرے ہاتھ پھیرتی ہوئی اس مقام کی ''سنکری'' گلیوں تک آ کر ٹھہر جاتی ہے۔

(۶)

وقت ہوا کے جھونکے کی طرح اڑا اور ایلس کسی کمزور عمارت کی طرح ڈھ گئی۔ پہلے وہ سوچتی تھی۔ لوگ موت Enjoy کیوں نہیں کرتے۔ ایک انجانی سی منزل؟ جس کو کسی نے بھی نہیں دیکھا۔ ایک انجانی سی دنیا جس کی دریافت کسی نے بھی نہیں کی ..... وہ چاہے جنت ہو یا دوزخیا محض تصور ہو ..... موت اس کے لئے کسی چکاچوند گلیمر کی طرح تھی مگر دھیرے دھیرے تکلیف کی شدت نے اسے تنکا تنکا کھوکھلا کرنا شروع کر دیا تھا۔

جیسے نالے کا منہ کھل گیا ہو ..... چھاتی کا ناسور اور اس سے رسنے والا مواد .....

جیسے اندر سے، تھلے کو کوئی شئے چھوڑ ہی رہی..... پہلے آئینہ کے سامنے نائٹی کا ہک کھولتے ہی جو شئے آنکھوں میں سب سے زیادہ جگمگاتی تھی اب اس سے گھن اٹھ رہی تھی۔

ہاں وہ تھک گئی ہے ـــــ اٹھنے سے چکر آنے لگتے ہیں۔

شاہانہ اس کے پاس آ کر پتھر کی مورت کی طرح ٹکر ٹکر اس کا چہرہ تکتی ہے اور کسی بڑے سمجھدار آدمی کی طرح کہتی ہے۔ ''ممی! اب مجھے اکیلے کمرے میں ڈر نہیں لگتا میں خود سے کنگھی بھی کر لیتی ہوں۔ مجھے سارے کام آتے ہیں۔ ممی.....''

اشرف اس سے نظر بچانے کی کوشش کرتے ہیں..... جیسے اس کے بکھرتے وجود میں دن، مہینے اور برس گن رہے ہوں۔ کبھی کبھی کمرے میں پاگلوں کی طرح ٹہلنے لگتے ہیں۔

جبراً وہ مسکرانے کی کوشش میں صدا لگاتی ہے..... ''اشرف، گھبراتے کیوں ہو..... کسی اور کو لے آنا.....'' وہ ہنستی ہے۔ ''ذرا سوچو، شاہانہ کی پیدائش کے دو سال بعد سے میں تمہارے لئے کیا رہ گئی ہوں۔ ایک ایسی ضرورت جو تم میرے سوا بھی پوری کر سکتے ہو۔ کسی سے بھی ـــــ بس اسی ضرورت کے لئے میں یاد آؤں گی۔'' وہ زور سے ہنسی..... ''یو انڈین! اتنا پڑھ لکھ کر بھی تم لوگ دیا نوسیت کے خول میں کیوں بند رہتے ہو؟''

پھر اس نے اشرف کی گھٹی گھٹی سی آواز سنی۔ ''مائی ڈارلنگ ایلس!..... ایسا کیوں سوچتی ہو؟''

''اس لئے کہ اب تم لڑتے نہیں، بگڑتے نہیں، ناراض نہیں ہوتے ـــــ تم موم بتی کے پگھل جانے کی راہ دیکھ رہے ہو۔ اس نے غور سے اشرف کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''موم بتی جب تک جل رہی ہے..... آخری شعلے تک..... وہ روشنی تو دے رہی ہے..... میں ابھی نہیں مر رہی..... جب مروں گی، تب دیکھا جائے گا۔ موت کو

عام حقیقتوں کی طرح قبول کرنا سیکھو..... جینا سیکھو۔''

زندگی جینا اور ہر لمحے کو Enjoy کرنا..... مسز گروور سے یہی تو وہ کہتی ہے۔

''سرخ پلاش کے پھول پھر کھل اٹھے ہیں۔ پچھلے سال بھی کھلے تھے۔ تب سے ایک سال گزر گیا۔ ایک سال زندہ رہی نا.....؟''

''ہاں''

''اگر مسز گروور! ایک سال پہلے میں اداس ہوگئی ہوتی تو.....'' وہ کہتے کہتے رک گئی..... کیوں مسز گروور میڈیکل سائنس کی دنیا میں ایسے معجزے نہیں ہوتے کیا.....؟''

''ہو بھی سکتے ہیں؟''

مسز گروور کی لاچاری پر اسے ترس آتا ہے.....

وہ جانتی ہے..... وقت کم رہ گیا ہے..... وہ دھیرے دھیرے موت کی طرف بڑھ رہی ہے موت میں فاصلہ بہت کم رہ گیا ہے، بہت سی باتیں، بہت سی کتابیں اور بہت سی چیزیں ایسی ہیں جنہیں وہ کرنے پڑھنے اور جاننے کی خواہش مند ہے..... وقت دریا کا پانی سوکھتا جا رہا ہے۔

پھر اس کا جسم نت نئے عذاب سے گزرتا چلا گیا۔ اشرف اسے لئے لئے پھرتے رہے.....

اس کونے سے اس کونے، ایک شہر سے دوسرے شہر..... آپریشن، ریڈیشن کے مختلف مرحلوں سے اس کا بدن گزرتا رہا..... کیموتھراپی سے تھوڑی راحت ملی تھی لیکن مرض پھر بھی نہیں گیا..... ریڈیم، بایوپسی، میموگرافی..... میڈیکل سائنس کے ہر جبر کو جھیلنے اور سہنے کے لئے وہ شہروں شہروں اڑان بھرتی ہوئی بمبئی آ گئی تھی۔

بمبئی ہاسپٹل..... بمبئی دیکھنے کی کتنی خواہش تھی اس کی..... مگر وہ ایک کینسر پیشنٹ تھی، اس کی دنیا محض کینسر وارڈ تک محدود تھی، جہاں چیخوں اور کراہوں کو سنتے سنتے اس کے کان پک گئے تھے..... ڈاکٹر مریض، سب کے سب اسے کینسر پیشنٹ نظر آنے لگے تھے۔

وہ لہولہان ہوتی رہی..... ہوتی رہی..... لیکن ایک دن جب برداشت کی قوت ختم ہوگئی تو وہ اشرف کے سامنے پھٹ پڑی۔

''اشرف سنو! یہ لوگ مجھے مار ڈالیں گے، میرا جسم ان ڈاکٹروں کے تجربے کے لئے نہیں ہے۔ مجھے واپس وہیں لے چلو..... مسز گروور کے پاس.....''

وہ گڑگڑانے کے لہجے میں بڑبڑائی۔ یقین مانو اشرف یہ وہی پرانے تجربے مجھ پر کئے جارہے ہیں جہاں سے انہیں کامیابی ملنے کی کوئی امید نہیں۔ اگر کامیابی ملنے کی ذرا سی بھی صورت دکھتی تو میں پہلی عورت ہوتی جو اپنے جسم کو ان کے تجربے کے لئے وقف کردیتی مگر.....''

وہ دم گھٹ رہے قیدی کی طرح ہانپ رہی تھی۔ ''یہ مجھے تھکا رہے ہیں۔ مجھے سب کینسر میں لتھڑے ہوئے نظر آرہے ہیں جن کے گوشت کی جھلیاں پھٹ گئی ہیں اور ناسور باہر جھانک رہے ہیں ـــــ مجھے گھبراہٹ ہورہی ہے.....''

اشرف یخ زدہ لہجے میں بولے۔ ''ایلس ڈارلنگ! یہ تمہیں ٹھیک کرنا چاہتے ہیں۔''

''نہیں یہ صرف ایکسپریمنٹ کررہے ہیں۔ الٹراسونوگرافی، فائن نیڈل ایکسپریشن سائیٹولوجی۔ یہ جسم صرف ایک تجربہ گاہ ہے تمہارے ڈاکٹروں کے لئے..... یہ دیکھو.....''

اچانک، بہت اچانک..... ایک بے ہودہ سا واقعہ پیش آیا ـــــ اس نے جھٹکے سے اوپری لبادہ ہٹایا اور اپنے سینے کی گولائیوں کو اس کے سامنے عریاں کردیا.....

''دیکھو..... غور سے دیکھو..... میں ابھی ابھی پورے ہوش وحواس میں ہوں..... اور

کوئی ناٹک نہیں کر رہی ہوں۔ میں کینسر وارڈ کی اس عورت کی طرح یہ نہیں کہوں گی کہ دیدار کرلو اور گواہ رہنا کہ یہ کبھی تھا..... موجود تھا..... دیکھو یہ محض سڑے ہوئے گوشت کا بدبودار، جھولتا ہوا لوتھڑا رہ گیا ہے ـــــ اندر اندر مواد سے بھرا ہوا ہے۔ کیا تم اس سے محبت کرسکو گے..... اور اسے دیکھ کر محسوس کر کے مجھ سے.....؟''

اس رات ایلس نے چپکے سے ڈاکٹر کی نظر بچا کر ڈائری میں لکھا۔ زندگی صرف بھلی بھلی ہی اچھی لگتی ہے۔ شاید یہ بات سب کے ساتھ ہے۔ حسین، دلفریب، خوبصورت مناظر اور تو بہ شکن پُرکشش جسم..... اپنی لٹکتی جھولتی مواد رستی چھاتیوں کو تکتی ہوں تو مجھے نفرت محسوس ہوتی ہے۔ ابھی اس نفرت کو جی سے لگا کر رکھنا چاہتی ہوں..... اس نفرت کے اگنے تک جینے کی خواہش کو برقرار رکھنا چاہتی ہوں۔ اشرف ناامید ہو گئے ہیں۔ مجھے لے کر وہ وطن واپس لوٹ رہے ہیں۔ شاہانہ، مسز گرور اور اپنا گھر..... سب مجھے بے صبری سے یاد آرہے ہیں۔ اپنا شہر اور اپنے گھر کی بات ہی دوسری ہوتی ہے.....''

(۷)

ڈاکٹروں کے مطابق اس کا بریسٹ کینسر اب تھرڈ اسٹیج میں پہنچ گیا ہے۔ یعنی جینے کے چانس بہت کم رہ گئے ہیں۔ امید، دھندلی سی امیدوں پر پروہ زندہ نہیں تھی۔ وہ فخر سیکھتی تھی۔ یہ کتابیں..... ان کتابوں نے مجھے زندہ رکھا ہے..... وہ ذرا بھی خود کو چلنے پھرنے کے قابل محسوس کرتی تو مسز گرووَر کے یہاں پہنچ جاتی۔ وہاں وہ جتنی دیر بیٹھتی، آل انڈیا گائناکالوجی سوسائٹی اور بریسٹ کمیٹی کی رپورٹ کا مطالعہ کرتی پھر مسز گرووَر سے جرح کرتی..... مسز ہار کر کہتیں۔ ''ایلس تم میں زندگی بہت ہے۔'' پھر ان کی آواز بھاری ہو جاتی..... ''میں تمہارے لئے پریئر کرتی ہوں میری

بچی……''مسز گروور کی آنکھیں نمناک ہو جاتیں۔

وہ دھیرے سے ہنس پڑتی۔''مسز گروور میں نے عالیشان مکان میں نہیں، عالیشان کتابوں میں پناہ ڈھونڈی ہے…… جینا جانتی ہوں مسز گروور……''

لیکن شاید بہت دور تک چلتے چلتے وہ ہانپ گئی تھی۔

(۸)

وہ دن بہت عام سا نہیں تھا۔

اور یہ سچ تھا کہ کئی دن سے مسلسل سوچ کر رہ گزر پر چلتے چلتے وہ ہانپ گئی تھی۔ ایلس کو احساس تھا کہ اب بہت کم وقت رہ گیا ہے۔ مٹھی بھر بھی نہیں، جب اچانک ایک پل میں آنکھیں بند ہوں گی تو پھر نہیں کھلیں گی۔تب جانے وہ کہاں ہوگی پتہ نہیں، آنکھیں موند جانے کے بعد اس کے پیٹھ پیچھے جو بھی ہو رہا ہے، اس کے دیکھنے کا عمل باقی رہتا ہے یا نہیں…… شاید وہ بھی کچھ دیکھنا چاہتی تھی۔ ممکن ہے یہ کہ اشرف کیسے رہتے ہیں، شاہانہ کس طرح زندگی گزارتی ہے۔

وہاں پُراسراریت کے جنگلوں کو ہوا کی طرح عبور کر جاتی۔کوئی شئے ہے جس نے ابھی تک اسے مضبوطی سے تھام رکھا ہے…… آخر وہ شئے کیا ہے…… کتابیں…… نہیں وہ نہیں مان سکتی۔ یہ کچھ اور بھی ہے…… ممکن ہے حقیقت کی تلخی کو وہ اپنی پناہ میں لینے سے خوف کھاتی ہو……مگر نقاہت، چھاتی سے رسنے والے مواد، گوشت کے لوجھڑ چیت کو برے، تفتیش کے ہر نئے عمل سے باہر نکل کر وہ صرف یہی سوچ رہی ہے، ایلس راتیں اتنی لمبی کیوں ہوتی ہیں؟''

لیکن تعجب……اس روز رات مختصر ہوگئی اور دن ایسا یک خاص تجربے کے لئے ودیعت کیا ہوا نظر آیا۔

اس دن وہ صبح سویرے ہی اٹھ گئی۔ آنکھوں کے آگے سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ اس نے پاس لگے آئینہ میں چہرہ دیکھا۔ خود کو پہچاننا چاہا۔ اپنی بکھرے بکھرے سے بیمار زدہ وجود کو دیکھا۔ پھر جیسے خود سے بڑبڑائی..... کیوں، بہت بیمار لگتی ہوں نا، ایلس۔ مرتے وقت لوگوں کو دھوکہ دینا چاہتی ہوں کہ بیمار کہاں تھی..... ابھی سب سوئے پڑے ہیں۔ ۸ بجے شاہانہ کی بس آتی ہے..... ساڑھے چھ بجے سے پہلے اشرف اور شاہانہ میں سے کوئی بھی نہیں جاگتا..... سب سے پہلے اشرف جاگتے تھے۔ گھڑی کا الارم سن کر..... پھر شاہانہ کو جگاتے..... ٹوسٹ گرم کرتے، آملیٹ بناتے، لنچ تیار کرتے، کتابی کھوجتے اور شاہانہ کا ہاتھ پکڑ کر بس تک چھوڑ جاتے۔ اب اس کی جگہ یہ سارا معمول اشرف نے سنبھال لیا تھا۔ اس نے سوچا آج کا دن خدا نے اسے ودیعت کیا ہے۔ وہ اس دن کا بھرپور استعمال کرے گی۔

کپڑوں کی الماری سے اس نے اپنے لئے ایک نفیس ساڑی کا انتخاب کیا۔ پھر اس سے میچ کرتا ہوا بلاؤز لے کر باتھ روم کی طرف بڑھ گئی..... ایک نئے احساس نے جسم کی نقاہت بھلا دی تھی..... باتھ روم کا دروزہ بند کر کے اس نے سارے کپڑے ایک ایک کر کے اتار دیئے۔ ایک لمحے کو وہ ٹھہری۔ ہاں، وہ دبلی ہوگئی ہے۔ یہاں سے۔ اور یہاں سے..... ناف کے اوپر کا حصہ اور..... یہاں تک..... جانگھوں پر سے جیسے گوشت کی پرت اتر گئی..... بس ایک سال میں کشش نام کی دھوکہ باز چڑیا اس سے اپنا رشتہ توڑ کر اڑ گئی۔ اس نے سوچا..... رات کے وقت پہلو بدلتا ہوا اشرف.....''

دھیرے دھیرے جسم پر ہاتھ پھراتے پھراتے وہ ٹھہر گئی۔ آگ اچانک برف کی طرح سرد کیوں ہے؟ ایک بے حس، بیمار زدہ عورت اس میں کروٹ لے رہی تھی.....

''مجھ میں زندگی کیوں نہیں ہے.....؟''

''اپنی حرارت گرمجوشی میں کہاں بھول آئی ہوں......؟''

وہ غسل کرکے اٹھی تو ایک نئی عورت کے ساتھ شادابیوں سے لبریز تھی۔شاہانہ کو دیر تک پیار کرتی رہی۔اس کو چوما، گالوں کو سہلایا—— شاہا نہ میری بچی، میرا پیار،

شاہانہ ایک دم سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔اس کا چہرہ فق ہو رہا تھا۔

''ممی اب میں تمہیں تنگ نہیں کروں گی۔میں جانتی ہوں، تم بیمار ہو۔''

''پگلی'' اس نے پھر پیار سے لپٹایا۔چہرے پر انگلیوں سے لکیر بناتی ہوئی بولی۔''میں بیمار نہیں۔دھوپ ہوں! آنگن سے دھوپ کیسا تر جاتی ہے۔ویسے ایک دن میں بھی کھو جاؤں گی۔مگر مجھے کھو جنا مت...... جو چیز گم ہو جائے اس کا غم مت کرنا......''

اس روز، وہ سارا دن شاہانہ سے کھیلتی رہی۔اشرف بھی اس دن آفس نہیں گئے۔سارا دن اسے گھورتے رہے......اس دن وہ بہت کم بولے۔بار بار پلٹ کر اپنی تیز نظریں اس کے چہرے پر گاڑ دیتے تھے۔سارا دن وہ ایسے ہی گم سم رہے۔

رات ہو گئی۔شاہانہ کو سلا کر وہ چپکے سے اپنے کمرے میں آ گئی۔اشرف سگریٹ پی رہے تھے۔اس نے سگریٹ اس کے ہاتھوں سے چھین لیا......پھر ایش ٹرے میں آگے بڑھ کر سگریٹ بجھا دی......پھر دھیرے ہنسی......

''سنو، میں کیسی لگ رہی ہوں......؟''

سارا دن چپ رہنے کے بعد اشرف تیز آواز میں بولے ''ایلس مجھے جینے دو ایلس......'' وہ کانپتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔

''میں کب جینے نہیں دے رہی ہوں۔'' پیار سے ہاتھ پکڑ کر اس نے اپنی طرف

کھینچا..... جینے پر سب کا اپنا حق ہوتا ہے، اشرف..... جینے کا حق میں کہاں چھین رہی ہوں۔''

''پھر یہ الجھی الجھی باتیں کیوں کر رہی ہو..... آج جو دن بھر کرتی رہیں، وہ سب کیا تھا؟''

''مجھے لگا، بس آج کا دن ملا ہے مجھے'' وہ کھلکھلائی..... ''ایک پورا دن..... ہزاروں لاکھوں سیکنڈ..... کئی کئی گھنٹے..... وہ گرم ہوا کے تھپیڑے کی طرح گزر گئے..... میں گم ہو رہی ہوں اشرف!''

اس نے کپکپا دینے والی سانسوں کی ہلچل سنی۔

''سنو، تم مجھے یاد نہیں کرو گے۔''

وہ پلٹ کر بولی۔ ''ایک چیز جو نہیں ہے، اسے یاد کرنے اور جذباتی ہونے سے کیا حاصل؟'' وہ رک رک کر سانس لے رہی تھی۔ ''میرے پاس شاید بہت کم وقت ہے۔ میں آج کی رات کو یادگار بنانا چاہتی ہوں۔ یاد کرو ایک سال سے تم نے مجھے چھوا نہیں..... چھونے کی کبھی خواہش نہیں ہوئی نا..... وہ ہنسی۔ چھونے سے پہلے ایک ڈرپوک مرد تم میں جاگتا ہوگا جسے مجھے چھونے سے گھن آتی ہوگی۔''

اشرف نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

اس نے حکم صادر کرتے ہوئے کہا۔ ''چلو، کپڑے اتارو، میری بیماری سے مت ڈرو۔ تم گھبرا رہے ہو۔ نہیں میں سڑ نہیں گئی ہوں۔ تمہارا ساتھ دے سکتی ہوں۔ اتنا ول پاور بچا ہے میرے پاس۔''

وہ خود ہی آگے بڑھی۔ اشرف کے کپڑوں کے بٹن میں اس کی انگلیاں الجھ گئیں۔ ایک سڑسڑاہٹ ہوئی، ایک سنسنی سی اندر تیر گئی ــــــ

وہ آہستہ آہستہ اس پر بچھنے لگی۔ ''ــــــ ہاں، پہلے مجھے لگتا تھا کہ تمہارے ہاتھ خوبصورت نہیں ہیں ــــــ تمہارے یہاں سے..... یہاں تک کا حصہ، وہ سینے پر

انگلیوں سے شگاف ڈال رہی تھی..... بدصورت ہے..... دیکھو نا، کتنی مدت بعد تمہارے اس گلستاں کی سیر کر رہی ہوں۔ میں غلط تھی اشرف۔ تمہارے بدن میں کسی حسین عورت کے خطوط کی طرح گداز اور پیچ موجود ہیں۔''

وہ کھلکھلا کر ہنسی۔ اشرف نے بوکھلا کر سانپ کی طرح سرسراتے اس کے ہاتھوں کو دیکھا ـــــ وہ سرکا ـــــ پیچھے ہٹا۔ ''نہیں..... خدا کے واسطے..... نہیں ایلس۔''

''بس اپنی موجودگی کا گواہ رہنے تک۔'' اس نے انگلیوں کا رقص بدستور جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''آج تم وہی کرو گے جو میں چاہوں گی۔ اس کے بعد نہ میں چاہوں گی اور نہ اس کے لئے موجود رہوں گی، ہاں تم ہو گے تمہاری دمیا ہو گی، اور تم اپنی ضرورتوں کے لئے آسمان میں سیر کرتی چڑیوں کی طرح آزاد ہو گے۔ چلو مجھے سیراب کرو.....''

پھر وہ کسی ناگن کی طرح لہرائی، سمندر کی طرح گرجی اور کسی سیلاب زدہ ندی کی طرح بہتی چلی گئی۔

(۹)

قارئین! اس کے بعد کہانی بہت کم بچی ہے۔

ایلس مر گئی۔ شاید اسے اپنے مرنے کا علم ہو گیا تھا۔ اس رات کے بعد ایک رات اس کی زندگی میں اور آئی..... مگر وہ بے لذت اور بستر مرگ پر کروٹیں بدلتے ہوئے مریض کی آخری شبکی طرح ہولناک اور اذیت ناک تھی..... پھر ایلس ہمیشہ کے لئے بادلوں میں کھو گئی۔ اس شب مرنے سے پہلے کچھ لمحے کی مہلت نکال کر وہ اپنی خواب گاہ کی میز پر کچھ لکھ رہی تھی.....

''میں موت کو دیکھنا چاہتی تھی..... اس لئے اس کے بارے میں دسیوں طرح کے پُر اسرار تصور آنکھوں میں سجائے تھے..... میں جینے کی طرح جیئی اور مرنے کی طرح مر گئی۔ میں اپنے سانس سانس کو بٹور کر اس میں زندگی رکھ کر جینا چاہتی تھی.....

مرنے سے پہلے میں تشنہ نہیں رہنا چاہتی تھی..... مجھے خوشی ہے۔ میں تشنہ نہیں رہی۔ میں نے شاہانہ کو کبھی بے بس اور لاچار نہیں سمجھا..... اس لئے کبھی اسے ایڈیشن نہیں دیا..... کسی کے چلے جانے سے کوئی بدنصیب نہیں ہو جاتا..... (کاٹی ہوئی لائن)..... زندگی جس کے پاس ہے..... (پھر کاٹی ہوئی)..... اس میں اس کے ہونے کا احساس ہی اس نیا کو پار لگا سکتا ہے۔ اشرف پر بھی ترس نہیں آتا۔ می جانتی ہوں۔ (حرف موٹے ہو گئے ہیں) اپنی سب طرح کی ضرورتوں کے لئے خواہ وہ مرد ہو یا عورت، غلام نہیں ہے..... وہ اس ضرورت کو کسی نہ کسی طرح پورا کر لے گا..... میں دونوں کی طرف سے مطمئن ہوں۔ دونوں کے سامنے زندگی کے دھارے کھلے ہیں تاوقتیکہ موت نہ آ جائے..... ایک انجانے سفر پر نکلتے ہوئے اپنے تجسس کو زندہ رکھنا چاہتی ہوں میں۔ یا یوں کہیں کہ میں چاہتی ہوں..... (کچھ سطر کاٹی ہوئی) پتہ نہیں انجانے سفر میں انسان کو کیسا لگتا ہو گا اور یہی چیز مجھے مطمئن کر رہی ہے۔"

اس کے بعد حروف ترچھے ہو گئے۔ جیسے لکھتے لکھتے قلم کی نب ٹوٹ گئی ہو..... یا ہاتھ کانپنے لگے ہوں۔ ایک چھوٹی سی لکیر کے ساتھ عبارت ختم ہو گئی تھی۔

غلام بخش

وہ غلام ملک میں پیدا ہوا۔ اس لئے باپ نے اس کا نام ہی غلام بخش رکھ دیا۔

مجھے یقین ہے، مرنے سے پہلے وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ کچھ بتانا چاہتا تھا۔ لیکن اس سے پہلے ہی وہ مر گیا ـــــ وہ بوڑھا تھا ـــــ قبر میں پیر لٹکائے بیٹھا تھا ـــــ اسے مرنا تھا اور وہ مر گیا ـــــ ممکن ہے اس کے مرنے کا یہی اندازہ لگایا جائے اور ایک بے حد معمولی سا آدمی، جس کے آگے پیچھے کوئی نہیں، اس کے بارے میں زیادہ سوچنے یا غور کرنے کی فکر ہی کس کو ہے..... وہ جیے یا مرے، کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ جیا بھی تو بیکار اور مر گیا تو مر گیا ـــــ حد تو یہ ہے کہ جہاں وہ کام کرتا تھا وہاں بھی اس کے بارے میں یہی رائے تھی ـــــ اور اس لئے جب میں نے کتابوں کے سیکشن کے انچارج شری واستو کو بہت زیادہ کرید اتو، فائل بند کر کے اور میز پر ایک طرف رکھ کر وہ غور سے میری طرف دیکھنے لگے۔

''ہاں بھائی ہاں..... وہ مر گیا..... لیکن وہ زندہ کب تھا.....؟''

مجھے لگتا ہے، میں نے کہانی غلط جگہ سے شروع کر دی۔ لیکن اتنا طے ہے کہ اپنے آخری وقت میں وہ مجھے کچھ دکھانا یا بتانا چاہتا تھا اور چونکہ دکھانا یا بتانا چاہتا تھا۔ اس لئے اس کی موت میرے لئے معنی رکھتی ہے۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ اپنے وجود میں برسوں کی پُر اسرار خاموشی رکھ کر، چپ چپ، خود سے باتیں کرنے والا غلام بخش کچھ کہنے کے لئے منہ کھولے..... اور کچھ بتانے سے قبل ہی ہمیشہ کی نیند سو جائے ـــــ اس کے اندر اگر یہ بہت کچھ بھرا نہ ہوتا تو سچ کہوں، مجھے بھی اس کے مرنے کا اتنا غم نہ ہوتا..... اس مشینی دور میں آنکھیں کھولی ہیں نا ـــــ؟ اتنا تو اثر

ہونا ہی چاہئے ـــــ قدم قدم پر موت، حادثے ـــــ موت کب، کیسے نکل کر اچانک سامنے آکر دبوچ لے گی، کون کہہ سکتا ہے۔ اچانک کسی بھی لمحے آکر چونکا دے گی ـــــ لو آ گئی ـــــ اب بولو ـــــ؟ مرنے کے واقعات اور حادثات کی یورش نے پتھر جیسا بے حس بنا دیا ہے مجھے ـــــ لیکن اس کے باوجود غلام بخش کی موت کو میرا دل عام واقعہ یا حادثہ ماننے کو قطعی تیار نہیں۔

جی ہاں صاحب، آپ مانیں چاہے نا مانیں، وہ واقعی بہت اہم تھا ہمارے لئے اور یقین جانئے صاحب، وہ ٹوبہ ٹیک سنگھ سے زیادہ پُر اسرار آدمی تھا ـــــ فرق صرف اتنا تھا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ چونکہ پاگل اور خبطی تھا، اس لئے وہ بول بول کر، چیخ چلا کر، اپنی حرکتوں سے اپنی باتیں کہہ ڈالتا تھا اور یہ بوڑھا خبطی ـــــ اسے تو دین دنیا سے کوئی مطلب ہی نہیں تھا۔ ہمیشہ خود سے باتیں کرنے والا۔ بڑبڑ کرنے والا، کبھی من ہی من میں ہنسنے لگتا۔ کوئی آتا تو گیٹ کھولتا۔ اس کی طرف دیکھتا۔ لیکن خود سے باتیں کرنا جاری رہتا۔ ایسا بھی ہوتا کہ گیٹ سے اندر آنے والے اجنبی نے اس سے کچھ پوچھا ہوتا لیکن جواب دینے کے عمل میں بھی اس کی وہی بڑبڑاہٹ جاری رہتی۔ اجنبی کی کھسیاہٹ کو دائیں طرف کرسی پر بیٹھنے والے شری واستو جی دور کرتے۔

'ادھر آجایئے۔ وہ کچھ بھی نہیں بتا سکے گا' اس تیز جملے پر بھی یہ نہیں ہوتا کہ غلام بخش چونک کر شری واستو یا اجنبی کی طرف دیکھتا ـــــ جی بالکل نہیں۔ وہ اپنی دنیا میں مگن رہتا۔ من ہی من بڑبڑاتا ہوا۔ پہلی بار لگا تھا، جیسے اس کے اندر قصے کہانیوں کا عجیب وغریب سنسار ہو ـــــ ایسا سنسار جسے مجھے فوراً لپک لینا چاہئے۔ اچک لینا چاہئے۔ سچ کہوں تو پہلی بار میں ہی غلام بخش کی طرف متوجہ ہوا تھا ـــــ پھر آپ یقین نہیں مانیں گے، میں صرف اور صرف اسی کے لئے آتا رہا۔ برابر۔ ہر دو چار دن

کے بعد۔ چاہے کام ہو یا نہ ہو، شری واستو کی سامنے والی کرسی پر بیٹھ جاتا اور اس کی حرکات وسکنات کا جائزہ لیتا رہتا۔ گرمیوں کے موسم میں اسے مکھیاں بھی تنگ کرتیں۔ مگر جیسے اسے کسی بات کی پرواہ نہیں تھی۔ وہ کہاں بیٹھتی ہیں۔ کہاں تنگ کرتی ہیں۔ وہ تو اپنی داستانوں میں اتنا الجھایا کھویا ہوتا کہ ان بیکار کی باتوں یا مکھیاں 'ہکانے' کے لئے اس کے پاس وقت ہی نہیں تھا۔

ٹھہریئے۔ ابھی بھی بہت سی باتیں رہ گئی ہیں جو ضروری ہیں اور میں نے ابھی تک جن کی وضاحت نہیں کی ہے اور وضاحت کے بغیر بوڑھے غلام بخش کو سمجھنا آسان بھی نہیں ہے۔ یہاں یہ بات ضروری ہے کہ بوڑھے غلام بخش سے اپنی ہمدردی یا خودغرضی کی بھی وضاحت کرتا چلوں، تو اس لمبی تمہید کے لئے معذرت!..... اب میں اصل واقعے پر آتا ہوں، لیکن اس سے پہلے مختصر سا اپنا تعارف بھی کرانا ضروری ہے۔

✦ ✦

میں یعنی اظہر بائجان، ایک معمولی سا ادیب ہوں،—— یہ بائجان کہاں ہے؟ کیا ہے؟ مجھے خود نہیں پتہ، مگر جب مستقبل کو گولی مار کر، لکھنے اور وہ بھی اردو میں لکھنے کا جنون سوار ہوا تو اپنے اچھے بھلے نام اظہر کلیم سے کلیم کو علیحدہ کرکے بائجان جوڑ لیا—— گو کہ اس کے معنی کچھ نہیں، لیکن یہ نام چونکانے کے لئے کافی ہے اور اس سے خاصا انوکھے پن کا بھی گمان ہوتا ہے۔ لیکن یہاں میں اپنے نام کے انوکھے پن کی تفصیل سنانے نہیں بیٹھا ہوں۔ جیسا کہ ظاہر ہو گیا، میں لکھتا ہوں اور مجھے لکھنے کا جنون کی حد تک شوق ہے۔ یہاں ایک چھوٹی سی بات کی وضاحت اور بھی کرتا چلوں کہ ہر نئی چیز، ہر نئی بات کو انوکھے انداز میں لکھنے میں مجھے بڑا مزا ملتا ہے، لیکن آپ بہتر جانتے ہیں کہ فقط لکھنے سے، وہ بھی اردو میں لکھنے سے مستقبل کے گیسو نہیں سنوارے جا سکتے اور یہاں تو دھن تھی کہ بس لکھنے کو ہی ذریعہ معاش بنانا ہے—— تو

میں اظہر بائجان، یعنی ایک چھوٹے سے قصبہ نما شہر کا باشندہ، چھلانگ لگا کر، راجدھانی کی چوڑی چکلی سڑکوں پر آ کر ایک دم سے بھوت بن گیا۔

'جی ہاں۔بھوت.....'

بھوتوں کی مختلف دنیائیں ہیں، پتہ نہیں آپ کو سابقہ پڑا ہے یا نہیں ـــــ لیکن زندگی کے کئی معاملوں میں حقیقت چھپاتے ہوئے ہم بھوت بن جاتے ہیں ـــــ اور ایسے میں بھوت بنے رہنا ہی اچھا لگتا ہے ـــــ جیسے خواہش ہوتی ہے کوئی آپ کو پہچانے نہیں۔ جانے نہیں۔ جی ہاں جناب، ایسی بھی خواہش ہوتی ہے اور خاص کر ادب میں ـــــ روزی روٹی کے لئے آپ کو فرضی ناموں، گھوسٹ (بھوت) ناموں سے بھی کبھی کبھی رائٹنگ کرنی پڑتی ہے اور سچ مچ کا بھوت بن جانا پڑتا ہے۔ تو میں ایسا ہی بھوت بن گیا تھا۔ دلّی کی چوڑی چکلی سڑکوں نے آوارہ نڈھال قدموں کو راستہ بھی دکھایا تو رائیل پبلشنگ ہاؤس کا۔ جو کتابوں کا ایک بڑا نامی گرامی ادارہ تھا اور جہاں فرضی ناموں سے لکھنے والوں کا ایک پورا ٹیبل موجود تھا۔ جب راجدھانی میں گنے چنے پریس ہوا کرتے تھے، یہ تب کا ہے ـــــ

وقت کے ساتھ اس پبلشنگ ہاؤس کا رنگ، ڈھنگ اور انداز سب کچھ بدل چکا تھا۔ اب اس کے مالک تھے، مسٹر نوین ـــــ جن کی عمر زیادہ سے زیادہ چالیس برس ہوگی۔ لیکن جو دیکھنے میں اس سے کہیں زیادہ کم اور خوبصورت لگتے تھے۔ پہلے ہی دن، مجھے کہنے دیجئے، فرسٹریشن کی اپنی ایک الگ کڑوی دنیا ہوتی ہے ـــــ جب دنیا کا تصور مردہ آرزوؤں اور کسی چڑچڑی چڑیل بڑھیا کے بدصورت خوابوں کی طرح بے رونق اور بدمزہ ہو جاتا ہے ـــــ خزاں رسیدہ موسم کی کسی تپتی دوپہر میں، میں نے فیصلہ کیا تھا کہ میں بھوت بن جاؤں گا اور میرے قدم خود بخود نوین پبلشنگ ہاؤس کا بورڈ دیکھ کر رک گئے تھے۔ چھوٹی چھوٹی کئی سیڑھیاں چڑھنے کے بعد

آٹومیٹک دروازہ آتا ہے ـــــ دروازے کے اندر داخل ہوتے ہی پہلی ملاقات غلام بخش سے ہوتی ہے۔ جو اسٹول پر بیٹھا بیٹھا خود سے باتیں کرتا رہتا ہے ـــــ اندر تو داخل ہو گیا لیکن اب کہاں جاؤں؟ اسٹول پر بیٹھا ہوا آدمی تو نظر اٹھا کر اپنی دنیا کی بڑبڑاہٹ میں گم ہو گیا تھا۔

میں نے اس کا جائزہ لیا۔ گہرا سانولا رنگ، جس پر اب جھریوں کا جال بچھنے لگا تھا، آنکھوں کے پاس گال پر بڑا سا مسہ۔ آنکھیں چھوٹی مگر ان میں بچوں جیسی چمک، بال چھوٹے چھوٹے مگر 'جھڑائے' سے ـــــ اجلے رنگ کے پینٹ شرٹ (جو گندہ ہو گیا تھا اور شاید اس کا یونیفارم بھی تھا) میں ملبوس ـــــ توند بالکل باہر نکلی ہوئی ..... پورے چہرے پر بس آنکھیں ہی ایسی تھیں جو اس کے وجود کو چھوٹے سے ننھے منے بچے میں تبدیل کر رہی تھیں۔ میں نے غلام بخش کی باتوں پر کان لگایا مگر اڑم، دھڑم، نم، نوں۔ جو زیادہ تر اس کے سانسوں کی تکرار تھی، سے زیادہ کچھ سمجھ نہ سکا۔ مگر سانسوں کے آدھے ادھورے بٹوارے کے درمیان اس کی بے تکی بڑبڑاہٹ جاری تھی۔

اسٹول سے آگے بڑھنے کے بعد دائیں طرف شریواستو کا کمرہ ہے۔ جو پبلشنگ ہاؤس میں بک انچارج ہیں۔ ان کے پڑوس میں رضیہ بین کی میز ہے۔ رضیہ کو کوئی رضیہ بہن نہیں کہتا۔ رضیہ بین ہی کہتا ہے۔ دھیرے دھیرے جب میں اظہر بائجان، وہاں کا مستقل گھوسٹ رائٹر بن گیا اور یہاں کے لوگوں سے تعلقات کے دائرے بڑھنے لگے تو غلام بخش کے بارے میں کئی انوکھی کہانیاں معلوم ہوئیں ـــــ معلوم ہوا کہ اس اسٹول پر بیٹھے بوڑھے بھوت کے بارے میں جاننے کا تجسس صرف مجھے ہی نہیں، بلکہ سب کو تھا۔ لیکن غلام بخش کی زندگی کا سب سے مختلف پہلو وہ تھا جس کی داستان مجھے یہاں کے مالک مسٹر نوین نے سنائی۔

لیکن صاحبان۔ ذرا ٹھہریئے۔ اس داستان کو شروع کرنے سے پہلے میں ایک

چھوٹا سا واقعہ بتادوں۔ ہوا یوں کہ جیسا میں نے شروع میں بتایا ہے، کہ جب بھی میں نوین پبلشنگ ہاؤس جاتا، کوشش کرتا کہ نظریں بچا کر زیادہ سے زیادہ غلام بخش کا جائزہ لیتا رہوں۔ جیسا کہ میں نے بعد میں جانا کہ اس بوڑھے بھوت کو کھانے پینے سے کوئی زیادہ مطلب نہیں ہے۔ بھوک لگی تو باہر سے کچھ بھی لا کر کھالیا۔ چینا بادام، بھونجا، گول گپے۔ زیادہ تر ایسی ہی چیزیں اسے پسند ہیں۔ خود میں نے جب بھی دیکھا۔ ایک چھوٹا سا ٹھونگا لے کر کچھ اسی طرح کی چیز چباتے یا کھاتے دیکھا۔ ہاں پیسے نہیں ہوتے تو چپ چاپ نوین صاحب کے پاس آ کر ٹھہر جاتا۔ ایسے میں بھی اس کی بے ڈھب سانسوں والی بے تکی آواز زور مار رہی ہوتی۔ نوین صاحب سمجھ جاتے کہ بھوک لگی ہے۔ وہ کچھ پیسے ہاتھ میں تھما دیتے۔ وہ چپ چاپ باہر نکلتا۔ کوئی کھانے پینے کی چیز لیتا۔ پھر اسٹول پر کسی فرمانبردار بچے کی طرح بیٹھ جاتا۔ جیسے اسکول کے بچے کو اسکول اور اسکول سے گھر کا راستہ معلوم ہوتا ہے، وہی حال غلام بخش کا دفتر کے ساتھ تھا۔ وہ کہاں رہتا تھا، کی مزید تفصیل تو بعد میں بتائیں گے لیکن اسے معلوم تھا کہ اتنے بجے دفتر پہنچنا ہے۔ چابی سے دروازہ کھولنا ہے اور اسٹول نکال کر بیٹھ جانا ہے۔ دروازہ کھولنے کے آدھے گھنٹے بعد ہی سوئپر آتا تھا۔ ہاں شروع میں مجھے اس بات کا احساس ضرور تھا کہ اس بے ضرر آدمی کو بھلا نوین صاحب نے کیونکر رکھا ہے؟ مگر اس کا اندازہ مجھے بعد میں ہوا۔ ہاں تو واقعہ یوں تھا کہ ہمیشہ کی طرح ایک دن گیٹ کھول کر اندر داخل ہوتے ہی میں غلام بخش کے پاس ٹھہرا تو اس کی تیوریاں کچھ چڑھی ہوئی دیکھیں۔ مگر اس کی خودکلامی، بڑبڑاہٹ جاری تھی اور بہت دھیان دینے پر بہت کوشش کے باوجود، اس کے آدھے ادھورے لفظوں میں مجھے ایک **ملک** کا نام سنائی دیا اور میں ایک دم سے چونک پڑا.....

'پا..کستا..ن.....'

میں نے پھر غور کیا۔ میری طرف اچٹتی سی نگاہ ڈال کر وہ پھر اپنی خود کلامی میں مصروف تھا۔ میں نے جب شریواستو کو اپنی اس نئی دریافت کا بیورہ دیا تو وہ چونکا نہیں۔ بلکہ مذاق اڑاتا ہوا بولا ــــــ

''بائجان صاحب۔ آپ نے کوئی تیر نہیں مارا۔ سالا پاکستان سے محبت کرتا ہے، غدار ہے۔ کون نہیں جانتا۔ پھر اس نے پُراسرار انداز میں بتایا۔ یہ سالا پاگل دکھتا ہے۔ کچھ پوچھئے تو عجب عجب کرتا رہے گا جیسے کچھ جانتا نہیں، کسی سے کوئی مطلب نہیں۔ لیکن ذرا اس کے سامنے پاکستان کا نام لے کر دیکھئے ــــــ کیسے سن لیتا ہے اور خوش ہوتا ہے.....''

''اچھا.....'' یہ میرے لئے حیرانی کی بات تھی۔

اور اس سے پہلے کہ میں نوین صاحب والا واقعہ بیان کروں، میں آپ کو بتادوں کہ شری واستو جی کی بات مان کر میں نے وہ تجربہ بھی کیا اور یقین جانیے۔ اس کی آنکھوں میں پہلی بار بچے جیسی چمک اور خوشی کا رنگ نظر آیا۔

''پاکستان.....''

''تم پاکستان میں رہتے ہو.....؟''

''تمہارا پاکستان میں کوئی اب بھی رہتا ہے.....؟''

''پاکستان جانا چاہتے ہو.....؟''

''پاکستان تمہیں بے انتہا پسند ہے.....؟''

وہ خود سے اڑم بڑم کرتا، میری طرف دیکھ کر بچوں کی طرح مسکرائے جا رہا تھا۔ بس کوئی جواب نہیں۔ اس کی بڑبڑاہٹ جاری تھی اور اس سے پہلے کہ میں اپنے طور

پر غلام بخش کے بارے میں کوئی نظریہ قائم کروں نوین صاحب نے مجھے ایک بالکل نئی دنیا میں پہنچا دیا تھا۔

✦ ✦

تب آزادی نہیں ملی تھی۔ نوجوانوں میں گاندھی جی اور آزادی کا جوش ضرورت سے کچھ زیادہ ہی تھا۔ چرخہ کاتنے والے گاندھی جی کی تصویر غلام بخش کے اندر ہی اندر بس گئی تھی۔ سودیسی آندولن کا نعرہ ہو یا انگریز و بھارت چھوڑو ـــــ غلام بخش کے نوجوان ہاتھ بھی فرنگیوں کے خلاف اٹھ گئے۔ یہ پڑھائی کی عمر تھی ـــــ غلام بخش کا باپ کریم بخش تھا جو مولا حویلی تاج بخش کے پاس رہتا تھا۔ یہ جگہ پرانی دلّی کے علاقے میں تھی۔ آج یہ جگہ چتلی قبر اور بلی ماران کی نئی نئی دکانوں اور عمارتوں کے بیچ کہاں گم ہوگئی۔ اسے کھوجنا مؤرخ کا کام ہے۔ کریم بخش کچھ زیادہ پڑھے لکھے تو نہیں تھے۔ ہاں تھوڑی بہت عربی فارسی آتی تھی۔ اردو کے استاد تھے ـــــ بچوں کو پڑھا کر گزارا کرتے تھے اور مولا حویلی تاج بخش محلے میں تین کمروں کا چھوٹا سا مکان تھا۔ جو باپ دادا پردادا کے وقت سے چلا آ رہا تھا۔ کریم بخش کے تین لڑکے تھے۔ منجھلا تھا غلام بخش، بڑا مولا بخش اور چھوٹا ظہور بخش ـــــ اس وقت تک پاکستان نہیں بنا تھا لیکن قائد اعظم کا بہت شور تھا۔ کریم بخش بھی اس وقت کے زیادہ تر مسلمانوں کی طرح مسلم لیگ کے اہم ممبر تھے اور قائد اعظم کے حق میں تھے اور چاہتے تھے کہ مسلمانوں کا اپنا الگ ملک ہو ـــــ غلام بخش اس وقت نوجوان تھا۔ عمر 19-20 ہوگی ـــــ پتہ نہیں کیوں اسے ابا کی بات معقول نہیں لگتی تھی۔ گاندھی جی کی بات تو سمجھ میں آتی تھی کہ سب مل جل کر رہو ـــــ ملک کا بٹوارہ ہو جائے۔ ہندو مسلم دو حصوں میں بٹ جائیں۔ اسے کب گوارہ تھا۔ کریم بخش نے ''لے کے رہیں گے پاکستان'' کا نعرہ تو لگایا لیکن پاکستان کو بنتے ہوئے نہیں دیکھ سکے ـــــ

کہتے ہیں ایک بار وہ کسی جلوس کے ساتھ نعرے لگاتے جا رہے تھے کہ برٹش سرکار نے گولی چلوا دی ـــــ مرنے والوں میں غلام بخش کا باپ بھی شامل تھا۔

فرنگی حکومت سے غلام بخش کی نفرت اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ ایک بار اسے معلوم ہوا کہ قریبی گیسٹ ہاؤس میں وائسرائے کی سواری رکتی ہے۔ اس وقت بہت سے ہندو مسلمان بم بنانا جان چکے تھے۔ غلام بخش نے خود اپنے ہاتھوں سے بم بنایا اور ایک بم وائسرائے کے کمرے کی طرف اچھال کر جو بھاگا تو 'بم پولیس' میں جا کر دم لیا۔ اندھیرے کا وقت تھا۔ شہر فرنگی جوتوں کی دہشت سے گھرا ہوا تھا۔ یہ جگہ ریلوے کراسنگ کے پاس تھی۔ جہاں بڑے بڑے بے حیا کے درخت تھے اور چاروں طرف موت پاخانے کی تیز بدبو..... کہتے ہیں فرنگی گولی کے ڈر سے غلام بخش اسی گو موت یعنی 'بم پولیس' میں ہفتوں پڑا رہا۔ اسے یہ بھی خوف تھا کہ پولیس اس کی تلاش میں ہوگی اور صبح اس جگہ میدان کرنے والوں کی ٹولی آ جائے گی۔ جیسے تیسے پورے ایک ہفتہ تک وہ اس بم پولیس میں ادھر ادھر چھپتا رہا۔

یہ اسی زمانے کی بات ہے جب انگریزوں نے ''ڈیوائڈ اینڈ رول'' فارمولے کے تحت ہندو مسلمانوں کو آپس میں لڑا دیا تھا اور ملک میں چاروں طرف ہندو مسلمان کٹ کٹ کر گر نے مرنے لگے تھے۔ پھر جب پاکستان بنا تو عدم تحفظ کے احساس سے دو چار مسلمانوں نے پاکستان جانے میں ہی بھلائی سمجھی۔ غلام بخش کا علاقہ بھی دہشت کی لپیٹ میں تھا۔ پاکستان چلنے کا اعلان ہوا تو بڑے بھائی مولا بخش نے غلام بخش کو بھی چلنے کے لئے کہا۔ غلام بخش راضی نہیں ہوا تو اس نے سمجھایا۔

''مکان کا موہ چھوڑو۔ پرانی دلّی کا حشر بھی بُرا ہونے کو ہے۔ وہاں چل کر کسی اچھے سے مکان پر تالا لگا دیں گے۔''

غلام بخش پھر بھی چلنے کو راضی نہیں تھا۔ بڑے بھائی نے بڑی مشکل سے دونوں بھائیوں کو راضی کیا۔ اس وقت تک مولا بخش کی بیوی آ چکی تھی اور اس کا ایک چھوٹا سا

بچہ بھی تھا۔

✦ ✦

لاہور تو آ گئے پر مکان کا ملنا اب بھی نہیں ہوا تھا۔ مکان ڈھونڈھا بھی تو غلام بخش نے ـــــ اور بڑی مشکل سے دوڑ بھاگ کے بعد ایک بہتر سا مکان نظر آیا۔ بھائیوں کو خبر کی۔ بھائی آئے۔ خوش ہوئے۔ قاعدے سے اس مکان پر تو غلام بخش کا ہی حق ہونا چاہئے تھا۔ مگر مولا بخش کی بیوی نے ایسا ہونے نہیں دیا ـــــ مکان بڑا ضرور تھا لیکن نصیبن چاہتی تھی کہ یہ مکان اس کے حصے میں رہے ـــــ سو اس نے اپنے میاں کو پڑھانا شروع کیا کہ اگر یہ بھائی زیادہ دن تک یہاں ٹکے رہے تو یہاں بھی بٹوارے جیسی صورت حال پیدا ہو جائے گی اور جو یہاں بھی اس مکان کے تین حصے لگ گئے تو سوچو بچے گا کیا ـــــ دونوں بھائی تو کنوارے ہیں۔ کچھ بھی نہیں جائے گا۔ لیکن اس کی تو گھر گرہستی ہے۔ اس لئے سوچنا بھی اسی کا کام ہے۔ مولا بخش نے دماغ لگایا تو بیوی کا شک صحیح لگا۔ بھائی کی نیت سے تو غلام بخش واقف ہو ہی چلا تھا۔ لیکن جب بھائی نے سیدھے طور پر مکان سے نکل جانے کو کہا تو اسے بھی تاؤ آ گیا۔ غصّے میں بولا۔ جاؤ نہیں نکلتا ـــــ میرا مکان ہے۔ دخل بھی میرا ہے۔ پہلے میں نے دیکھا تھا ـــــ کہتے ہیں یہی وقت تھا جب پاگل پن کا ہلکا ہلکا دورہ غلام بخش کو پڑا تھا۔ بھائی سے ان بن ہو جانے کے بعد وہ بیٹھا بیٹھا بڑبڑاتا رہتا۔

”لے کے رہیں گے پاکستان
پاکستان میں ایک مکان
ایک مکان میں ایک دکان.....
لے کے رہیں گے.....پا.....کس.....تا.....ن.....“

کہتے ہیں بھیا اور بھابی سے دل ٹوٹنے کے بعد ادھر ادھر مکان کی تلاش میں بھٹکتا رہا۔ کراچی سے لاہور، لاہور سے کراچی..... بہت دنوں تک انارکلی میں بھی پھیری لگائی۔ دل نہیں لگا تو پرانے مکان کی تلاش میں ہندوستان واپس آ گیا اور پھر اس پر جیسے ہنسی کا دورہ پڑ گیا..... جس مکان کو 'نتھلا' اور لاوارث چھوڑ کر بھاگا تھا۔ وہاں کسی دوسرے کا قبضہ ہو گیا تھا۔ بیچارے ''توبہ ٹیک سنگھ'' کو تو یہ سوچ کر پریشانی ہوتی تھی کہ اس کا گھر پاکستان میں ہے یا ہندوستان میں ـــــ لیکن اس سے بھی بُری حالت بیچارے غلام بخش کی تھی۔ اپنا گھر، اپنا دوار۔ وہ یہاں سے بھی گیا۔ وہاں سے بھی۔ بہت دنوں تک مولا حویلی تاج بخش کے اپنے گھر کے سامنے ڈیرہ ڈال کر وہ یہی گاتا پھرتا.....

''لے کے رہیں گے پاکستان
پاکستان میں ایک مکان
ایک مکان میں ایک دکان''

کوئی پوچھتا..... ''کیوں میاں۔ پاکستان تو مل گیا، اب وہاں مکان کب لے رہے ہو، اور مکان میں دکان کب بنوا رہے ہو ـــــ؟''

غلام بخش گندی سی گالی بکتا ـــــ اسی بھڑوے نے ہتھیالی۔ ورنہ دیکھا تو میں نے تھا۔

✦ ✦

'لیکن یہ سب باتیں؟' میں نے نوین صاحب کی طرف دیکھا..... 'آپ کیسے جانتے ہیں؟'

نوین صاحب نے میری طرف دیکھ کر ٹھنڈی سانس بھری ـــــ بھائی، اس وقت تقسیم کا اثر سب کے دل و دماغ پر تھا۔ ہندو مسلم دنگوں نے تھوڑا بہت نقصان سب کو

ہی پہنچایا تھا..... اور دلّی تو دل کھول کر لٹی برباد ہوئی تھی۔ اس لئے جب یہ وقت کا مارا روزی روٹی کو ترستا، پاپا کے پاس پہنچا اور پاپا نے اس کی کہانی سنی تو فوراً رکھ لیا ــــــ اب مدت گزر گئی۔ مرنے سے پہلے پاپا نے مجھ سے بھی کہا تھا ــــــ غلام بخش کو نکالنا مت۔ بے ضرر انسان ہے۔ باہر اسٹول پر پڑا پڑا چوکیداری ہی تو کرتا رہتا ہے۔ نہ کسی سے لڑتا جھگڑتا ہے۔ اس لئے میں نے بھی رہنے دیا۔

نوین بھائی نے میری آنکھوں میں جھانکا ــــــ دراصل اس کی بڑبڑاہٹ تو ادھر پانچ ایک برسوں میں شروع ہوئی۔ مکان نہیں ملا تو کھوجتے کھوجتے اس کی ملاقات رحمان درزی سے ہوئی۔ جن کی آنکھوں کی بینائی کمزور پڑ گئی تھی اور جواب سینے پرونے کا کام کرنے کے لائق بھی نہیں تھے۔ غلام بخش انہیں رحمان چاچا کہتا تھا۔ رحمان کے پاس اپنا ایک ٹوٹا پھوٹا سا مکان تھا۔ رحمان کریم بخش کے پکے یاروں میں تھا اور ایک نمبر کا مسلم لیگی۔ سو رحمان نے اسے اپنے پاس ہی رکھ لیا۔ کچھ دنوں کے بعد ہی رحمان مر گیا اور یہ مکان بھی ایک طرح سے غلام بخش کا ہی ہو گیا۔ اب تو اس مکان کی قیمت بھی کافی ہو گئی ہو گی۔ پاپا برابر کہتے رہے۔ مکان بیچ دو۔ اچھے پیسے مل جائیں گے۔ مگر غلام بخش کو پیسے کوڑی سے مطلب ہی نہیں تھا۔

✦ ✦

مجھے معاف کیجئے میں جہاں سے چلا تھا۔ پھر وہیں لوٹ رہا ہوں ــــــ آخر اس پرانی ہو چکی داستان میں ایسا کیا ہے۔ میں جسے لکھنے کی ضرورت محسوس کر رہا ہوں ــــــ تقسیم، ہجرت، فساد، کچھ کہانیاں تو وقت کی زنبیل میں کب کی دفن ہو گئیں ــــــ پھر اس پرانی پڑ گئی راکھ کو کریدنے سے فائدہ ــــــ؟ لیکن صاحب، راکھ کے اسی ڈھیر کو کریدا جاتا ہے جہاں سے کچھ ملنے کی توقع ہوتی ہے۔

نوین بھائی نے آگے بتایا۔ ان دنوں ہندوستان پاکستان میں جنگ چھڑی ہوئی

تھی۔ ہر طرف جنگ کے تذکرے تھے۔ اس وقت پاپا دفتر میں ہی بیٹھے تھے۔ اچانک اسٹول پر بیٹھے بیٹھے غلام بخش لپکتا ہوا پاپا کے پاس آیا ـــــ پہلے تو وہ سمجھے کہ پیسوں کے لئے آیا ہوگا۔ جیب میں ہاتھ ڈالا ہی تھا کہ غلام بخش نے روک لیا۔ نہیں جی پیسے نہیں چاہئیں۔

''پھر.....''

''میں کیا کروں جی.....؟''

پاپا نے اس کی طرف حیرت سے دیکھا۔ غلام بخش نے سوالیہ آنکھوں سے پاپا کی آنکھوں میں جھانکا ـــــ یہ جنگ ہو رہی ہے جی۔ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ میرا مکان تو ہندوستان میں بھی چھن گیا۔ پاکستان میں بھی ـــــ یہ آفس والے چھیڑتے ہیں جی۔ کہ ہندوستان، پاکستان پر بم گرائے گا۔ اچھا گرائے گا جی۔ مان لیا۔ پھر مجھے کیا کرنا چاہئے اور اگر پاکستان ہندوستان پر بم گراتا ہے جی، تو مجھے کیا کرنا چاہئے۔

پاپا نے زور سے ڈانٹا۔ ''تم جا کر چپ چاپ اسٹول پر بیٹھ رہو اور کسی کی مت سنو۔''

''اچھا جی.....''

وہ اسٹول پر جا کر بیٹھ گیا۔

میں دھیرے سے مسکرایا ـــــ 'دراصل وہ طے نہیں کر پا رہا تھا کہ اسے کہاں کے لئے ایماندار رہنا چاہئے اور یہی اس کی زندگی کا سب سے اہم پہلو ہے۔'

نوین بھائی ہنسے ـــــ پھر تو پاکستان کے نام پر وہ دفتر والوں کا مذاق بن گیا۔ کوئی پاکستانی کہتا۔ کوئی کہتا، پہلے تو صرف مکان ہی چھنا ہے۔ اس بار جاؤ گے تو کھدیڑ دیئے جاؤ گے۔ ہندو پاک کے درمیان کرکٹ کا میچ چلتا تو وہ کھسکتا ہوا ٹرانزسٹر کے قریب آجاتا۔ پھر پوچھتا۔ پاکستان کے کتنے رن ہوئے جی۔ پاکستان جیتے گا نا جی۔ ایسا باؤلا ہو گیا تھا۔

نوین بھائی نے ٹھہر کر کہا۔شری واستو کی میز کے پاس تم نے نجمہ بین کو دیکھا ہوگا۔ پتہ نہیں کیا بات تھی۔ نجمہ کو بہت مانتا تھا۔ جب شروع شروع آئی تھی۔تب سے جو بھی کھانے کی چیز خریدتا، نجمہ کے پاس لے کر پہنچ جاتا ـــــ جب آفس والوں نے نجمہ کو چڑانا شروع کیا تب ایک بار نجمہ نے اس کا ٹھونگا پھینک دیا تھا ـــــ تب سے ایسا ناراض ہوا کہ نجمہ کو دیکھتا بھی نہیں۔تم کیا جانو۔اس کے اندر کتنا غصہ ہے ـــــ اتنا غصہ جسے وہ اپنی مستقل بڑبڑاہٹ میں تھوڑا تھوڑا کر کے نکالتا رہتا ہے۔

''چائے پئیں گے آپ؟''

نوین بھائی نے میری طرف دیکھا۔بس جو معلوم تھا بتا دیا۔ہاں ایک چھوٹی سی بات اور رہ گئی۔آخر وقت میں اس نے پاپا کو بہت تنگ کیا۔جب تب کہتا، پاکستان بھیج دو۔جب پاپا کی ارتھی اٹھی تب بھی وہ آنگن میں ایک طرف بیٹھ کر وہی پرانا گیت الاپ رہا تھا۔

''لے کے رہیں گے پاکستان
پاکستان میں ایک مکان
ایک مکان میں ایک دکان''

میں خود اسے پکڑ کر کنارے لے گیا اور سمجھایا ـــــ ''چپ ہو جاؤ غلام بخش۔ پاکستان میں مکان بنوانے والا نہیں رہا۔پاپا مر گئے ہیں۔چپ ہو جاؤ۔'' پھر یوں ہوا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔بلک بلک کر۔پہلی اور آخری بار ـــــ پھر میں نے اسے کبھی روتے ہوئے نہیں پایا۔پتہ نہیں کم بخت کے اندر کتنی داستانیں بھری ہیں۔اسٹول پر بیٹھا بیٹھا بڑبڑاتا رہتا ہے۔

✦ ✦

غلام بخش کی کہانی اتنی ہی تھی جتنی میں سنا چکا۔بیچ کے واقعات میں کچھ نہیں۔

سوائے اس کے کہ وہ اسٹول پر بیٹھا بیٹھا بڑبڑاتا رہتا تھا اور میری خواہش تھی کہ اس کی بڑبڑاہٹ میں کسی معنی خیز جملے کو دریافت کرسکوں ـــــ لیکن یہ میری بیوقوفی تھی۔ وہاں صرف سانسوں کے تھپیڑے تھے۔ جنہیں سمجھنا آسان نہ تھا۔ ہاں اب جو میں بتانا چاہتا ہوں۔ وہ بہت اہم ہے ـــــ جیسے یہ کہ مرنے سے کچھ دن قبل وہ ٹھیک ہوگیا تھا اور یہ ماننے کو کوئی بھی تیار نہیں کہ وہ کھوسٹ غلام بخش جو مرنے سے کئی عرصہ پہلے ہی مر چکا تھا ـــــ مجھے کچھ بتانا بھی چاہتا ہوگا ـــــ اور سچ کہوں تو اس کے اس طرح اچانک مرنے سے مجھے دھکا پہنچا تھا ـــــ اور وہ جن حالات میں مرا، مجھے یقین ہے وہ اپنے زندہ ہونے کی کوئی تو شہادت پیش کرنا چاہتا ہوگا اور اسی لئے میں کہتا ہوں کہ مرنے سے قبل وہ مجھے کچھ بتانا چاہتا تھا ـــــ جیسے ایک ٹائر میں اگر بہت زیادہ ہوا بھر دیجئے تو وہ پھٹ سکتا ہے۔ لیکن تھوڑی سی ہوا چارج کر دیجئے، تو اس کے پھٹنے کا خوف نہیں رہتا ـــــ غلام بخش اپنے اندر سے تھوڑی بھی داستان نکال دیتا تو وہ بچ جاتا اور میرا زور اسی بات پر ہے کہ وہ اپنی داستان باہر نکالنے کے لئے تیار تھا۔

''تمہارا یقین ہے وہ تمہیں کچھ بتانا چاہتا تھا۔؟'' نوین بھائی چونک کر بولے۔

''ہاں..... اس نے مجھے گھر چلنے کو کہا تھا۔''

''تم اس کے گھر گئے تھے؟''

میں اظہر بائجان، میں نے ٹھنڈی چائے منہ کے اندر انڈیلی ـــــ نوین بھائی کو غور سے دیکھا۔ پھر کہا ـــــ اب جو بتانے جارہا ہوں۔ ممکن ہے آپ کو یقین نہ آئے اور آپ سن کر حیرت کریں ـــــ تو سن لیجئے۔ مرنے سے پہلے میں واقعی اس کے گھر گیا تھا ـــــ میں ایک لمحے کو رُکا۔ آپ کے پاپا ٹھیک کہتے تھے۔ وہ مکان جس جگہ ہے، اب اچھے داموں پر فروخت ہوگا۔ لیکن اب اس جگہ پر رحمان درزی

کے بھائی بھتیجوں کا قبضہ ہوگیا۔ میں سب معلوم کر کے آیا ہوں۔ دراصل مجھے تجسس اس کے سامان کا تھا۔ کم بخت کے پاس یادگار کے طور پر کچھ تو ہوگا۔

''پھر کیا ملا.....؟''

میں نے ان تجسس مزید بڑھایا..... ''آپ کو تعجب ہوگا۔ غلام بخش اپنے اس گھر میں مجھے نہیں ملا ـــــ بلکہ اپنے پرانے والے گھر میں.....''

میں نے ٹھہر کر کہا۔ ''اچھا یہ بتایئے۔ مرنے سے 7-6 روز قبل کیا وہ دفتر آ رہا تھا؟''

''نہیں.....''

''آپ نے تلاش کیا؟''

''ہاں، ہم نے پیون بھیجا تھا۔ اس کے گھر۔ وہ نہیں ملا تھا۔''

''غلام بخش جیسا ایک بوڑھا آدمی وہاں نہیں ملا، کیا یہ تشویش کی بات نہیں تھی۔''

''تھی لیکن میں کیا کرتا۔''

''اب مجھ سے سنئے۔ وہ وہاں ملتا بھی کیسے۔ وہ تو اپنے پرانے گھر گیا تھا۔ جی ہاں اسی گھر میں جو مولا حویلی تاج بخش میں، کسی زمانے میں تھا اور جہاں آج کسی دوسرے کا قبضہ ہے۔''

نوین بھائی مجھے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ ''لیکن تم وہاں تک کیسے پہنچ گئے؟''

میں نے ایک بوجھل سانس لی ـــــ مجھے معلوم تھا۔ وہ وہیں مل سکتا ہے۔ چتلی قبر اور بلیماران کے علاقے میں وہ جگہ تلاش کرنے میں مجھے زیادہ پریشانی نہیں ہوئی۔ اب وہاں بالکل نئی عمارت ہے ـــــ عمارت کے مکین نے بتایا کہ ایک پاگل نما شخص آیا تھا۔ جو گھر اور گھر کے کمروں کی طرف اشارہ کر کے پتہ نہیں کیا کہہ رہا تھا۔ لیکن کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ ان لوگوں نے اسے نکالنے کی بہت کوشش کی۔ لیکن..... لیکن وہ گیا نہیں۔ دھنی مار کر باہر ہی جم گیا۔ ڈرانے دھمکانے پر بھی نہیں

گیا۔ باہر برآمدے میں ہی سو گیا ـــــ جانتے ہیں ایسا کیوں ہوا ـــــ میں نے نوین صاحب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں ـــــ ممکن ہے اچانک اسے خیال آیا ہو۔ کیا اتنے برس گزر جانے کے بعد بھی وہ اپنے مکان کو اپنا مکان نہیں کہہ سکتا۔ بس۔اس طویل دشمنی کی آخری جنگ لڑنے وہ اپنے اس مکان میں گیا تھا۔

''اس کے پاس سے کچھ برآمد ہوا؟''

'وہی بتانے جا رہا ہوں میں نے ٹھنڈی سانس چھوڑی ـــــ اس کے پاس تھا ہی کیا؟ جو ملتا۔ زندگی بھر کی کمائی بس ایک جھولا۔ کچھ پرانے کاغذ پتر، جس کی لکھائی اتنی دھندلی پڑ گئی تھی کہ کوئی مورخ ہی پڑھ سکتا تھا۔ ہاں کچھ چوڑیاں تھیں۔ ان چوڑیوں سے یاد آیا نجمہ بین سے اس کی والہانہ محبت کے پیچھے کوئی جذبہ کہانی کی شکل میں ضرور رہا ہوگا، جو اس کی موت کے ساتھ ہی راز، رہ گیا۔ بہر کیف اب میں جس چیز کی طرف آ رہا ہوں وہ یقیناً آپ کو بھی چونکا دے گی۔

نوین بھائی نے کرسی پر ـــــ کروٹ بدلی ـــــ

میں نے ان کے تجسس کا زیادہ امتحان لئے بغیر کہا۔ وہ چیز تھی ویزا۔ پاکستان جانے کا ویزا۔ جس پر حال فی الحال کی تاریخ پڑی تھی۔ آپ کہتے ہیں وہ ہوش وحواس کھو چکا تھا۔ مدتوں پہلے ہی مر چکا تھا۔ لیکن کیا مرنے سے پہلے وہ پاکستان جانے کا خواہش مند تھا۔ لیکن۔ کیوں؟ دراصل.....

نوین بھائی مضحکہ خیز ہنسی ہنسے۔ ''ہو سکتا ہے وہ آدھی موت یہاں مر چکا ہو اور آدھی موت کے لئے۔''

''نہیں.....'' میرا لہجہ اچانک تھوڑا سخت ہو گیا۔ یہیں پر آپ چوٹ کھا گئے نوین بھائی اور یہی غلام بخش کی کہانی کی سب سے سنسنی خیز اور آخری کڑی ہے۔ اب جو میں بتانے جا رہا ہوں وہ بہت معمولی مگر بہت اہم ہے۔

میں نے ان کی آنکھوں میں جھانکا ـــــ 'یاد رکھئے، اس کہانی کا سب سے اہم

حصہ غلام بخش کے آخری ایام ہیں۔آخری وقت میں یہ احساس اس کے اندر پیدا ہوا تھا کہ یہ مکان کیا اتنے برسوں بعد بھی اس کا نہیں ہے؟ اس نے اپنے اس موروثی گھر کے لئے کوشش کی ـــــ ظاہر ہے گھر نہیں مل سکا ـــــ اس نے پاکستان جانے کا ارادہ کرلیا ـــــ ویزا تک بنوالیا ـــــ حقیقت یہی ہے کہ اس نے فوقیت اپنے مکان کو دی۔وہ پاکستان گیا نہیں۔کیونکہ یہ تلخ حقیقت اسے معلوم ہوگئی تھی کہ اب یہی اس کا گھر ہے اور اسے اسی گھر کے لئے کوشش کرنی ہے اور.....'

میں اظہر بائجان، میں نے گھوم کر نوین صاحب کی طرف دیکھا ـــــ جو سکتے کے عالم میں میری طرف دیکھ رہے تھے اور میری ہر بات کے ساتھ ان کے چہرے پر بل بھی پڑنے لگے تھے۔میں توقف سے مسکرایا اور یہ رہی سب سے معمولی، سب سے اہم بات ـــــ مرتے وقت اس نے اپنے ہونے کی آخری کیل ٹھونک دی۔

''مطلب؟'' نوین بھائی نے کرسی پر پہلو بدلا۔

میں دھیرے سے مسکرایا ـــــ ''مرا بھی کم بخت تو اپنے اسی باپ دادا والے پرانے گھر میں ـــــ ایسا کیوں کر ہوا۔اس کا مطلب بتا سکتے ہیں آپ؟''

میں نے غور کیا۔نوین بھائی کے چہرے کا مانس ذرا سا کھنچ گیا تھا ـــــ

آپ اس شہر کا مذاق نہیں اُڑا سکتے

(1)

وہ بہت آرام سے باتیں کر رہا تھا۔ اتنے آرام سے، جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ لیکن شاید جو 'حادثہ' بھی ہوا تھا، کوئی زلزلہ جیسا بھیانک المیہ بھی اتنا خوفناک نہیں ہو سکتا تھا۔ (یہ میرا ماننا ہے۔ میں کون؟ ـــــ میں یعنی کہانی کار) لیکن وہ جیسے ان تمام امکانات سے الگ اپنی سچائیوں کا اظہار کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''نہیں! اس کے لئے شہر قصوروار نہیں ہے۔ سارا کا سارا قصور شہر پر ڈالنا ٹھیک نہیں۔ اگر کوئی قصوروار ہے تو؟..... شہر اگر کسی خوفناک راکشک کی طرح پھیل رہا ہے تو..... سمجھ رہے ہیں نا..... شہر کا کوئی قصور نہیں ہے۔''

جب وہ پہلی بار ٹکرایا تھا تو ایک سیدھا سادا معصوم سا 'گنوڑی' تھا۔ یعنی گاؤں سے آیا ہوا ایک بھولا بھالا جانور۔ کسی بھی بات کی تمیز نہیں تھی۔

''کیسے آئے؟''

''وہاں کام نہیں تھا۔''

''پڑھے ہو؟''

''ہاں، گاؤں کے چھوٹے درجہ تک ہی..... ہی..... ہی۔''

یہاں کیسے، ایسے ہی آ گئے؟''

''گاؤں کا ہی ایک آدمی ہے۔ یہیں رہتا ہے۔''

''اُس نے بلوایا ہوگا۔ کہا ہوگا، یہاں نوکری کی کیا کمی ہے۔ آ جاؤ۔''

''ہاں، یہی کہا تھا اُس نے۔''

''پھر وہ نہیں ملا؟''

''پہلی بار میں نہیں ملا۔''

''بعد میں بچنے کی کوشش کی۔ ہے نا؟''

''ارے آپ تو سب جانتے ہیں۔''

''اس مہانگر میں یہ باتیں، سب ہی جانتے ہیں۔ اب کیا کرو گے،

''سوچا نہیں۔''

''واپس لوٹ جاؤ گے؟''

''نہیں۔''

یہ ایک گنوڑی کا فیصلہ تھا۔ بعد میں جو بھی حادثات پیش آئے وہ شاید اسی مضبوط فیصلے کی دین تھے۔ اُسی کے لفظوں میں ـــــ ''کبھی کبھی شہر وہ نہیں رہتا جیسا کہ ہم یا آپ سمجھتے ہیں۔ ایک بے جان احساس، بے جان سڑکوں، گلی کوچوں، عمارتوں، بھاگتی گاڑیوں میں اپنی موجودگی درج کرانے والا ـــــ اور جیسا کہ اُس نے بتایا ـــــ شہر اُس کے روبرو کھڑا تھا۔ اتنے نزدیک کہ وہ شہر کے دھڑکنوں تک کو سن سکتا تھا...''

مجھے اچھی طرح احساس ہے۔ شہر کہیں پاس میں کھڑا تھا۔ وہ مجھے ایسی عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا کہ ایک پل کو مجھے ڈر کا احساس ہوا۔ لیکن نہیں، وہ مجھے پرکھ رہا تھا۔ پرکھ رہا تھا کہ میں اُس کے گربھ میں رہنے کے لائق ہوں یا نہیں..... یا میں جلد ہی یہاں سے فرار ہو جاؤں گا۔

رات سرکنے تک پلیٹ فارم پر سوئے لوگوں کے خراٹے بجنے لگے تھے۔ کبھی کبھی اس خراٹے کو پلیٹ فارم پر تیزی سے لگنے والی گاڑی کی چیخ توڑنے کی کوشش کرتی، مگر بے سدھ پڑے لوگوں کو تو جیسے نیند پیاری تھی اور وہ کسی بھی طور نیند سے سمجھوتہ کرنے کو تیار نہ تھے۔

میں نے آواز سنی..... کوئی مجھ سے دھیمے دھیمے لہجے میں کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن کون تھا وہ؟ یہاں مجھے جانتا ہی کون تھا۔ جو جانتا تھا، اُس نے صاف لال جھنڈی دکھادی تھی ـــــ لیکن پھر بھی کوئی تھا۔ سرگوشیوں کے باوجود ـــــ پلیٹ فارم پر بجتے خراٹوں اور گاڑیوں کی آوازوں کے باوجود میں اُس کی آوازیں سن سکتا تھا..... کوئی تھا..... بہت ہی قریب..... جو مجھ سے ہی مخاطب تھا ـــــ

''واپس کیوں نہیں چلے جاتے؟''

''واپس!''

''اب پریشان ہو کر اِدھر اُدھر مت دیکھو۔ یہ میں ہوں میں..... شہر.....''

''تم.....''

''حیران ہونے کی ضرورت نہیں..... ذرا سوچو، واپس چلے جاتے تو تھوڑی سی شرمندگی اٹھانی پڑتی۔ بس..... یعنی دو چار روز کے لئے ذرا سا بے شرم ہونا پڑتا۔''

''بس میں بے شرم نہیں ہونا چاہتا تھا۔''

''پاگل ہو۔ یہاں بے شرم کون نہیں ہے..... شہر ہنستا ہے..... رنڈی سے راجنیتی (سیاست) تک..... لیکن وہاں گاؤں میں سب کچھ چار دنوں کے لئے ہوتا..... چار دن میں سب ہنسی اُڑا کر ساتھ گھوم رہے ہوتے۔ موج کر رہے ہوتے۔ اور یہاں..... پلیٹ فارم کے پتھر چبھ تو نہیں رہے؟''

''اگر ہاں کہوں تو؟''

''عادی ہو جاؤ گے۔ شہر کسی سانپ کی طرح پھپھکارا تھا۔ اب بھی وقت ہے، یعنی اتنے جوان ہو تم کہ نصیحت کی جا سکتی ہے۔''

''مجھے تمہاری نصیحت نہیں چاہئے۔''

''نصیحت کی ضرورت تو اب تمہیں قدم قدم پر پڑے گی'' ـــ شہر ہنسا ـــــ ''دیکھو کوئی آ رہا ہے۔ اِدھر نہیں اُدھر دیکھو..... کیا سمجھ رکھا ہے ـــــ

پلیٹ فارم باپ کی جاگیر ہے ـــــ یہاں جتنے بھی بھکاری سوتے ہیں سب ٹیکس دیتے ہیں ـــــ دیکھو وہ پولیس والا سیدھے تمہارے پاس ہی آ رہا ہے..... اچھا..... تو تم اُس سے جتنی مرضی چاہو، اُلجھ لو۔ میں پھر ملوں گا'' ـــــ شہر کی سرگوشیاں سو گئی تھیں۔

اُس نے ادھ کھلی آنکھوں سے دیکھا۔ کوئی پولیس والا تھا جو ڈنڈے سے اُس کے بدن کو ایسے ٹٹول رہا تھا جیسے وہ آدمی نہیں، کوئی سامان ہو۔''

''اے.....؟..... یہاں کون سو گیا ہے.....'' اُس کی آواز بھیانک تھی۔

سہما سادہ اُٹھ بیٹھا ـــــ

''میں..... میں.....''

''میں..... میں کیا..... کوئی نام تو ہوگا۔ اچھا چل ـــــ نام سے کیا لینا دینا۔ یہاں کیا کر رہا تھا؟''

''سو رہا تھا۔''

''سو رہا تھا؟ یہ جگہ تیرے باپ نے بنائی ہے نا؟'' سو رہا تھا؟ چل نکال، جیب میں کتنے پیسے ہیں؟''

''پیسے؟.....''

''ہاں پیسے..... انگریجی نہیں بول رِیا ہوں۔ کم بخت کہاں کہاں سے چلے آتے ہیں؟'' ـــــ اُس نے گندی سی گالی دی ـــــ''

''پیسے نہیں ہیں.....''

اُس کی آواز رات کے اندھیرے میں دور سے آتی ہوئی کسی گاڑی کے شور و غل کے بیچ کہیں کھو گئی تھی۔

''پیسے نہیں ہیں اور یہ جگہ تیرے باپ نے خریدی ہے۔'' ـــــ اس بار اُس نے

ڈنڈا اچھکایا تھا۔ نیم غنودگی میں ڈنڈے کی مار اُس کے پورے وجود کو لہولہان کر گئی تھی۔

گاڑی اسٹیشن پر رُک گئی تھی۔ مسافر اُتر رہے تھے۔ پولیس والے نے ایک بیڑی جلالی۔ ڈھٹائی سے مسکرایا ـــــ ''جا اب اِدھر مت دِکھنا، کیا سمجھے۔ ٹائم کھوٹا کر دیا.....''

وہ اندھیرے میں ایک طرف بڑھ گیا۔ کنارے لوہے کی ریلنگ کے پاس وہ ایک دو مسافر بیٹھے بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ اُس نے بھی ایک کانپتا ہوا ہاتھ ریلنگ پر رکھا۔ تبھی کوئی ہنسا..... زور سے ـــــ اُس نے پلٹ کر دیکھا، کوئی نہیں تھا، مگر کوئی تھا۔ اس بار اُس پر لفظوں سے حملہ کیا گیا تھا۔

''مل گئی نصیحت۔ اب کیا سوچا ہے؟'' یہ شہر تھا..... ''یعنی کوئی بھی گاڑی پکڑ کر گاؤں واپس ـــــ؟''

''نہیں'' ـــــ اُسے کبھی کسی زمانے میں اپنے باپ کی کہی گئی ایک بات یاد رہ گئی تھی ـــــ ''جو دکھ جھیلتے ہیں وہی جیتے ہیں۔ وہ جیتے بھی اسی لئے ہیں کہ دُکھی ہوتے ہیں۔ وہ اسی وجہ سے جیتے ہیں۔ شاید یہ دیکھنے کے لئے کہ کبھی تو..... کبھی تو بدن سے دُکھ کا خاتمہ ہوگا۔''

''تو تم نہیں جاؤ گے؟''

''نہیں ـــــ!''

اُسے احساس ہے۔ شہر کانپ گیا تھا۔ کیوں؟ ـــــ وہ نہیں کہہ سکتا، اگرچہ اُس نے شہر کو دیکھا بھی نہیں تھا۔

(2)

''پھر کیا ہوا؟''

(ایک بار پھر سے بطور کہانی کار مداخلت کے لئے آپ سے معافی چاہوں گا۔ مگر وہ اطمینان بھری نظروں سے اب بھی میری طرف دیکھ رہا تھا۔)

''میں جانتا ہوں آپ میری بات کا یقین نہیں کریں گے۔ ہی ..... ہی ..... ہی ..... آپ اُسے جھوٹ سمجھیں گے۔ ٹھیک اُسی طرح جیسے کوئی آپ سے رات کو یہ کہے کہ یہ دن ہے اور آپ بھولے پن سے اُس کی بات مانتے ہوئے حامی میں سر ہلا بیٹھتے ہیں..... آپ سمجھ رہے ہیں..... ٹھیک ویسے ہی.....''

اُس نے نظر جھکا لی تھی۔ کسی مہانگر میں میرے جیسے گنویڑی کو جو کام مل سکتا ہے یعنی ٹھیلا اُٹھانے، بوجھ ڈھونے سے لے کر مزدوری تک ـــــ پھر ایک دن اُسے مجھ پر رحم آ گیا ـــــ

''کون؟''

''تھا کوئی آپ کی طرح رحم دل؟''

''کہانی کار ـــــ''

''کہانی کار بھی ہو سکتا ہے۔ ہی ہی ..... ہی .....'' وہ ہنس رہا تھا ـــــ وہی بڑی بڑی باتیں۔ غریبی، امیری، دُکھ کے اتہاس کی ـــــ ''آپ سمجھے نہیں؟ ہی ہی۔ دکھ کا اتہاس ـــــ اُسی نیک آدمی نے بتایا تھا مجھے ـــــ'' اتہاس امیروں کا نہیں ہوتا ـــــ امیروں کا صرف جغرافیہ ہوتا ہے۔ کتنی جغرافیائی زمین پر قبضہ کرنا ہے انہیں ـــــ اتہاس صرف دکھی دل والوں کا ہوتا ہے ـــــ میں ایک ٹھیلے کے ساتھ اُس کے گھر پہنچا تھا اور اُس نے مجھ میں کوئی کہانی ڈھونڈ لی تھی۔''

''کہانی ـــــ؟''

''ہاں وہ سارے راستے آپ ہی کی طرح پوچھتا رہا مجھ سے ـــــ یعنی کون ہوں میں۔ کوئی بھوت۔ ہی ہی .....''

''پھر ــــــ؟''

گھر آ کر وہ جذباتی ہو گیا۔ پتہ نہیں، شاید میرے گاؤں کی بدحالی کا سن کر ــــــ اُس کی آنکھیں نم تھیں۔ وہ دھیرے دھیرے کچھ کہہ رہا تھا، یعنی ایسا کچھ جو مجھے سننے میں نہیں آ رہا تھا..... ہاں ٹھیک سے مجھے یاد کر لینے دیجئے۔ وہ کہہ رہا تھا ــــــ دنیا میں جب تک ایک بھی آدمی۔ ایک بھی آدمی تمہاری طرح ہے ــــــ سچ میں اپنے آپ کو نہیں روک پاتا ــــــ ایسا کیوں ہے؟ ایک طرف ایک حیران کرنے والی دنیا ہے۔ فلمی گلیمر، ڈسکوتھک سے ڈزنی لینڈ تک۔ ڈسکوری چینل سے ایم ٹی وی تک۔ اور ایک طرف تم لوگ ہو ــــــ کیڑے مکوڑے ــــــ ایک طرف اس گلوبل ویلیج میں انٹرنیٹ اور سائبر اسپیس تک پھیلے ہوئے، کمپیوٹر کی طرح مشتعل کرنے والے دماغ ہیں ــــــ اور دوسری طرف تم ہو ــــــ اسپیس ایج اور کلوننگ کی طرف بھاگتے ہوئے ہم سکھ اور شانتی کے کلون کیوں نہیں بناتے ــــــ؟ تم کیوں رہ جاتے ہو، ہر بار ہمارے پاس ــــــ ہمارے پاس..... رونے کے لئے ــــــ دُکھ کے لئے۔ اُس نے میرا ہاتھ پکڑا تھا ہی ــــــ ہی ہی..... کہا تھا ــــــ ''رہ جاؤ یہیں۔ بہت پیسہ ہے میرے پاس۔ اس میں تمہارا حصہ بھی ہے۔ کیوں؟..... کیوں نہیں؟..... دُکھ شیئر کرتے ہو تم مجھ سے۔ میں تم سے سکھ شیئر کروں گا۔''

ــــــ ''اُس نے سکھ شیئر کیا ــــــ''

''ہاں، کیا ــــــ اُس کے پاس واقعی بہت پیسہ تھا۔ اُس کی بڑی سی حویلی کے بڑے سے صحن کو میلا کرنے کے لئے روز میرے جیسے کتنے ہی آ جاتے۔ وہ نعرے لگاتے..... چیختے چلّاتے۔ وہ چپ کراتا۔ پھر وہ سب کو لے کر پتہ نہیں کہاں نکل جاتا۔ لوگ کہتے ہیں.....''

—— ''نیتا ہے۔''

''نہیں، وہ کیا ہے۔لال منڈل۔کمنڈل ہی..... ہی..... جانے دیجئے..... وہ بس وہی تھا۔ اُس کے چہرے پر بھی کافی لالی تھی مگر—— اُس کی بیوی کسی دوسرے مرد کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ بچے باہر ملک میں پڑھتے تھے۔وہ اکیلا تھا اور ہمارے دُکھ سنتا تھا۔اپنے سکھ شیئر کرتا تھا۔''

—— ''پھر؟''

میں وہیں رہنے لگا۔ایک طرح سے اُس نے روک لیا تھا مجھے۔''تم..... تم اب یہیں رہو گے۔سمجھ گئے نا؟ ٹھیلہ——؟ انسان،انسان کو بٹھا کر رکشہ کھینچتا ہے—— تم ٹھیلہ کھینچتے ہو—— سماج واد کیسے آئے گا بھائی۔آں.....؟'

وہ سچ مچ بہت دُکھی تھا۔اُس نے مجھے باہر والا ایک چھوٹا سا کمرہ دیا۔کہا،اپنے سامان یہیں لے آؤ۔یہیں کھانا بناؤ۔کھانا کھاؤ،مستی کرو۔تھوڑا بہت صحن میں آنے والے لوگوں کے ساتھ چیخو چلاؤ۔بس، مجھے کام سمجھا کر وہ اپنے دوسرے کاموں میں مصروف ہو گیا تھا۔اُس رات..... اُس رات..... ہاں اُس رات مجھے اچھا لگا۔ چلو مہانگر میں ایک بھلے آدمی سے ملاقات ہوئی۔ایسے آدمی، ایسے عظیم شخص..... رات مجھے دیر تک نیند نہیں آئی۔وہ آدمی، اُس کا چہرہ بار بار مجھے یاد آتا رہا۔مگر اچانک پتہ نہیں کیا ہوا، میں چونک گیا۔وہی سرگوشیوں والی آواز..... کوئی میرے قریب تھا۔بہت قریب اور—— یقیناً یہ شہر تھا اور میں شہر کی دھڑکنیں سن سکتا تھا۔

''کیا تم مجھے دیکھ رہے ہو؟''

''نہیں۔''

''دیکھو مجھے''—— شہر نے مجھے ڈانٹ پلائی تھی۔

خوف زدہ ہوکر میں نے آواز کی سمت دیکھا۔ وہاں خوف اور شک کے میل سے ایک ٹیڑھی میڑھی شبیہ بن گئی تھی ـــــ تو کیا یہ شہر تھا؟

''ہاں، یہ میں ہوں۔''

مجھے ڈر سا لگا۔

شہر نے مجھے پھر خبردار کیا ـــــ ''واپس کیوں نہیں چلے جاتے ـــــ اچھا مت جاؤ لیکن میری بات سنو ـــــ یہاں صرف اپنے دماغ کی سنو ـــــ لفظ، زبان کے جادو میں مت پھنسنا ـــــ کیوں کہ یہ صرف مہانگر نہیں مایا نگری ہے ـــــ اور ہر مہانگر مایا نگری ہوتا ہے۔ جینا ہے تو حساس مت بننا ـــــ رسّی بننا، کنویں کا پتھر مت بننا ـــــ جسے رسی گھس دیتی ہے۔ سمجھ رہے ہو نا۔''

شہر غائب تھا.....

وہ ٹیڑھی میڑھی شبیہ ـــــ شہر اب کہیں بھی نہیں تھا۔

مجھے ڈر سا لگا۔ شہر کا چہرہ اتنا عجیب سا کیوں ہوگیا تھا ـــــ کیا شہر ہنس رہا تھا ـــــ؟ کیا شہر رو رہا تھا ـــــ؟ میں بار بار شہر کے پیکر کو ٹٹول رہا تھا اور ہر بار شہر کا چہرہ پیلی دھوپ کی طرح لہولہان ہوتا مجھے نظر آ رہا تھا۔

(4)

''پھر ـــــ؟''

کہانی کار ہونے کے ناطے، میرے اشتیاق کا اچانک بڑھ جانا ضروری تھا۔

''پھر'' گنویڑی اپنی سوچ میں گم تھا ـــــ ''پھر شاید ہم ہی غلط ہوتے ہیں۔ ہر جگہ۔ وہ نیک آدمی تھا، بھلا مانس۔ شروع میں دو بار ایک ہی ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ کر اُس نے مجھے کھانا بھی کھلایا۔ دو بار ـــــ مجھے یاد ہے۔ وہ میری کوٹھری میں کھانے

کی اپنی اور میری تھالی لے کر آ گیا تھا ـــــ ''جو مزہ زمین پر بیٹھ کر کھانے میں ہے.....'' پھر ایک دن اُس نے میری تعریف کی ـــــ تم وہاں، فلاں جگہ جس طرح چلائے تھے، سمجھ رہے ہو نا..... تم جیسے چلائے تھے۔ اُس وقت وہاں تم، تم نہیں تھے۔

''پھر کون تھا؟''

ـــــ ''اس وقت تم میں ہزاروں، کروڑوں غریبوں، جدوجہد بھرے ہاتھوں کی نمائندگی ہو رہی تھی ـــــ نمائندگی ـــــ اور کون کر رہا تھا ـــــ؟ تم ـــــ تم میں ایک انقلابی کا غصہ اُبھر آیا تھا۔ یہ اصل تم تھے، یعنی تم جو دِکھتے ہو، تم وہ نہیں ہو ـــــ تم یہ ہو ـــــ فائر، آگ ـــــ تمہارے اندر ایک پورا آتش دان چھپا ہے ـــــ سمجھ رہے ہو نا تم ـــــ آج میں سارے راستے، تمہاری جلتی آنکھیں، جلتا وجود اور بھنچی ہوئی مٹھیوں کو پڑھتا آیا ـــــ اسے رکھو، رکھو پیارے ـــــ ہمیشہ قائم رکھو۔''

گنویڑی کی آنکھوں میں چمک تھی..... ''اُس رات بھی دیر تک خالی زمین پر میں کروٹیں بدلتا رہا..... لفظ..... مایا جال۔ اُس کے لفظ بار بار چوٹ کر رہے تھے..... فائر..... آگ..... اسے قائم رکھو..... تمہارے اندر..... ایک آتش دان..... چھپا ہے..... آتش دان.....''۔

''آہ.....''۔

میں نے اچانک آواز سنی..... کوئی تھا۔ جو نہ رو رہا تھا، نہ ہنس رہا تھا ـــــ نہ دُکھی تھا نہ سکھی تھا ـــــ کوئی تھا، میرے بہت قریب ـــــ اور یقیناً یہ شہر تھا۔ وہ پورے زور سے چیخا تھا ـــــ

''میرا اپیکر تک دیکھ چکے ہو۔ اب جہاں ہو وہیں رہو۔''

''لیکن تم کیوں آ جاتے ہو۔ ہر بار، ہر رات؟''

''میں سب کے پاس جاتا ہوں ـــــ شہر کی آواز میں بے رُخی تھی۔ جو بھی آتا ہے، نیا اجنبی اس شہر میں۔ اُسے سمجھانا میرا کام ہوتا ہے۔''

ـــــ ''مجھے سمجھا چکے۔''

''نہیں.....'' شہر رنجیدہ تھا۔

ـــــ ''سمجھانا بھی مت، اب مجھے راستہ مل گیا ہے۔''

''خوب'' ـــــ شہر نے پھر مذاق کیا۔ ''وہ تمہارے ساتھ اٹھتا بیٹھتا، کھاتا پیتا ہے اس لئے.....''

''ہاں!''

ـــــ ''اور تم..... بدلے میں تم کیا کرتے ہو ـــــ اُس کے ساتھ ـــــ جگہ جگہ جاتے ہو، گلا پھاڑ کر چلاتے رہتے ہو۔ جانتے ہو تم جیسی قوم اب اس مہانگر میں کیا کہلاتی ہے۔''

''مجھے نہیں سننا۔''

ـــــ ''مت سنو، کل تک پیسوں کے لئے چلانے والے کہلاتے تھے تم..... اب نہیں..... آگے جان کر کیا کرو گے۔ مگر چلاتے چلاتے تمہارا گلہ درد نہیں کرتا ـــــ؟''

''کرتا ہے۔''

ـــــ ''پھر ایک دن گلہ پھٹ گیا تو؟''

''تو؟''

''تمہیں کیا لگتا ہے۔ وہ تمہیں اپنے بغل میں جگہ دے گا۔ یعنی اپنے کمرہ میں، اپنے ڈرائنگ روم، اپنے گھر کی اُس کی کوٹھری میں جو تم کو دی ہوئی ہے.....؟ وہ سیاست کرتا ہے تم سے۔''

''نہیں، اُس کے پاس اصول ہیں۔''

''پاگل ہو۔ اصول اور سیاست سب ایک دوسرے میں مل گئے ہیں۔ اب ـــــ عجب گھال میل ہے۔ سیاست اور اصول نے ہر اگلی سیڑھی کیلئے کئی تعریفیں ڈھونڈ لی ہیں ـــــ ایک قدم والی سیاست، دوسرے قدم پر نئے روپ بدل لیتی ہے ـــــ جو رات میں اصول بنتے ہیں، صبح آتے آتے برباد ہو جاتے ہیں ـــــ جیسے جیسے سیاست گھومتی ہے اصول محور کی طرح اُس کے اردگرد چکر لگاتے رہتے ہیں ـــــ یعنی سیاست کون سی کروٹ لے رہی ہے ـــــ جس کروٹ لے رہی ہے اصول، قاعدے قانون کو اُسی سمت مڑنا ہوتا ہے۔ جانے دو تم نہیں سمجھو گے، جب سمجھو گے تو.....''

شہر سنجیدہ تھا۔ اُسی طرح جیسے آدمیوں کے چہرے پر آڑھی ترچھی لکیریں اُبھر آتی ہیں۔ میں اُس چہرے کا صرف تصور کر سکتا تھا، یعنی ایسی بے شمار آڑی ترچھی لکیریں شہر کے چہرے پر بھی اُگ آئی ہوں گی۔

''مجھے ایسا کیوں لگا۔ پتہ نہیں۔'' پھر بھی شہر سنجیدہ تھا۔

گنویڑی کچھ سوچ میں پڑ گیا تھا۔ مجھے ایسا بالکل نہیں لگا تھا۔ میرے لئے حیرت کی بات یہ تھی کہ میری اتنی کامیابی پر شہر فکرمند اور سنجیدہ کیوں ہے؟

''تو کیا حالات بدلے۔'' یہ ایک بار پھر کہانی کار کی مداخلت تھی۔

گنویڑی دھیرے دھیرے کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا۔

(5)

مجھے یاد ہے۔ اُس دن پھر وہ میری کوٹھری میں حاضر تھا۔ اُس کے چہرے پر گہری خاموشی تھی۔ کسی نئی بات کے لئے شاید وہ لفظوں کو چننے کی کوشش کر رہا تھا۔

''ایک جلسہ کرنا ہے مجھے ـــــ بتانا ہے کہ تم ہو ـــــ'' اس لئے ہم ہیں ـــــ

یا شاید اُس کی آنکھیں پوری طرح میرے چہرے پر گڑی تھیں۔

''سمجھ رہے ہونا۔ جلسہ کرنا ہے.....'' وہ کہیں اور دیکھ رہا تھا۔ مجھے اُس کی آواز کہیں بہت دور سے آتی سنائی دے رہی تھی ـــــ نہیں سمجھو گے تم لوگ ـــــ لیکن سب کچھ بدل گیا ہے۔ دھرتی بھی اور دھرتی پر رہنے بسنے والا انسان بھی ـــــ سمجھ رہے ہونا ـــــ اختیار، تعلق، رشتے، سب معنی بدل گئے ہیں ـــــ ختم ہوتی ملینیئم صدی میں صرف دو چیزیں رہ گئی ہیں ـــــ صارف اور صنعت ـــــ پروڈکٹ اینڈ کنزیومر ـــــ ایک فروخت ہونے والی شئے ہے اور ایک بیچنے والا ہے ـــــ سب برانڈ ہیں یا بن گئے ہیں ـــــ رشتے بھی ـــــ پہلے دنیا کی تمام بڑی کمپنیاں اپنے اپنے برانڈوں کو ہندوستان کے عظیم بازار میں پیش کرنے کے لئے دن رات مصروف رہتی تھیں۔ سوئی سے ہوائی جہاز تک، کوک سے پیپسی تک ـــــ لیکن اب بساط الٹ گئی ہے۔ کل ہندوستان بازار میں آنے والی بین الاقوامی کمپنی پر ہنگامہ ہوتا تھا ـــــ **ملک**، بیداری، عوام اور بھارتیتا کی دُہائی دیجاتی تھی اور اب ـــــ وہ بھی آ رہے ہیں اور ہم بھی ـــــ یعنی ہندوستانی بھی سارے تعلقات اور ماضی بھول کر صرف اور صرف صارف اور برانڈ بن چکے ہیں۔

وہ اچانک اُس کی طرف مڑا تھا۔

''جیسا کہ میں نے کہا ـــــ مجھے ایک جلسہ کرنا ہے۔ سمجھ رہے ہو نا تم ـــــ تم غریبی کا برانڈ بن جاؤ ـــــ تمہیں غریبی کا برانڈ بننا ہی ہوگا میرے لئے ـــــ''

اُس کے آخری لفظ پر میں چونک گیا تھا ـــــ ''آخر اتنا خرچ کیا ہے میں نے تم پر، تمہاری ذات پر۔''

وہ چپ چاپ کمرہ سے نکل گیا تھا۔ گنویڑی کی آنکھوں میں دہشت تھی۔ اُس

رات میں نے ایک بے چین کرنے والا خواب دیکھا۔ میں نے دیکھا ـــــ یہ اُسی کا گھر ہے۔ گھر میں سب چیزیں پڑی ہیں۔ ٹی وی، فریج، واشنگ مشین، ائیر کنڈیشنر اور ـــــ ان میں ہی کہیں بیچ میں، میں کھڑا ہوں..... یعنی کنزیومر ـــــ محض ایک پیدا کرنے والی چیز..... میرے جسم میں سنسنی ہوئی، میں شاید زور سے چیخا بھی تھا۔

میں نے دیکھا ـــــ شہر میرے بغل میں کھڑا ہے۔ مجھے آنکھیں دکھا رہا ہے۔

''اب..... اب کیا کروگے؟''

''جیسا وہ چاہتا ہے'' ـــــ میری آواز صحیح معنوں میں گھبرائی ہوئی تھی۔

ـــــ ''پروڈکٹ بننے کے لئے تیار ہو تم؟''

''راستے کل بھی میرے پاس نہیں تھے۔''

ـــــ ''یعنی پروڈکٹ بن جاؤ گے؟''

''لیکن وہ میرا کیا کرے گا۔''

شہر ہنسا ـــــ ''انجان ہو، بھولے بھالے معصوم، پاگل ـــــ اُس نے تم سے تمہاری غریبی نہیں سب کچھ مانگ لیا ہے۔ سنو! وہ صحیح معنوں میں تمہارا استحصال کر رہا ہے۔ اُس کا سارا فلسفہ یہیں تک محدود تھا۔ یعنی تمہیں عالمی کمپنی کے دروازے تک لانے کے بیچ ـــــ سنو، کھل کر کہوں تو دنیا میں ہندوستان کی غریبی فروخت ہوتی ہے۔ اور وہ بس تمہیں فروخت کرنا چاہتا ہے ـــــ سونے کی قیمت میں۔

شہر اچانک مجھ پر غصہ ہوا تھا۔ مجھے لگا، اب کسی بھی پل وہ مجھے مار بیٹھے گا ـــــ بولے گا ـــــ سالے اور کوئی جگہ نہیں ملی ـــــ یہاں کیوں آیا ـــــ یہاں عمارتیں بستی ہیں آدمی نہیں اور تم ابھی اس مہذب سماج میں عمارت نہیں بنے۔ ابھی بھی

نہیں، تم ابھی معمولی آدمی ہو، بس۔

شہر مجھ پر کھلکھلا رہا تھا۔ اس طرح جیسے میں اُس کی نظر میں کوئی مسخرہ تھا۔ ریڈی کیولس مین ـــــ نہیں، شاید یہ غلط تھا ـــــ شہر نے تو مجھے دیکھنا تک بند کر دیا تھا ـــــ اب یہ کوئی اور تھا ـــــ میرے جیسا ہی ـــــ جو اچانک اس شہر میں آ نکلا تھا اور شہر اُس کے ساتھ بھی وہی سلوک دہرانے والا تھا جو میرے ساتھ کر چکا تھا۔

(6)

''پھر ـــــ؟''

میں نے سوچ لیا تھا۔ بحیثیت کہانی کار اب اس کے بعد میں کوئی سوال نہیں کروں گا۔ سچائی یہ تھی کہ مجھے اس کی اس کہانی سے اب ڈر لگنے لگا تھا۔ سچائی یہ تھی کہ اُس کی کہانی میں بھی، جیسا کہ اُس نے بہت سارے اگر مگر کے بیچ بتایا۔ یا تو وہ آدمی سیاست داں تھا یا کہانی کار ـــــ یا جیسے دونوں ایک دوسرے میں مل گئے تھے ـــــ صنعت اور صارف کی طرح..... اور شاید اسی لئے اب مجھے اُس سے اُلجھن ہو رہی تھی ـــــ جب کہ مجھے اس کہانی کا اختتام معلوم تھا۔ یا یہ کہ ایسی کہانیوں کا اختتام یہی ہوتا ہے۔ پھر بھی اپنے تجسس کو باقی رکھتے ہوئے آخری بار میں نے پوچھ ہی ڈالا ـــــ

''اور اُس کے بعد؟''

گنویڑ ینے اپنی خاموشی توڑی۔ گہرا سانس لیا ـــــ

اور پھر ـــــ جیسا کہ مجھے یقین نہیں ہوا ـــــ وہ جلسہ گھر، وہ جلسہ ـــــ وہ کھادی کی ٹوپیاں ـــــ وہ سر ہی سر۔ کیا وہ بھیانک اندھیرا تھا ـــــ ایک خوفناک خواب تھا ـــــ

ہوا کیا تھا؟ میں نے ڈر کر پوچھا ـــــ ''کیا کنٹھ کام نہیں آئے، گلا سوکھ گیا؟''

''نہیں..... آہ..... اسی کا تو افسوس ہے۔'' ـــــ اُس کے چہرے پر عجب سی فریاد تھی۔ آپ یقین نہیں کریں گے، میں بھی چیخ رہا تھا۔ مگر..... بازو..... بازو، اپنی جگہ ٹکا ہوا تھا۔ ہونٹ چیخ رہے تھے، مگر جسم کے دوسرے اجزاء نے اچانک ہڑتال کر دی تھی۔ پیر ساکت و جامد تھے۔ ہاتھ بے جان تھے اور اچانک ـــــ سب میری طرف گھورنے لگے۔ میں نے اُس کے چہرے پر غصے کو پڑھا۔ اُس کی ہتھیلیوں میں پتھر تھا۔ خاکی ٹوپیاں دھیرے دھیرے کھسک رہی تھیں۔ وہ تیز چیختا ہوا پتھر اُٹھا کر مجھے مارنے کو جھپٹا تھا۔ اور..... اور..... نہیں جانے دیجئے۔

گنویڑی کے دانت اس شدید گرمی میں بھی بج رہے تھے، ''جانے دیجئے۔ آگے کی داستان کا آپ کیا کریں گے۔ اُس رات میں نے کہاں گزاری، یہ بھی جانے دیجئے.....''۔

'مگر وہ میرے بے حد قریب کھڑا تھا۔ ارے وہی شہر۔ اُس کا دھندلا پیکر چپ چاپ میرے سامنے لمبا ہو گیا تھا۔ پھر میں نے اچانک اس کے پیکر کو ٹوٹ کر گرتے دیکھا۔ ہاں ـــــ یقین کریں آپ ـــــ کیا میرے لئے شہر مر گیا تھا ـــــ یا شہر کے لئے میں مر چکا تھا ـــــ شاید شہر کو اب مجھے ٹوکنے، روکنے یا غصہ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ شہر کی نظر میں، میں ایک بے ضرر انسان تھا۔ یعنی لاچارے مائی باپ، جس پر نہ رویا جا سکتا ہے، نہ ڈھنگ سے ہنسا یا اُداس ہوا جا سکتا ہے۔

اور اُسی پل میں نے فیصلہ کر لیا کہ.....''

بوڑھے جاگ سکتے ہیں

اور وہ واقعہ ہو گیا جس کے بارے میں وپن لال سوچتے تھے کہ نہیں ہونا چاہئے تھا..... لیکن کیوں نہیں ہونا چاہئے تھا، کا جواب فی الحال ان کے پاس نہیں تھا..... آخر کیوں نہیں ہونا چاہئے تھا ــــــ؟ وہ بہت دیر تک بلکہ کہنا چاہئے کہ دوسرے بہت سے سوالوں سے فارغ ہو کر جیسے بس اسی سوال تک لوٹ آتے۔ بالکل ہونا تو یہی چاہئے تھا اور آخر بچوں نے انہیں سمجھ کیا رکھا ہے؟ ایک کھوسٹ بیکار بڈھا۔ بڈھے وہ خود ہوں گے ــــــ آئینے کے سامنے کھڑے ہوں تو چندیا کے کالے بال اب بھی ایسے چمکتے ہیں کہ جوان آدمی بھی رشک کھا جائے اور ابھی بھی، انہوں نے جیسے خود کو چھو کر دیکھا اور مطمئن ہو گئے کہ ہاتھوں کی مچھلیاں اور پیروں کے پٹھے تو اس طرح پھڑکتے ہیں جیسے تالاب میں ایک پتھر اُچھال دو۔ پھر دیکھو جوش، حرکت اور ترنگیں ــــــ اور آخر انہیں ایسا محسوس کرنے کا حق کیوں نہیں ہے ــــــ اور انیل ــــــ کیا اسے چاہئے تھا، کہ اپنی ماں یا اس سے، یعنی اپنے باپ سے اس طرح کے واہیات سوال پوچھے ــــــ کہ آخر آپ....

.....انہیں تعجب ہے، آداب و اخلاق کے اس صفحہ پر آخر روشنائی کیسے گر گئی جس پر انگلی پکڑ کر بچپن میں انہوں نے انیل کو سبق رٹوائے تھے۔ نہیں..... انہیں کسی بات پر تعجب نہیں ہونا چاہئے..... مگر..... ساٹھ سال کا ایک بوڑھا اپنی مرضی سے اپنی بیوی کے ساتھ سونا چاہے تو بچوں کی نظر میں، اس میں حیرانی کی کون سی بات ہے ــــــ؟ کیا ساٹھ سال کے بڈھے کو.....

نہیں وپن لال، گھر خاندان کا پورا جغرافیہ بدل چکا ہے اور تم بڈھے ہو چکے ہو..... ساٹھ سال کے..... ساٹھ سال مطلب، ایک بوڑھا کھوسٹ، سامنے ہر پل موت دیکھتا ہوا بڈھا۔۔۔۔ اور بیوی بھی کیسی..... ساٹھ سال کے آدمی کی بیوی۔۔۔۔ جس کے چہرے کی جھریاں بدن کی جھریوں سے زیادہ اداس اور بے جان ہوں۔ بدن کے ڈھیلے، جھرجھر، لتھڑے مانس، جہاں جگہ بناتی ہوئی دنیا بھر کی بیماریاں ہوتی ہیں اور ہوتی ہے بیزاری، لمبی تھکن..... ایسی بیوی جو زندگی کی سیڑھیاں در سیڑھیاں چڑھتی ہوئی، تجسس کے سارے سوال طے کرتی ہوئی آخر میں بس یک بے رس جواب رہ جاتی ہے۔ ایسی بیوی..... اور بچے پوچھتے ہیں..... آخر آپ کیوں سونا چاہتے ہیں، ساتھ ساتھ؟''

وپن لال اپنے آپ کو چھو کر ٹٹول کر محسوس کرانا چاہتے ہیں کہ وہ بوڑھے ہو گئے ہیں۔ لیکن اندر سے کوئی جھلا کر صاف انکار کر دیتا ہے۔ مان لو اگر اُن کی عمر سو برس ہوئی تو۔۔۔۔؟ ذرا اپنے آپ کو غور سے دیکھو..... یعنی اگر چالیس برس اور ہوئی تو..... چالیس سال کی عمر بھی اپنے آپ میں بھگوان کی دی ہوئی نعمت ہے۔۔۔۔ اور چالیس برس اپنے اندر کتنے ہی موسم، بچپن، لڑکپن، جوانی اور ادھیڑ پن کی داستانیں سمیٹے ہے..... کتنی کتنی داستانیں..... اندر سے کوئی چڑچڑا ہو کر گالیاں بکتا ہے۔۔۔۔ چہرے کے مانس بھنچ جاتے ہیں۔ ماتھے پر بل پڑ جاتے ہیں۔ وہ ایک بار خود کو چھو کر ٹٹولتے ہیں اور خاموش ہو جاتے ہیں۔ ریٹائر ہو گئے تو کیا ہوا؟ وہ ابھی جوان ہیں۔ اور ابھی بہت دنوں تک جوان رہیں گے اور جوان ہیں اس لئے.....

کھانے میں کریلا انہیں کبھی پسند نہیں آیا۔ بڑھاپے کا احساس ان کے پورے وجود کو کریلے جیسا کڑوا بنا دیتا ہے۔ سب سے گھناؤنی چیز بڑھاپا ہے..... نہیں.....

یہ جوعمر ہے..... عمر، جو دھیرے دھیرے بڑھتی ہے اور ہمارے معاشرے میں 40 پار کرتے ہی اس شخص کو طرح طرح سے دیکھنا شروع کر دیا جاتا ہے ـــــ دیکھا، بڈھا کیسے گھور رہا تھا۔ فلاں کی عورت سے کیسے مزے مزے کی باتیں کر رہا تھا۔

غیر ممالک میں تو اس عمر میں آ کر تجربے سانس لیتے ہیں۔ معنویت گہری اور پختہ ہوتی ہے۔ عورتوں کا رجحان بھی ایسے تجربہ کار بوڑھوں کی طرف مخصوص ہوتا ہے۔ مگر ان کے یہاں، اس ملک میں..... اب یہ اڑوس پڑوس کی گندی ذہنیت والے، ذرا باہر نکل کر فلم انڈسٹری کی طرف نظر ڈالیں۔ دھرمیندر ہے، دلیپ کمار ہیں، جتیندر ہیں۔ اس عمر میں کیا کیا لٹکے جھٹکے ہیں۔ ہیروئنوں کے ساتھ باغوں میں مٹک مٹک کر گانا ہو رہا ہے..... اور وہ..... وپن لال اس عمر میں سٹھیا گئے ہیں۔ گانا چھوڑ تفریح کے لئے دو بول نہیں بول سکتے۔ آخر کیوں بھئی۔ کیوں کہ وہ ساٹھ برس کے ہو گئے ہیں۔ اس لئے..... ساٹھ برس، مطلب ایک مقدس ہستی..... اور بچوں کو حق حاصل ہے کہ وہ اس مقدس ہستی کی پریتما بنا کر، گھر کے کونے کھدرے میں ڈال کر ان کی توہین کر سکیں۔ اپنے دل کی بھڑاس نکال سکیں۔

ولوڈیئر..... وپن لال کا شارٹ فارم ہے۔ جب کبھی تنہائی میں ہوتے ہیں تو مزے لے لے کر خود کو اس نام سے یاد کرتے ہیں۔ اور خوش ہوتے ہیں..... ولوڈیئر۔ وہ خود مسکراتے ہوئے کہتے ہیں..... جانتے ہو اس عمر میں بوڑھے لوگ متقی اور پرہیز گار کیوں ہو جاتے ہیں..... نہیں جانتے..... ہاہا..... تو سنو..... نہیں، تم ہنسنے لگو گے..... حیرانی کی بات نہیں ہے ولوڈیئر..... بڑھاپا آیا تو محسوس ہوا جوانی کے سارے گناہ ایک طرف۔ اب جو یہ بڑھاپا سامنے ہے..... یہ بڑھاپا..... اس کا احساس، یہ سب سے بڑا گناہ ہے..... اور ولوڈیئر..... ہنسو نہیں۔ یہ انکشاف ہوتے

ہی کئی بوڑھے بستر پکڑ کر عبادت اور دھرم سے ناطہ جوڑ لیتے ہیں..... نہیں یقین ہے تو بتاؤ..... بوڑھے آدمی کو لوگ عبادت اور شردھا کی دستو کیوں بنا دیتے ہیں۔ کیوں کہ گھر کا ایک آدمی گودام میں رکھے، پکے آم کی طرح زندگی کی اتنی گرمی کھا چکا ہے اور اتنا سنکی اور بوڑھا ہو چکا ہے کہ بس ـــــ آشیرواد دینے اور پاپ پنیہ کی باتیں چھوٹوں کو بتانے تک زندہ ہے ـــــ وپن لال ہنسو نہیں۔ اب تمہیں بھی بچوں نے ایسی ہی پریتما بنا کر گھر کے کونے کھدروں میں ڈال دیا ہے..... آشیرواد دینے اور پاپ پنیہ کی باتیں سنانے کے لئے۔

وپن لال کو لگتا ہے جیسے سب انہیں چڑھا رہے ہوں..... انہیں جی بھر کر غصہ آتا ہے۔ پاگل ہیں سب کے سب..... بدھو، بے وقوف، جبکہ سب کے سب جانتے ہیں سب کو بوڑھا ہونا ہے ایک دن۔ اگر بوڑھے ہونے سے پہلے مر نہیں گئے تو..... پھر جب انہیں بھی ان کی ہی طرح عقیدت کے وار پر چڑھایا جائے گا تو؟ الو کے پٹھے! باہر سے ہنستے ہنساتے آئیں گے اور ان کے سامنے آتے ہی پتھر بن جائیں گے..... ہنسی، قہقہوں اور رنگینیوں کی باتیں ایسے رک جائیں گی جیسے عبادت گاہ میں، ہاتھ میں چپل لئے احترام سے داخل ہو رہے ہیں۔ بس یہاں تک..... اس کے آگے ہماری اپنی آزادی کا شہر ہے اور اس شہر میں ہماری بے باک ہنسی ہے۔ زندہ دلی اور قہقہے ہیں اور عریاں مناظر کی نشیلی وادیاں ہیں.....

عریاں مناظر ـــــ بوڑھی نسوں میں کھنچاؤ کے لئے کچھ تو چاہئے..... شریانوں میں دوڑنے والے گرم گرم خون کے لاوے کو محسوس کرتے ہیں وہ..... سب کی سب، آس پاس گھومتی لڑکیاں ـــــ ان کی بہو اور پوتیاں تو نہیں ہیں..... پھر گرما گرم خیال کے تندور میں سینکی جانے والی روٹیوں تک ان کی پہنچ کیوں نہیں ہو سکتی؟

کیا جل جائیں گے وہ..... یا ذہن کچوکے لگانے لگے گا کہ سالے بڈھے حرامی پن سے باز آ..... دیکھ اپنی عمر..... اس عمر کی تیری پوتیاں ہیں۔ بہو ہے۔ لڑکیاں ہیں..... یہ سب ان کی سنسکرتی میں سمائی جھوٹی آستھائیں ہی تو ہیں..... سب بھلا ایک کیسے ہوسکتی ہیں۔ بہو بہو ہے، غیر تو غیر ہیں..... سب ایک ہوتے تو بھلا سمبندھ کیسے ممکن تھے۔ نہیں وپن لال..... غلط اگر غلط ہوتا تو من میں وچار ہی کیوں اٹھتے۔ جب کنوارے پن میں یہ وچار آتے تھے تو سوچتے تھے جلواب نہیں آئیں گے۔ نلنی آگئی تو سوچا چلو ایک زندہ کتاب آگئی ہے۔ کھیلنے، خوش ہونے کو..... بستر سے سانٹھ گانٹھ رکھنے اور دوستی نبھائے جانے والے، بھٹکتے سلسلوں کو ایک منزل ضرور مل گئی..... مگر منزل کہاں..... خیالوں کی حسین آوارگی کی اپنی جنت ہے اور یہ جنت تو عمر کے ہر دور کو ذائقہ دار لذیذ ترین کھانے کی طرح پسند ہے۔

وقت گزرا۔ سال پر سال گزرے..... انیل، وکاس اور لجو کے ساتھ ذمہ داریوں کی پتوار بھی سنبھالنی پڑی۔ مگر وہ بھٹکتے سلسلوں والی آوارگی کی حسین جنت..... مسائل اور الجھنوں سے گھبرا کر وہ اس جنت کے اسیر ہو جاتے ہیں اور ایک ندامت بھرے لطف میں اپنی الجھنیں پیوست کر کے آزاد ہو جاتے ــــــ تین بچے..... عمر کی ڈالی جیسے اچانک پھلوں سے بھر گئی اور جھک گئی..... جھول گئی..... پھل نہیں آئیں تو کہاں جھکتے ہیں پیڑ ــــــ بچوں میں پر پھوٹتے رہے اور بچوں میں پھوٹتے پروں، کو موٹی موٹی کتابوں سے بھرے تھیلوں کو دیکھتے دکھاتے بھی وہ اپنی نلنی میں جیتے ضرور تھے اور اپنی مخصوص دنیا میں بھی..... جہاں گھر، بال بچوں کی فکر سے بے نیاز عریاں مناظر کی نشیلی نشیلی وادیاں ہوا کرتیں اور پھر جیسے پانی میں ایک پتھر چمکا ــــــ موجوں میں کچھ دیر ہلچل مچی اور ایک لہر ساری لہروں کو ملاتی ہوئی

شانت اور غائب ہوگئی ـــــ وپن لال کو کچھ بھی بُرا نہیں لگتا..... کہ اپنی گھر گرہستی کے بعد آوارگی کی اس حسین جنت میں داخل ہونے کی ضرورت ہی کیا ہے..... وہ کبھی جرم اور گناہ کے بہاؤ میں نہیں بہے۔ وہ اسے بھی ایک ضرورت مانتے تھے اور کبھی کبھی تو نلنی کے مچلنے پر مذاق میں کہہ دیتے.....

''آج نہیں ـــــ ارے کیا بتاؤں ـــــ آج تو تمہاری دودھ والی یا وہ جوتر کاری سبزی بیچنے آئی تھی اس کے سنگ ـــــ یا مسز فلاں کے ساتھ ـــــ یا پڑوس کی نئی گورنس کے ساتھ خیالی سیر سپاٹے کو نکل گئے تھے۔ بس.....''

''بک.....'' نلنی آنکھیں تریرتی تو وہ زور سے قہقہہ مار کر ہنس پڑتے۔ کبھی سناٹے میں جب سارا شہر سو جاتا، نلنی اس کے کھلے سینے کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی ہوئی پوچھتی.....

''ایسا صرف تم کرتے ہو یا دوسرے مرد بھی.....''

''کیا جانوں۔ پر سب کرتے ہوں گے۔ کیوں، تم لوگ..... تم لوگ نہیں کرتی ہو کیا؟''

نلنی خفا ہوتی تو وہ ہنستا ہوا کہتا۔ ''نہیں اس میں بُرا ہی کیا ہے..... رہنا تو ہم تم دونوں کو ساتھ ہی ہے۔ زندگی بھر..... میں کسی دوسرے کے پاس تو نہیں گیا۔ کسی کے پاس پہلے تو تم جانے ہی نہیں دو گی۔ دوسرا احساس گناہ..... بچپن سے کھونٹ کی طرف خود سے باندھا گیا احساس..... پھر نلنی ذرا خود ہی سوچو..... رہنا سہنا سب کچھ تمہارے ساتھ ہی ہے اور روز بس ایک سی یاترا ـــــ یہ یاترائیں بھی کچھ نیا چاہتی ہیں.....''

پھر وہ دیر تک ہنستا ہے..... ''بتاؤ۔ مت بتاؤ نلنی..... پر تم لوگوں نے بھی ایسا کوئی راستہ ضرور نکالا ہوگا۔ لیکن تم عورت ہونا۔ پیٹ رکھنے والی.....''

وہ دیر تک ہنستے ہیں۔

ولو ڈیئر۔ چلو سو جاؤ...... نیند نہیں آ ہی تو ولیم فائیو لے لو...... لیکن سو جاؤ...... نہیں سوتا ــــــ کیا کر لو گے ــــــ بوڑھے کو خود پر جھلاہٹ ہوتی ہے۔ یوں بھی بستر پر لیٹ جانے کے بعد ہوتا ہی کیا ہے...... ساٹھ سالہ زندگی کی ضخیم کتاب کھل جاتی ہے اور اس کتاب کے اتنے باب ہوتے ہیں کہ...... اور کیسے کیسے باب...... بھیانک، جذباتی، رنگارنگ...... تب کی تلنی کا، ایک ایک رنگ انہیں یاد ہے...... بچوں کی شادی تک یہ رنگ ان کے چہرے کو کیسا شاداب، تر و تازہ اور گرم رکھتا تھا...... رات میں تلنی کا ملائم سا بدن بے خیالی میں ان کے بدن پر ایسے پسرا ہوتا کہ نیند کھل جاتی تو وہ بس زیرِ لب معصوم تبسم کے ساتھ اس منظر کو آنکھوں کے حسین فریم میں سجا کر زندہ کر لیتے...... اور پھر صبح خوشبو کی طرح لہراتی تو تلنی چائے کی قلفی تھامے کھڑکی سے جھانک رہی چور، شرارتی شعاعوں کی طرح اسے گدگدانے، اٹھانے پہنچ جاتی......

"اٹھو...... چائے پی لو......"

"نہیں...... ابھی سونے دو، نا......"

"ارے اٹھو۔ بچے کیا کہیں گے۔ تم دیر سے اٹھو گے تو بچو پر بھی بُرا اثر پڑے گا۔"

سپنا، ایسے ٹوٹا ہے...... بچے، بُرا اثر...... اچھی بھلی زندگی اور زندگی کی رعنائیوں کو، بچوں کی خوشیوں کے آگے بھینٹ کیوں چڑھائی جاتی ہے۔؟ بچے بڑے ہو رہے ہیں ــــــ یہ مت کرو۔ وہ مت کرو۔ ساتھ مت سوؤ۔ کمرہ مت بند کرو۔ دیر تک بیوی کے ساتھ کمرے میں مت رہو...... آخر کیوں بھائی ...... بچے آ گئے تو کیا

ماں باپ کی زندگی کا سارا گیم ختم ہو گیا۔ ارے ان کی اپنی بھی زندگی ہے۔ حقیقت سے بھری زندگی اور یہ دو آنکھیں جو بچوں ہی کی طرح مسرت اور نت نئی لذتوں سے ہم آہنگ ہونا چاہتی ہیں..... بڑھتی عمر کا مطلب یہ تو نہیں کہ ان سارے احساسات کو کچل دیا جائے..... ارے کل کو ان کی بھی شادی ہو گی، ان کے بچے ہوں گے۔

نلنی ان کی باتیں سن کر ہنستی ہے..... ''تمہیں کیا فرق پڑتا ہے۔ خیالی بستی تو ہے ہی تمہارے پاس۔ گھومنے پھرنے کو۔ میرے سامنے مجھے بتائے بغیر بھی اتنی آزادی تو چھین سکتے ہو تم۔ خیالی بستی والیاں چلی تو نہیں گئیں۔''

''چلی گئیں۔'' ان کو ہنسی آتی ہے۔ ''وہ بھی بوڑھی ہو گئیں ہماری طرح.....''

''پھر..... اب کیا کرتے ہو؟''

''اب نئی بستیاں آباد ہیں۔ وہ پڑوس والی اجیت کور ہے۔ شانتا منموہن ہیں اور وہ نتاشا.....''

''نتاشا۔'' نلنی نے پہلی بار سچ مچ کھا جانے والی نظروں سے دیکھا..... ''تمہیں خبط ہو گیا ہے۔ وہ تمہاری لجو کی سہیلی ہے۔''

''لجو کی نا.....؟''

نلنی کی آنکھوں میں الجھنوں کی پھوٹتی چنگاریاں تھیں..... ''لجو تمہاری بیٹی ہے اور نتاشا تمہاری بیٹی کی عمر کی۔''

پہلی بار لگا، نلنی نے مذاق میں ہاتھ نہیں بٹایا۔ ہنسی میں ساتھ نہیں دیا..... آنکھیں کسی نشتر کی طرح آنکھوں میں چھپے کسی بوالہوس بوڑھے کی ٹوہ میں ہیں کہ وہ بوڑھا سامنے دکھے تو اس کے ہوسناک تیور کی خبر لی جائے۔ وپن لال کی آنکھوں میں اسی دم اندر بسنے والا وہ خوش مذاق جوان ریت کے تودوں کی طرح گرتا، تڑپتا اور بے دم ہوتا ہوا دکھائی دیا۔

نلنی سنجیدہ تھی..... ''یہ مذاق بہت ہو چکا۔ اب تمہیں ایسا۔''

کوئی پگھلا ہوا سیسہ ان کے کانوں میں انڈیل رہا تھا ــــــ ''نہیں سوچنا چاہئے..... کیوں کہ..... کیوں کہ تم ایک بڈھے خرانٹ ہو..... ایک جوان لڑکی کے باپ ہو.....''

انہیں احساس ہوا، مذاق 'بچانے' والی عمر سے باہر نکل گئی ہے نلنی..... جہاں اس کے چہرے کی جھریاں، اس کے چہرے پر بڑھتی عمر کی لکیروں سے زیادہ تجرباتی، مقدس اور عمر دراز ہو گئی ہیں..... اتنی مقدس کہ اب یہ حسین آوارگی کے قصے، اس کے سخت ہوتے رخسار پر منقش نہیں کئے جا سکتے..... نلنی میں ایک بوڑھی عورت آ گئی ہے۔ اس سے زیادہ عمر کی ایک بوڑھی عورت ــــــ جو ایسے مذاق پر انہیں گھور کر دیکھتی ہے ــــــ بچوں کی اونچ نیچ پر پھٹکار برساتی ہے۔ لجو کی الٹی سیدھی حرکتوں پر اسے بُری طرح جھڑکتی ہے اور.....''

بس نلنی کی اس بڑھتی عمر سے پہلی بار خوف محسوس ہوا تھا انہیں..... اور اپنے گرد ایک حصار کھینچ کر بیٹھ گئے تھے وہ..... ہنسی قہقہوں کی باتوں کو دفتر سے واپس آتے ہی، سلانے لگے تھے..... کتابوں میں، بچوں کے حال چال میں، ان کی پڑھائی کی رپورٹ میں..... ملنے جلنے والے رشتہ داروں میں..... اور یہ حصار دھیرے دھیرے وہ گھر باہر دفتر سب جگہ کھینچنے پر مجبور ہو گئے۔ کیونکہ اب لجو بیاہنے کو آ گئی تھی اور وہ رنگین مزاجی کے الزام سے بھی بچنا چاہتے تھے۔

اس عمر میں اپنی ہی بنائی ہوئی سولی پر چڑھنے کا احساس بھی کم خوفناک نہیں ہوتا..... وپن لال گھوم پھر کر نتاشا والی کہانی پر لوٹ آتے..... ارے لجو کی دوست ہے تو کیا..... وہ جان بوجھ کر تھوڑے ہی گئے تھے۔ خیالی بستی میں ــــــ اس عمر میں تو خود پر اتنی گرفت رہتی ہی کہاں ہے اور حرج ہی کیا ہے..... نتاشا جب گھر آتی ہے تو بیٹی بیٹی کرتے ان کا بھی منہ نہیں دکھتا ــــــ تنہائی میں ضمیر اور اصول سے بھی

تھانے دار کے سے انداز میں نپٹ چکے تھے وہ۔ قاعدے قانون اور مذہب کی پڑھی کتابیں بھی کھول کر تنہائی میں بڈھے کو ندامت کا احساس دلا چکے تھے ـــــ مگر نہیں..... نلنی کی نظروں میں یہ جرم ثابت ہو چکا تھا ـــــ اب تتا شا آتی تو نلنی جیسے ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ جاتی ـــــ وہ کیا کر رہے ہیں۔ کہاں گئے ہیں۔ کہاں دیکھ رہے ہیں.....''

وپن لال سے برداشت نہیں ہوا تو وہ ایک دن غصّے میں برس پڑے۔ ''میں نے تو مذاق کیا تھا۔''

نلنی گم سم سی انہیں دیکھتی رہی تھی۔ جیسے یقین اور بے یقینی کے بیچ کی کھائیاں ناپ رہی ہو..... وہ اسے سمجھانا چاہتے تھے کہ نلنی..... ہر ذہن کا اپنا ایک چور دروازہ ہوتا ہے۔ سب کا ہوتا ہے..... تمہارا بھی ہوگا۔ خود کو ٹٹولو..... تب جانو کہ یہ دروازہ عمر کے ہر پڑاؤ پر کھلا رہتا ہے۔ سوال تو صرف اس دروازے میں داخل ہونے کا ہے۔ اب دیکھو..... اصول، قاعدے، قانونوں میں لپٹے ہم اتنے کمزور ہوتے ہیں کہ اس دروازے میں جھانکنے، داخل ہونے سے بھی خوف کھاتے ہیں۔ اب اگر اس چور دروازے میں اپنا بڑھاپا کچھ دیر کے لئے آرام کرنا چاہتا ہے تو..... اسے روکو مت..... ٹوکو مت.....''

لیکن غلط کون تھا ـــــ ہاں جو چور دروازہ کھلا رہ گیا تھا۔ وہاں سے سچ مچ کا ایک بڈھا ان کے اندر اتر آیا تھا۔ وقت کافی گزر چکا تھا۔ بچے کام دھام سے لگ گئے تھے۔ لجو کی شادی کی فکر تھی۔ سو اس کی شادی بھی خوب دھوم دھام سے کر دی۔ ہاں لجو کی بدائی کے بعد سچ مچ ٹوٹ گئے۔ آئینہ میں چہرہ دیکھا تو تھم سے گئے..... لگا، سامنے ایک بوڑھا کھڑا ہے، اور بوڑھے کے سامنے کھڑی ہے..... اس کی

موت ـــــ عمر، جو دن دن جوڑتی ہے اور کم ہوتی جاتی ہے.....

''ہاں بوڑھا ہو رہا ہوں..... ولو ڈیئر..... چڑ چڑے ہو کر انہوں نے خود کو ڈانٹا۔ لیکن یاد رکھو ولو..... بوڑھا نہیں ہوں گا..... نہیں ہوں گا.....

بستر پر آئے تو آوارہ خیالوں کی آندھی چل رہی تھی۔ اس آندھی سے لڑتے ہوئے وہ سچ مچ ہانپ رہے تھے ـــــ تھوکتا ہوں تم پہ میں..... آخ تھو..... تم سڑے ہوئے آدمی ہو۔ کتے ہو تم..... جیسے ضمیر کو ہوش آ گیا تھا۔ وہ خود سے لڑ رہے تھے۔ ہاں تھوکتا ہوں تم پر..... جیسے چاروں طرف سے، اچھالی گئی تھوک سیدھے ان کے منہ پر گر رہی تھی..... پہلی بار وہ جسمانی کمزوری محسوس کر رہے تھے۔ اس قدر کہ اب وہ میڈیکل چیک اَپ کی ضرورت محسوس کر رہے تھے۔ ہانپتے ہوئے وہ نلنی کے کمرے میں آئے..... نلنی کے پاس بیٹھنا چاہا تو وہ ایک دم سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''ایسے کیوں آ گئے..... انیل، وکاس کوئی آ گیا تو.....''

''ہاں..... مجھے نہیں آنا چاہئے تھا۔'' وہ کمزور آواز میں بولے۔ ''مجھے سچ مچ نہیں آنا چاہئے تھا۔ اس لئے کہ تم بڑھاپے سے سودا کر چکی ہو۔''

پھر وہ وہاں رکے نہیں..... اپنے کمرے میں واپس لوٹنے تک لگا، پہلی بار ان میں کوئی موج، کوئی ترنگ پیدا نہیں ہوئی تھی۔ دریا میں پتھر اُچھالنے کے بعد بھی..... نہیں..... وہ ڈاکٹر سے رجوع کریں گے۔ کسی اچھے Sexologist سے۔ اب وہ مطمئن تھے۔ انہیں اپنے دوستوں پر حیرت ہوتی تھی۔ جو روگ کو بس ڈھوئے جاتے تھے..... ندامت، بچوں کی بڑھتی عمر اور حیرت کے وزنی بوجھ سے دبے، گھٹ گھٹ کر اپنی زندگی ختم کر دیتے تھے۔ اپنی زندگی، جس کا بچوں اور بچوں کی زندگی سے الگ بھی ایک حسین اور انفرادی تصور ہے..... بچے بھلا اپنی دنیاؤں سے ان بوڑھوں کے لئے کتنا وقت چرا پاتے ہوں گے اور ایک یہ ہوتے ہیں..... بوڑھے

لوگ ـــــ 'موت' سوچتے سوچتے بچوں کے سامنے ختم کر دیتے ہیں۔ اپنی بے رنگ زندگی ـــــ اور سچ پوچھو تو سارا قصہ بس ڈاکٹر کے یہاں سے نکلنے کے بعد ہی شروع ہوا تھا۔

وقت کی سوئیاں کہاں سے کہاں پہنچ گئی تھیں۔ بچے اپنے اپنے حصوں کی ذمہ داریوں پر دستخط کر چکے تھے۔ اب ان کی اپنی دنیائیں آباد تھیں۔ ان کے سکھ میں ان کا حصہ اتنا بھر ہوتا کہ وہ بچوں سے خیریت پوچھ لیتے ـــــ منا کیسا ہے۔ بہو کی طبیعت کیسی ہے۔ ڈاکٹر نے کیا کہا ـــــ ایسے میں وہ نلنی کو دیکھتے..... وہ بجھی بجھی سی ہوتی۔ نہیں بجھی نہیں۔ اپنے آپ میں سمٹی..... اپنی عمر سے تھکی۔ وہ جیسے ابھی سے موت کو سمر پت تھی۔ بچوں کے بچوں میں الجھی اور کھوئی کھوئی ـــــ نلنی وکاس کی بچی اشونی کے ساتھ چھوٹی دالان میں سوتی تھی۔ چھوٹی سی کوٹھری۔ عمر نے یہ بھی کرشمہ کیا تھا کہ اب وہ اوپر کے دالان میں سوتے تھے۔ نلنی کی کوٹھری میں ایک چھوٹا سا مندر بھی تھا اور ان کا اپنا کمرہ کتابوں سے بھرا ہوا ـــــ موت کے بارے میں ان کا اپنا الگ نظریہ تھا ـــــ جیسے وہ سوچتے تھے کہ جو چیز ابھی نہیں ہے اس کے بارے میں زیادہ کیوں سوچا جائے..... ہوسکتا ہے۔ باقی بچی زندگی میں ایک لمبی زندگی چھپی ہو..... تو اس باقی بچی زندگی کو اداس، بے رنگ کیوں کیا جائے۔ وہ باقی بچی زندگی کو پنیہ کمانے کے ڈھونگ سے الگ رکھنا چاہتے تھے۔ اس لئے خوب پڑھتے تھے۔

وہ سمجھتے تھے، میڈیکل چیک اَپ ہونا ضروری ہے..... Sex ایک ضروری چیز ہے..... ہاں، یہ الگ بات ہے کہ کہیں شادی کے بعد، ایک سمجھوتہ کر لینا پڑتا ہے۔ اندر حرارت تو ہونی چاہئے تھی ـــــ تمازت اور حرارت کہ اپنے مرد ہونے کا احساس بنا رہے ـــــ آخر بوڑھوں کو یہ حق، حاصل کیوں نہیں ہے۔

Sexologist کے یہاں سے نکلے تو انیل کے دوست وِمل سے ملاقات ہوگئی، جو آنکھیں ترچھی کر کے طنز بھری نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنی زندگی میں کسی کی بھی بے جا مداخلت کو پسند نہیں کرتے تھے۔

لیکن اس دن وہی ہوا جو انہوں نے پہلے سے سوچ رکھا تھا۔ شام کو دفتر سے آ کر انیل نے ٹوکا۔

''بابو جی..... آپ ڈاکٹر اشوک کے پاس گئے تھے؟''

''ہاں۔''

''لیکن وہ تو.....'' انیل کہتے کہتے ٹھہر گیا۔

"Sexologist" ہے.....'' ان کی آواز نپی تلی تھی۔

''ہاں وہی تو ـــــ مجھے حیرت ہوئی'' ـــــ انیل اپنے کمزور لفظوں سے پریشان تھا۔ یا شاید باپ کے سامنے کچھ اس طرح کے اظہار کے لئے لفظ نہیں جٹا پا رہا تھا.....

''آخر آپ وہاں.....؟''

اس نے نظریں نیچی کر لیں۔

وپن لال نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔ ''کچھ پرابلم تھی اس لئے.....''

''کوئی پرابلم تھی تو مجھے بتاتے..... میرے کئی ڈاکٹر دوست جاننے والے ہیں.....''

''نہیں پرابلم کچھ دوسری طرح کی تھی۔''

انہوں نے دیکھا ـــــ انیل نے کچھ سمجھنے کے لئے آنکھیں ملانے کی کوشش کی۔ مگر ان آنکھوں کا درجہ حرارت کچھ اتنا زیادہ تھا کہ وہ تاب نہ لا سکا اور خفگی اوڑھے اپنے کمرے میں لوٹ گیا..... رات میں کھانا لگا تو انہوں نے دیکھا، انیل کتنی ہی بار

چور نگاہوں سے اس کا جائزہ لیتا رہا..... جیسے پس و پیش میں ہو۔ آخر بابو جی کو..... ایک کشمکش ان کے اندر بھی چل رہی تھی۔ زندگی کے اتنے پڑاؤ میں کبھی اس طرح کے بے جا سوال سے ان کا واسطہ نہیں پڑا تھا۔

آخر بچے سمجھتے کیا ہیں ـــــ Sexologist کے یہاں جانے میں برائی ہی کیا ہے ـــــ آخر اس عمر میں اپنے جذبات کو سلانے کا اپدیش گیتا کے کس ادھیائے میں دیا گیا ہے.....؟ نہیں..... وہ اپنے طور پر مطمئن تھے۔ کھانے سے فارغ ہو کر انگریزی کی جاسوسی کتاب لئے دیر تک پڑھتے رہے۔ خیالوں میں خون کا گرما گرم رقص جاری تھا۔ انہیں اپنی دنیا کو مایوس اور پیروں فقیروں کی دنیا بنانے سے سروکار نہیں تھا..... وہ اس عمر میں بھی زندگی کی تمام رعنائیوں اور دھڑکنوں کو زندہ رکھنا چاہتے تھے۔ ٹھیک اپنے جوان بچوں کی طرح..... اور وہ اپنے آپ سے پوری طرح مطمئن تھے۔

ڈاکٹر کی دوائی نے اثر دکھایا تھا۔ وقتی طور پر جو کمزوری اور تھکان ان کے اندر پیدا ہوئی تھی وہ کسی قدر دور ہو گئی تھی۔ دو چار روز میں ہی وہ خود کو پہلے سے بہت اچھا محسوس کر رہے تھے۔ انہیں انیل سے زیادہ اپنے معاشرے میں بوڑھوں کے لئے پیدا کئے جانے والے احساس سے شکایت تھی۔ اچھا برا دیکھنے اور سمجھنے کی نگاہ نے ہی نلنی اور انہیں تقسیم کر رکھا تھا..... ایسا نہیں ہے، ان کے کئی دوست اپنی بیویوں کے ساتھ آج بھی سوتے تھے ـــــ مگر اس معاملے میں نلنی ہی کچھ زیادہ دھارمک اور دقیانوسی ثابت ہوئی تھی ـــــ یا پھر بڑھتی عمر اور بچوں کو کھلانے والے احساس نے اسے کسی گمراہ کن مغالطے میں ڈال رکھا تھا ـــــ پرانی کتابوں کے پنوں سے 'جل

کمبھیوں' کی طرح ملائم اور ریشم جیسی نلنی نے سر نکالا تو وہ سوچنے پر مجبور ہو گئے۔ اب تو نلنی کو دیکھے ہوئے بھی مدت ہو جاتی ہے اور جب سے نلنی نے نیچے اکیلے سونا شروع کیا ہے تو جیسے ان کی دنیا ہی بدل گئی..... اب پوچھتی تک نہیں کہ چائے ملی یا نہیں؟ چائے میں کتنی شکر لو گے..... دنیا کیوں بدلتی ہے ولوڈیئر۔؟

وہ خود سے پوچھ رہے تھے..... بدلتی اس لئے ہے ڈیئر کہ تم دنیا کو اپنی نظروں میں اداس اور بے رنگ کر دیتے ہو۔ جیسے نلنی نے ـــــ جیسے اس نے اب تمہارے ذکر تک کو چھوڑ دیا ہے۔ پہلے بستر کی سلوٹوں پر ہاتھ پھراتی تھی۔ ہولے ہولے اور خمار آلود آنکھوں سے صبح صبح، چائے کی قلفی لے کر آتی تھی..... وہ رومانی قصے، بڑھتی عمر کی جھریوں میں کیوں چھپ گئے ـــــ؟ اس لئے کہ بچوں کی دنیا حسین بنانے کے پیچھے تم اپنی دنیا کو بھول گئے۔.....

نہیں..... اس دنیا کو زندہ کرنا ہوگا ـــــ!

وہ ایک مضبوط فیصلے کے تحت کرسی سے اٹھ کر کھڑے ہوئے۔ دروازہ کھولا۔ جذبات کی گرمی نے ان کے اندر کے تندور میں آگ لگا دی تھی۔ نلنی کے کمرے تک گئے ـــــ کمرہ ہلکا سا بھڑا ہوا تھا ـــــ انہوں نے دروازے کو آہستہ سے کھولا ـــــ سامنے نلنی وکاس کی بچی اشونی کو جھری بھرے بازوؤں میں دبائے بے فکر خراٹے بھر رہی تھی ـــــ سینے سے آنچل ڈھلکا ہوا تھا۔ ٹخنوں تک ساڑی اٹھ گئی تھی۔ کچھ بھی ہو وہ اس منظر کو جوان احساس کے سہارے دیکھنا چاہتے تھے ـــــ ہاں جوان احساس کے سہارے اور گرم گرم انگاروں پر چلنا چاہتے تھے..... وہ جی بھر کر دیکھتے رہے..... لیکن وہ اس طرح کیوں دیکھنا چاہتے ہیں؟ کسی اجنبی لڑکی کو، خواہ وہ نتاشا ہی کیوں نہ ہو ـــــ گھورتے تو کوئی بات بھی تھی ـــــ مگر وہ عورت

جو چالیس برسوں تک پل پل ان کے پاس رہی ـــــ جس کے جسم کے ہر حصے، ہر سرد و گرم کو بخوبی پہچانتے ہیں ـــــ وہ اسے اس طرح ..... اچانک وہ ٹھہر گئے ـــــ جیسے برف کی سلیوں میں، اچانک گرم گرم آتشدان سے نکلی سرخ لوہے کی تیلی پیوست کر دی گئی ہو ـــــ اور گرم گرم بھاپ سے برف پگھلی ہو ـــــ اندر تک ـــــ اور گرم تیلی برف میں گھستی چلی گئی ہو ـــــ انہوں نے محسوس کیا۔ ہاں نلنی میں ابھی گرمی باقی ہے ـــــ اور بچوں کے ڈر سے اپنی بزدلی کی جھریوں میں، وہ اس گرمی کو پی کر بھول گئی تھی ـــــ

دوسرے دن کھانے پر انہوں نے فیصلہ کن انداز میں وکاس سے کہا۔

''اشونی کو آج سے اپنے پاس ہی سلاؤ۔''

بہو نوالہ لیتے لیتے ٹھہر گئی.....

''اماں کو کچھ پریشانی ہے کیا ـــــ؟''

''نہیں.....'' وہ دھیرے سے بولے۔ ''مجھے پریشانی ہے۔''

''بابو جی..... دراصل مجھے دقت ہو جاتی ہے۔ صبح میں دفتر جلد جانا پڑتا ہے۔''

وکاس بے چارگی سے انیل کی طرف دیکھ رہا تھا ـــــ

بہو دھیرے سے بولی ـــــ ''کمرے میں مچھر زیادہ ہیں۔ اماں کو وہاں آرام نہیں ہے کیا؟''

انیل نے کچھ شک سے ان کی طرف دیکھا ـــــ ''اماں آج کل زیادہ کھانسنے لگی ہیں اس وجہ سے تو نہیں.....''

''نہیں.....'' لقمہ ہاتھوں میں لے کر انہوں نے انیل وکاس اور دونوں بہوؤں کو

دیکھا ــــ ''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''

انیل اور وکاس اب بھی حیرت سے ان کی طرف دیکھ رہے تھے..... وہ جیسے اندر ہی اندر ڈھہ رہے تھے۔

''آخر بوڑھے آدمی کو بوڑھی بیوی کی ضرورت کیوں پڑتی ہے..... تم کیا سوچتے ہو میں نہیں جانتا ــــ میں نہیں جانتا کہ تم میرے یا ہمارے بارے میں کیا سوچ سکتے ہو..... تم نئے زمانے کے ہو ــــ وہ ذرا طنز سے بولے ــــ ''ماں باپ کے بارے میں یا یوں بھی اچھا برا کچھ بھی سوچنے کی نیتک یا ذمہ داری تمہاری ہے..... رہی ہماری بات..... کئی دنوں سے سوچ رہا تھا۔ تم لوگوں سے پوچھوں۔ ایک آدمی کنبہ میں بوڑھا ہو جاتا ہے تو تم یہ کیوں سوچتے ہو کہ وہ ابھی مر جائے گا ــــ یا اس کے مرنے میں بہت کم دن باقی ہیں۔ ایسا تم پورے وثوق سے کیسے سوچ سکتے ہو.....؟''

انیل نے شک کی حالت میں انہیں ٹٹولا ــــ ''میں سمجھا نہیں بابو جی۔''

''سمجھو گے بھی نہیں.....'' انہوں نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا ــــ اس لئے کہ تمہاری ماں اور ہم میں سے کسی کے بارے میں ابھی یہ طے نہیں ہوا کہ ہم بس مرنے والے ہیں..... اور جب مرنے والے نہیں ہیں تو ساتھ رہیں گے اور رہی ضروری بات ــــ تو رات برات ہم دونوں کو اٹھنے میں تکلیف ہوتی ہے ــــ بڑھاپے میں پتی پتنی ایک دوسرے کے لئے سہارا ہوتے ہیں۔''

انہوں نے دیکھا۔ اس آخری جملے سے انیل اور وکاس کے چہرے پر پڑی ہوئی کائی چھٹ گئی تھی۔ گو اب بھی ان کے چہرے بنے ہوئے تھے: جیسے اندر ابھی بھی اتھل پتھل مچی ہو..... وہ کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے ــــ باہر دروازے کے پاس ننھی اشونی سے کھیل رہی تھی۔

رات ہوگئی۔ انہیں لگا جیسے کسی پُراسرار طلسم کو توڑتے ہوئے وہ خواب کی دنیا میں واپس آ گئے ہوں۔ شاید برسوں بعد..... برسوں بعد نلنی کے جھری بھرے بدن کی ٹھنڈی آگ چیخی تھی۔ وہ آج بڑھاپے کے احساس کو ایک دم سے بھلانے پر تلے تھے ـــــ انہوں نے نلنی کو چھیڑا بھی۔ گدگدایا بھی۔ موج میں آئے تو شرارت سے کمرے میں دوڑایا بھی..... جیسا کہ وہ شادی کے وقت تھے ـــــ وہ بالکل بچہ بن جانا چاہتے تھے ـــــ جیسے نلنی کوئی شہزادی ہو اور شہزادی دیو کے قلعے میں قید ہو۔ وہ نلنی کو اس قید سے کسی شہزادے کی طرح چھڑا کر لائے تھے اور اس فتح کا بھرپور جشن منانا چاہتے تھے۔ وہ موج میں تھے۔ کبھی چٹکلے سناتے۔ نلنی زور سے ہنستی تو انہیں اچھا لگتا۔ انہوں نے پوچھا۔

''اتنے دنوں تک چپ کیوں رہیں؟''

نلنی ہنسی۔ ''بچوں میں یاد ہی نہیں رہا کہ ہماری بھی.....'' وہ اٹک سی گئی۔ ''اب تمہاری طبیعت کیسی رہتی ہے؟''

''بالکل چنگا۔'' وہ ہنسے۔

''نہیں دبلے ہو گئے ہو..... نلنی کے چہرے پر اداسی تھی۔ غلطی میری بھی تھی۔ تمہاری فکر کرنی چھوڑ دی تھی.....''

وہ اس کی ذات پر بچھ جا رہے تھے..... جیسے پہلی بار، پہلی رات نلنی کو آغوش میں بھرنے کے لئے انہوں نے پلنگ پر پھول سجائے تھے..... نلنی کے استقبال کے لئے وہ ان خوشبوؤں کو نلنی کے جسم سے دوبارہ بولتے ہوئے سننا چاہتے تھے ـــــ وہ جیسے گہرے نشے میں ڈوب رہے تھے.....

''سو جاؤ نلنی..... مجھے نیند آ رہی ہے۔ سنو..... اپنا مندر یہیں لے آنا..... ارے

مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔میری لائبریری،وہ ہنسے.....وہ تو اس طرف ہے.....تم دن بھر مندر میں رہنا.....میں کتابوں میں۔۔۔۔'' وہ ہنس رہے تھے۔مگر اب آنکھوں میں غنودگی لہرا رہی تھی۔سو جاؤں؟

ہاں سو جاؤ۔۔۔۔'' ننلنی نے مسکراتے ہوئے سر پر ہاتھ رکھا۔''

ولوڈیئر.....وہ اپنی فتح پر نثار ہو رہے تھے.....ولوڈیئر، بچے بیوقوف ہوتے ہیں جو یہ نہیں سمجھ سکتے کہ ایک دن بوڑھے جاگ سکتے ہیں۔تمام بوڑھے جاگ سکتے ہیں۔ ننلنی پاس میں لیٹ گئی۔نیند نے ان پر بُری طرح حملہ کر دیا تھا۔وہ گھوڑے بیچ کر دنیا و مافیا سے بےخبر ہو کر سو گئے تھے۔

صبح ہوگئی.....جیسے وہ ایک دم سے چونک گئے.....کوئی ہولے ہولے ان کا سر سہلا رہا تھا۔

''چائے!''

انہوں نے نظر گھمائی۔۔۔۔ننلنی کھڑی تھی۔۔۔۔ کچھ دیر کے لئے وہ ایک دم چونک گئے۔ یہ ننلنی شادی کے فوراً بعد والی ننلنی سے بالکل الگ نہیں لگ رہی تھی۔۔۔۔وہ زیر لب مسکرائے۔۔۔۔ننلنی میز پر چائے کی قلفی رکھنے کے بعد سامنے سے کھڑکی کا پردہ ہٹا رہی تھی اور دھوپ چھن چھن کرتی ہوئی کمرے میں اتر رہی تھی۔

مجھے اسے زندہ رکھنا ہے

جیسا کہ گھر والے بتایا کرتے تھے۔ وہ رات بہت بھیانک تھی جب میں پیدا ہوا۔ بہت بھیانک..... جیسے خوف و دہشت کے ماحول میں کوئی چیخ اٹک گئی ہو۔ نہیں، اس سے بھی کہیں زیادہ بھیانک اور جیسے سب بچے روتے ہوئے پیدا ہوتے ہیں۔ میں بالکل نہیں رویا تھا۔ اس لئے پہلے تو مجھے مردہ سمجھ لیا گیا۔ پھر جس دائی نے مجھے پیٹ سے نکالا وہ فوری تدبیر کے تحت بغیر تاخیر کئے میرے گندے منہ میں اپنے ہونٹ ڈال کر ہوا بھرنے لگی۔ کہ شاید اس عمل سے بچے کے مردہ جسم میں تھوڑی تمازت آجائے اور کوئی سانس بچ رہی ہو تو اس میں زندگی کی کرن لوٹ آئے اور جیسا کہ گھر والے بتاتے ہیں۔ ایک بھیانک بہت بھیانک رات جبکہ دائی کا منہ نومولود بچے کے خون اور پیپ سے بھر گیا تھا، وہ میری زندگی کے بچانے کا سبب ثابت ہوئی اور میں ایک تاریک سرنگ سے دنیا کے اُجالے میں آ گیا۔

پیدا ہونے کے بعد بھی میں اتنا دبلا پتلا تھا کہ مجھے کبھی اپنے ہونے پر یقین نہیں آیا اور میں ہمیشہ سے، جیسا گھر والے میرے بچپن کے بارے میں بتاتے ہیں..... کہ میں بس ایک ہی رٹ لگایا کرتا تھا..... نہیں میں پیدا کہاں ہوا ہوں..... میں تو بس ہوں..... اس طرح جیسے گھاس پھوس ہوتے ہیں..... یا برسات کے دنوں میں ''پھٹکی پھٹکی'' نظر نہیں آنے والے کیڑے ہوتے ہیں۔

اور جیسا کہ سب بچے اسکول جاتے ہیں، ایک دن مجھے بھی، اسکول بھیجا گیا۔ اس دن صبح ہی صبح ماں نے مجھے تیار کیا۔ نئے نئے کپڑے پہنائے۔ پرانی رضائی کا بنا ہوا بستہ میرے کندھے سے لٹکایا اور بابا کے ساتھ مجھے اسکول بھیج دیا۔ اسکول میں میرا نام تو لکھا گیا مگر شروع کے چند ماہ میرے لئے بہت سخت ثابت ہوئے۔

جیسے بچے میرے لاغر جسم اور میرے ہونے کے باوجود نہ ہونے پر میرا مذاق

''تو آپ بھی پڑھنے کو آئے ہیں.....؟''

''ہاں.....''

''تو آپ کو احساس ہے، کہ آپ ہیں.....؟''

''ہاں؟ کیوں نہیں''

''آپ کو سچ مچ احساس ہے.....''

اُف شرمندگی کی انتہا تھی۔ میں گھر آ کر پھوٹ پھوٹ کر رویا.....

''نہیں۔ مجھے نہیں پڑھنا ہے۔''

''مگر کیوں۔'' ماں کے لہجے میں ناراضگی تھی۔

''کیونکہ میں ہوں ہی نہیں''

''نہیں تم ہو اور ایک دن وہ بھی سمجھ جائیں گے۔''

یہ ماں تھی۔ جیسی کہ شفقت رکھنے والی سبھی مائیں ہوتی ہیں۔ جبکہ باپ اس کے برخلاف تھا۔ اس کی آنکھوں میں شک گہرا ہو گیا تھا۔

''سنو، یہ ٹھیک کہتا ہے۔ اسے اسکول بھیجنا بند کر دو۔''

''مگر کیوں.....؟''

''کیوں کہ..... یہ جو کہتا ہے کہ یہ ہے ہی نہیں۔ باپ پھسپھسا رہا تھا۔ کیا کبھی تمہیں اس کی موجودگی کا احساس ہوا۔ نہیں۔ مہربانی کر کے اس نو ماہ کے عذاب کا تذکرہ مت کرو..... باپ نے ایک بھدی سی گالی دی..... جیسے بچے گھر میں اپنے ہونے کا احساس کراتے ہیں..... ویسے ہی۔ کیا تمہیں کبھی لگا کہ یہ گھر میں ہے۔ جیسے گھروں میں بچے ہوتے ہیں..... نہیں غصہ مت ہو۔ یہ سچ مچ نہیں ہے۔ جو ہے وہ ہم سب کا شک ہے۔''

نہیں، میں نہیں ہوں۔ اُٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے میں بس اسی خیال سے گھرا رہتا۔

میں نہیں ہوں، جو ہے وہ آنکھوں کا شک ہے۔ جبکہ اس کے برخلاف ماں کی آنکھوں میں سختی تھی۔

''نہیں تم ہو اور تمہیں اسے زندہ بھی رکھنا ہے۔ سمجھ رہے ہو نا..... تم ہو..... اور تمہیں ثابت کرنا ہے۔''

مجھے نہیں معلوم، ماں کی آنکھوں میں اس چیز کے لئے خواب کیوں لہراتے تھے جو تھا ہی نہیں۔ جبکہ محلے والے، آس پڑوس کے لوگ، سب کا یہی خیال تھا..... کیا تمہارے یہاں بچہ بھی ہے؟ اور گھر والے بتاتے ہیں کہ بعض عورتیں تو ماں کا مذاق بھی اڑاتی تھیں..... کہ سچ کہو، نو ماہ کے تھیلے سے کچھ برآمد بھی ہوا ہے..... یا بس یونہی اپنا جی خوش کرتی ہو.....''

ماں ان کی باتوں کا چند اں برا نہیں مانتی بلکہ ہنس کر کہتی ہے۔ ''نہیں وہ ہے..... اور ایک دن وہ ثابت بھی کرے گا۔''

میں بڑا ہوتا رہا اور سچ تو یہ ہے کہ جیسے جیسے بڑا ہوتا رہا، مجھے اپنے نہ ہونے کے احساس کا خوف مٹتا گیا۔ میری آنکھیں جو دیکھ رہی تھیں، کان جو سن رہے تھے، وہ افسوسناک حد تک برے تھے۔ جیسے مجھے معلوم ہوا کہ اسکول کے ایک بچے نے دوسرے بچے کا قلم چرا لیا۔ دو بچے آپس میں لڑ گئے۔ ایک نے دوسرے کو زخمی کرلیا۔ پڑوس کے ایک بڑے میاں نے چھت سے کود کر جان دے دی اور تو اور..... ایک بار بابا نے میری ماں کو رات کے وقت پیٹ پیٹ کر ادھ مرا کر دیا۔ نہیں، میرا نہیں ہونا ہی اچھا تھا۔ مجھے بھرپور طمانیت کا احساس ہوا۔

''باپ نے تمہیں کیوں پیٹا؟'' دوسرے دن میں نے ماں سے دریافت کیا۔

''کیونکہ وہ بس یہی کرسکتا ہے۔'' ماں ہمیشہ کی طرح مسکرائی۔

''تمہیں برا نہیں لگا؟''

''نہیں۔''

''کیوں.....؟ کیونکہ وہ ہے! اس لئے؟''

''نہیں یہ بات نہیں ہے۔ ماں نے مجھے تھپکیاں دیں..... یہ جاننے کے لئے تم بہت چھوٹے ہو۔ مگر جان لو۔ اسے بھی اپنے ہونے کا وقتاً فوقتاً ثابت کرتے رہنا ہے۔ جینے کے لئے۔ اس لئے ایسا ہوا۔ وہ ایسا نہیں کرے تو ماں فخر سے مسکرائی..... شاید اسے اپنے ہونے کا یقین نہیں آئے۔''

''تمہیں یقین کیسے آتا ہے؟''

''ماں نے مجھے لپٹا لیا۔ میرے چہرے کا بوسہ لیا۔ جگمگاتی آنکھوں سے میری طرف دیکھا..... اس لئے کہ تم ہو..... اور میرے یقین کے لئے نو ماہ کا یہ تحفہ بہت ہے.....''

وہ لمبا گھاگھرہ پہنتی تھی۔ بڑی بڑی دو چوٹیاں رکھتی تھی۔ زیادہ تر ننگے پاؤں رہتی تھی۔ چہرے پر چیچک کے داغ تھے۔ اس کا باپ نہیں تھا۔ میں اپنے نہ ہونے کے احساس کے ساتھ بڑا ہو رہا تھا اور وہ اس دوران برابر گھر میں آیا کرتی تھی۔ ماں کے کام میں ہاتھ بٹاتی تھی اور ماں کہتی ہے..... کہ کنکھیوں سے میری طرف دیکھا بھی کرتی ہے جو ماں کو اچھا لگتا ہے.....

''تمہیں کیوں اچھا لگتا ہے؟''

''اس لئے کہ وہ تمہیں پسند کرتی ہے۔''

''لیکن میں تو ہوں ہی نہیں۔''

''تم ہو اور تم اسے ثابت بھی کر رہے ہو۔''

ماں کو ہنسی آئی تھی، اس کے موتیوں جیسے دانت کھل گئے تھے.....

پتہ نہیں، میں کچھ ثابت کر بھی رہا تھا یا نہیں۔ میں تو صرف دیکھ رہا تھا اور جو دیکھ رہا تھا وہ بہت معمولی سی باتیں تھیں۔ مثلاً درخت میں پتے کیسے آتے ہیں۔ پھول کیسے

کھلتے ہیں۔سورج جب طلوع ہوتا ہے یا غروب ہوتا ہے تو آسمان کیسا لگتا ہے؟ بلی چوہے کو کس طرح ختم کرتی ہے۔ چمگادڑ کیسے اڑتے ہیں۔ میں بعض چیزوں کی نقل بھی اتارا کرتا تا۔لیکن یہ چیزیں جو میرے مشاہدے میں تھیں، اتنی حقیر تھیں کہ جب میں بیان کرتا تو باپ اپنا منہ دوسری طرف پھیر کر ہنسا کرتا تھا۔ یا پھر میرا مذاق اڑاتا۔

''سچ مچ تم نہیں ہو۔''

''کیوں؟ تمہیں کیوں ایسا لگتا ہ۔تمہیں معلوم ہے پانی میں کاغذ کی ناؤ کیسے تیرتی ہے..... ہوائیں کہاں سے آتی ہیں..... پچھیوں کو آسمان میں کیا چاہئے۔نہیں یہ سچ مچ چھوٹی اور معمولی باتیں تھیں اور باپ کہتا تھا..... تمہیں اس سے بڑی باتیں سوچنا چاہئے..... جیسے تمہیں سوچنا چاہئے کہ زندگی کے لئے ضروری کیا کیا چیزیں ہیں.....؟''

''زندگی کے لئے.....''

میں اس طرح چونکا، جیسے ماں کی اس بات سے چونکا تھا کہ وہ گھا گھرہ والی لڑکی مجھے پسند کرتی ہے..... زندگی کے لئے..... مجھے اپنا سوال ماں کے سامنے رکھتے ہوئے مشکل نہیں ہوئی۔اس لئے کہ اس کے پاس جواب کا خزانہ پہلے سے ہی کھلا ہوا تھا۔

''ہاں زندگی کے لئے تا کہ وہ گھا گھرہ والی لڑکی تمہارے گھر آجائے اور تمہارا اپنا چولہا چکی ہو اور اس کے لئے تمہیں خود کو ثابت کرتے جانا ہے..... سمجھ رہے ہو نا۔ آخری سانس تک.....!''

باپ ایک مختصر سی بیماری میں چل بسا۔مختصر سی بیماری۔ اسے کپکپا دینے والا بخار آیا۔اپنے چھوٹے سے کمرے میں وہ ہذیان کی کیفیت میں اول فول بکتا رہا۔ پھر

اس کی زبان بند ہوگئی۔ ماں نے دیکھا تو اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے تھے۔ باپ جاچکا تھا۔ باپ کبھی تھا۔ باپ موجود بھی رہا ہوگا۔ مگر چند دنوں میں ہی لگنے لگا کہ وہ کبھی تھا ہی نہیں۔ نہیں، وہ نہیں تھا۔ اس لئے کہ جہاں کہیں بھی وہ ہوسکتا تھا۔ اب وہ نہیں تھا۔ اس کی موجودگی کا کوئی سا بھی احساس نہیں تھا۔ یا ممکن ہے اس نے اپنی موجودگی کو پنپنے ہی نہیں دیا ہو۔ ماں بھی روتی دھوتی ایسے چپ ہوگئی جیسے وہ کبھی تھا ہی نہیں۔

''باپ تھا؟'' میں نے ماں سا پوچھا۔

''ہاں وہ تھا۔ جیسے تم ہو۔ پہلے میں بھی گھا گھرہ پہنتی تھی۔ پھر وہ مجھے لے آیا۔ رکھا۔ وہ مارتا بھی تھا اور..... وہ ملائمیت سے بولی۔ ''مجھے اس کا احساس سدا رہے گا۔''

ماں پھر بولی۔ ''میرے پیارے اب تمہیں باہر نکلنا ہوگا۔ جیسا کہ تم شروع سے خود کو ثابت کرتے آئے ہو۔ مگر اصل میں ثابت کرنے کا وقت اب آیا ہے۔ سمجھ رہے ہو نا اور پھر اس گھا گھرے والی کو بھی بیاہ کر لانا بھی ہے تمہیں۔

گھا گھرہ والی لڑکی۔ مجھے تعجب ہوا، وہ واقعی دیکھا کرتی تھی مجھے۔ کبھی چوکی چولہے کے پاس سے، کام کرتے ہوئے نلکے پر پانی بھرنے کے دوران، یا ماں کے ساتھ سوپ پر چاول پھٹکتے ہوئے۔ ایک بار وہ مونگ پھلی کے دانے لائی تھی میرے لئے اور میرے ہاتھوں پر بکھیر کر بھاگ گئی۔

''یہ کیا تھا؟'' میں نے ماں سے پوچھا۔

ماں ہنسی۔ یہ جو بھی تھا مگر تیرے لئے تھا اور اسے تجھے خود ہی سمجھنا ہے.....

ماں کی اس بات سے مجھے حیرانی ہوئی۔ مگر اب مجھے کام پر بھی نکلنا تھا۔ اس لئے کہ بقول ماں، میری مسیں بھیگ چکی تھیں اور میرا باپ مر چکا تھا اور جوان لڑکوں کو ہی گھر گرہستی کی فکر کرنی ہوتی ہے۔

یہ سب باتیں گویا چلتی رہیں مگر پھر بھی مجھے یقین نہیں تھا کہ میں ہوں۔ مگر ماں کے پاس اس بات کا تسلی بخش جواب تھا..... میں اس لئے ہوں کہ میں ان سارے واقعات کا چشم دید گواہ ہوں۔

مجھے ہنسی آئی۔ ایک چھوٹی سی عمر میں ہم کتنی کتنی باتوں کے گواہ بن جاتے ہیں۔ جیسے ایک بار محلے میں بھیانک خاموشی چھا گئی تھی۔ جیسے بابا مر گئے تھے..... جیسے سڑکیں سنسان ہوگئی تھیں..... جیسے..... جیسے..... نہیں، میں کسی بات کا گواہ نہیں تھا۔ اس لئے کہ میں تھا ہی نہیں۔ اگر میں ہوتا تو مجھے دکھ ہوتا کہ میں کیوں ہوں اور یہ سب کیوں ہو رہا ہے۔ لوگ کہتے تھے اس کے پیچھے بڑی بڑی باتیں ہیں۔ شاید اسی لئے۔ مجھے تو بس یہی پسند تھا کہ طوطا ٹائیں ٹائیں کیوں کرتا ہے۔ کوامنڈیر پر آ کر چلاتا ہے تو اس کے معنی کیا ہوتے ہیں.....

جب پہلے دن میں کام پر نکلا تو ماں نے میرے ساتھ ڈھیر ساری دعائیں باندھ دیں۔ نئے جہان کے سارے تجربے نئے تھے۔ نہیں، تم نہیں ہو۔ تم ہو کر بھی نہیں ہو۔ مجھے ہر جگہ بس یہی ٹکا سا جواب ملتا۔ ماں ہر بار خوش ہو کر میرا حوصلہ بڑھاتی۔ ڈٹے رہو..... ایک نہ ایک روز..... پھر وہ فخر سے اپنی جھکتی کمر، اپنی پھیلتی جھریوں کو سمیٹ کر کھلکھلا پڑتی..... دیکھا، تم ہو اور تم اسے ثابت بھی کر رہے ہو..... جاؤ کوشش کرو۔

نئی زمین، نیا آسمان۔ شہر، اسٹیشن، بڑی بڑی گاڑیاں، آسیبوں جیسی عمارتیں نہیں۔ تم ہو ہی نہیں۔ آہ، تم کہاں ہو۔ جیسے ایک بدن ہوا میں اڑ رہا ہو۔ روئی کے گالے، جیسا یا..... نہیں، میں تھا ہی نہیں۔ تبھی تو ایک دن اس گھا گھرے والی لڑکی نے بھی میری طرف دیکھنے والی اپنی آنکھیں واپس لے لیں۔

''افسوس میں اپنا وقت برباد کرتی رہی۔ تم نہیں ہو اور جان لو۔ تم میرے لئے ایک

کھا گھرہ بھی نہیں لا سکتے۔ اس نے دکھایا..... ایسا پھٹا ہوا بھی.....''

مجھے دکھ ہوا۔ اس کا گھا گھرہ سچ مچ پھٹا ہوا تھا اور وہاں ایک بھدے کپڑے کا پیوند لگا ہوا تھا۔ افسوس، میری نظر کبھی بھی اس پیوند پر نہیں گئی۔ اس نے اپنا گھا گھرہ سنبھالا اور چلی گئی۔

''نہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' ماں کو اطمینان تھا اور اس نے پھر فخر سے دہرایا..... ''تم ہو..... اور تمہیں اسے زندہ بھی رکھنا ہے۔ بس سمجھ گئے نا۔''

اس دن میں پھر کام کے لئے نکلا۔ ماں نے کچھ زادِ راہ سفر کے لئے باندھ دیا تھا۔ چلتے چلتے میں کافی دور نکل گیا۔ یہاں ایک پل بن رہا تھا۔ کافی مزدور کام کر رہے تھے۔ سورج سر پر چڑھ آیا تھا۔ مزدور پسینے سے شرابور اور تھکے تھکے سے لگ رہے تھے۔ اب وہ قریب کے چشمے سے پانی پی رہے تھے۔ اور اپنے چہرے وغیرہ دھو رہے تھے۔ میں تیز تیز چلتے ہوئے ان کے قریب پہنچ گیا اور اپنا مدعا سامنے رکھا۔

ان سب نے حسرت سے اور لطف لینے والے انداز سے میری طرف دیکھا۔ پھر ایک دوسرے کو دیکھ کر کھلکھلا پڑے۔

''نہیں۔ ہنسو مت..... زندگی کے لئے..... جیسا کہ میرے بابا نے سمجھایا تھا..... اور تم لوگ بھی تو..... میں کافی مارا مارا پھرا ہوں.....''

''ممکن ہے.....''

''تو مجھے کام مل جائے گا۔ کوئی سا بھی..... مجھے ثابت کرنا ہے کہ.....''

ایک مزدور نے غصے سے میری طرف دیکھا۔

''نہیں تم ہو ہی نہیں۔ جو ہے ہی نہیں، اسے کام کیا ملے گا۔''

وہ سب ایک بار پھر قہقہہ لگا کر ہنسے۔ پھر پھاوڑا، کدالیں لے کر کام پر لگ گئے۔ وہاں ایک موٹا سا آدمی تھا۔ اس کے ساتھ ایک خوش لباس دوسرا آدمی بھی تھا۔ وہ

میری طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے یقین تھا، اس نے ہماری باتیں بھی سنی ہوں گی۔ میں نے کان لگایا تو محسوس ہوا، وہ موٹا آدمی اس دوسرے آدمی سے میرے ہی بارے میں باتیں کر رہا تھا۔

''نہیں۔ یہ کام ذرا مشکل ہے۔ اس سے نہیں ہوگا۔''

''نہیں۔ کرلے گا۔''

''کرتو لے گا۔ مگر یہ..... یہ تو ہے ہی نہیں۔''

موٹے آدمی کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ ''یہی ہمارے لئے کام کی بات ہے وہ ہے ہی نہیں۔ سمجھ رہے ہو۔ وہ نہیں ہے۔ بس یہی خاص بات ہے۔ اور میں اسی لیے اسے کام دینا چاہتا ہوں۔ وہ نہیں ہے۔ اس سے ہمارے بہت سے مسائل حل ہو جاتے ہیں۔ سمجھ رہے ہو، نا.....''

خوش لباس شخص نے دھیرے دھیرے کچھ سوچتے ہوئے گردن ہلائی۔ پھر اس نے میری طرف اشارہ کیا۔ میں گھبرایا سا دونوں کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

چلو، کام سے لگ جاؤ، بغیر تاخیر کیے۔

اس نے حکم دیا۔ مجھے عجیب سا لگا، تاہم جھٹ پٹ آگے بڑھ کر میں نے کام سنبھال لیا۔ سر پر تیز سورج تھا۔ دھرتی جل رہی تھی۔ میں مستقل کام کر رہا تھا۔ مگر..... وہ مزدور کہاں تھے..... نہیں..... وہ نہیں تھے..... مگر ابھی تو وہ یہیں تھے..... یہیں میرا تمسخر اڑا رہے تھے۔ مگر اب وہ نہیں تھے..... کہیں نہیں تھے..... یا میں انہیں نہیں دیکھ پا رہا تھا۔ یا وہ مجھے نہیں دیکھ پا رہے تھے۔

اس دن میں لوٹتے ہوئے کافی تھک چکا تھا۔ جیسا ماں نے بھی دیکھا۔ میرے ہاتھوں اور پاؤں میں چھالے پڑ گئے تھے۔ میں ماں کے گھٹنوں کے پاس بیٹھ گیا۔ میں اپنے چہرے پر تمام فخریہ جذبات سمیٹے میرے ہاتھ سہلا رہی تھی۔

''اذیت..... آہ' اپنے ہونے کے لئے یہ اذیب بھی کتنی ضروری شے ہے..... وہ مسکرائی۔تم نے ثابت کر دیا ہے..... تم برداشت کر سکتے ہو، اس لئے کہ تم ہو.....''

ماں کی باتیں میرے لئے تکلیف دہ تھیں۔ ماں نے پھر مجھ سے میرے مزدور ساتھیوں کے بارے میں پوچھا۔

''نہیں وہ نہیں تھے، میں نے اپنا تاثر بیان کیا۔ جبکہ وہ وہیں تھے۔میرے قریب..... اور کام کر رہے تھے..... مگر وہ مجھے دکھائی نہیں دیئے''

''آہ۔ ماں کو افسوس ہوا____ اذیت' سب کتنی اذیت سہہ رہے ہیں۔تو تمہیں وہ دکھائی نہیں دیئے؟''

''نہیں۔وہ تھے ہی نہیں۔''

ماں نے مجھے دلاسا دیا۔میرا سر سہلایا۔ پھر پیار سے بولی____ وہ تھے بیٹے۔ ایسے ہی، جیسے کہ تم ہو..... ہاں' وہ ہیں اور تمہیں یہ بات برابر ان لوگوں کو بتانی چاہئے کہ وہ تھے، وہ ہیں..... اور وہ ہمیشہ سے موجود ہیں.....''

ماں نے اس بار اپنا چہرہ چھپالیا۔ممکن ہے ایسا کرتے ہوئے وہ بابا کو تلاش کر رہی ہو، جواب نہیں تھا۔مگر جس کے ہونے کا احساس ماں کے اندر زندہ تھا۔

حیران مت ہو سنگی مترا

باہر نکلتے ہی سنگی مترا کو بھتوش کی بات یاد آنے لگی۔ سب کچھ نہ بدلے تب بھی کیا فرق پڑتا ہے؟

ہاں کیا فرق پڑتا ہے.....

سنگی مترا جیسے اپنے آپ سے بد بدائی۔ دیکھا نا، بھول گئی کہ وہ کس لئے باہر نکلی تھی؟ کس کام سے؟ یہ غلط بات ہے۔ ذرا دیر میں سب بھول جاتی ہے۔ حافظہ کمزور ہونے لگا ہے۔ کتنی بار وہ جسدیو سے کہہ چکی ہے گڑے مردے بھی کہیں ایسے نہیں سڑتے جیسے وہ..... بس یہی آ کر نال گڑا گئی..... سڑنے کے لئے۔ سنتے ہیں زمین میں گاڑے جانے والے مردوں کی ہڈیاں بھی گھومتی رہتی ہیں..... جغرافیہ میں کہیں بچپن میں پڑھا تھا۔ زمین گھومتی ہے، مگر اس کی تو نال گڑا گئی۔

کھڑ..... کھڑ..... کھڑ..... کھڑ.....

پتلی سی سنکری گلی۔ ذرا سی نگاہ دائیں طرف چلی گئی کہ مشکل..... ماڈرن ٹیلر..... ناک سے بار بار پھسل جانے والے چشمے کو برابر کرتا کھوسٹ قدوس غور سے اس کی طرف دیکھتا ہے..... ''بائی، تم برابر والی گلی میں رہتا کیا؟''

''ہاں.....''

''تم اچھا لوگ بائی۔ اکھا بمبئی میں اچھا لوگ ملتا کہاں بائی.....؟

کھڑ کھڑ..... کپڑوں پر سرسراتی قینچیاں گھماتا کھوسٹ قدوس جب آگے کے ٹوٹے ہوئے پورے بارہ دانتوں کے ساتھ مسکراتا تو اس کے تن بدن میں جیسے آگ دوڑ جاتی۔ یہ کہاں آخر پھنس گئی ہو تم سنگی مترا۔ یہ تمہارا کلکتہ نہیں ہے، بمبئی ہے

رحمت کباڑیا کے دیدے بھی اسے دیکھ کر یوں پھسل جاتے ہیں۔ جیسے وہ سنگی مترا نہیں، گوشت کی تازہ ذائقہ دار بوٹی ہو۔ ہر وقت اپنے کباڑ میں سر دیئے ترازو اور ''باٹ کھڑوں'' کے بیچ اپنی گنجی کھوپڑی کی نمائش کرتا..... کلکتہ کی سڑکوں پر ایک بار اس نے ایک پھل فروش کو رام پھل بیچتے ہوئے دیکھا تھا۔ پتہ نہیں کیوں رحمت کباڑیے کو دیکھ کر اسے وہ پھل فروش یاد آجاتا.....

مگر وہ باہر کیوں نکلی تھی.....؟

کھوسٹ قدوس نے پھر اپنی ''اٹھائیسی'' دکھائی۔

''کہاں جاتا بائی۔ پن کو بول۔''

رحمت کباڑیے کا گنج چمک اٹھا۔ ترازو دھم سے زمین پر رکھتے ہی پاؤ پاؤ بھر کے دو پلڑے زمین پر لڑھکتے چلے گئے۔

''کچھ کہا کیا بائی؟''

سنگی مترا نے منہ بنایا۔ اندر تک ایک آگ بھر گئی۔ پیر پٹکتی وہ آگے بڑھ گئی——

دیر تک رحمت کباڑیا اور کھوسٹ قدوس کے قہقہے اس کا پیچھا کرتے رہے۔

جسدیو نے اسے طنز سے دیکھا تھا۔

''سنگی مترا، تمہاری ساری ترقی پسندی ایسے میں کہاں کھو جاتی ہے؟''

پھر جلے پر نمک چھڑکتے ہوئے ایک ساتھ کتنے ہی طنزیہ قہقہے وہ اس کے مہ پر اچھال دیتا۔

''شادی تو تم نے اپنی پسند سے کی..... کیوں پھر بمبئی آنے میں تمہیں اعتراض کیوں ہوتا..... ہوا بھی نہیں..... مہانگر کا اپنا ہی گلیمر تھا۔ ہاں سوچا ہوگا..... ویسا مکان ہوگا جیسا بمبیا فلموں میں دکھائی دیتا ہے..... آدمی چاہے معمولی ہو، سورو پلی

کماتا ہو یا ہزار..... بمبیا فلموں کے مکان تو محل لگتے ہیں۔''

سنگی مترا کیا یہ سچ ہے..... وہ چپ تھی..... جسدیو کے ہنستے چہرے کو تک رہی تھی جسدیو نے اسے اپنے پاس کھینچا۔

''کیوں نسنگی؟ تم نے ایسے ہی کسی مکان کا تصور کیا تھا نا؟ اور نوکری کا خواب ٹوٹ گئے کیا؟ کیا لگتا ہے تمہیں؟''

سنگی مترا ایک دم سے سنجیدہ بن گئی۔ ''آج کی سنگی کیسی دکھائی دیتی ہے تمہیں؟ بار بار تم سے جرح کرنے والی؟ سوال کرنے والی؟ یہاں سے پیدا ہونے والے ڈھیر سارے سوالوں کو متہاری آنکھوں میں دیکھنے والی؟''

سنگی نے سر اونچا کیا..... ''حافظہ کمزور ہے تمہارا جسدیو یا تو سب بھول جاتے ہو یا کہیں دل میں اپنے آج پر تھوڑا سا افسوس ہوتا ہے.....''

''کیوں؟'' جسدیو چونکا۔

سنگی مترا ہنس دی۔ ''بس ایسے ہی۔ ورنہ تم اپنی سنگی سے یہ تو نہیں پوچھتے۔ ایسے پوچھتے ہو جیسے اسے جانتے ہی نہیں۔''

جسدیو ہنس دیا۔ لیکن پھر سنجیدہ بن گیا..... ''اکلوتے'' کمرے کے بکھراؤ پر ایک نظر ڈالی۔ صفائی تھی۔ لیکن کباڑ اپنی جگہ تھا۔ چیزیں تھوڑی سی ہوں۔ مگر کمرہ ایک ہو تو بکھرا بکھرا سا لگتا ہے۔ سنگی کو اپنے گھر کا سجا ہوا بیڈروم ڈرائنگ روم یاد آجاتا۔ چمچماتے فرش کو جب بھی چاہو۔ ''انگلی'' لگا کر دیکھ لو۔ ایک ذرا اگر دکا نام ونشان نہیں۔

''پھر بھی سنگی! تھوڑا سا افسوس تو ہوتا ہوگا؟''

جسدیو نے پینٹ شرٹ دیوار پر گڑی کھونٹی سے لٹکا دی۔ اس نے نظر اٹھائی تو جسدیو ہنس دیا۔

''یقین نہیں آتا تم وہی ہو اپنے بمل مترا کی لڑکی سنگی مترا۔''

کھونٹی سے ٹنگے شوہر کے، شکن آلود قسم کے کپڑوں کو دیکھ کر بھی کچھ ٹوٹا نہیں کیا تمہارے اندر؟ ایک ہی کمرے میں گوہ سے موت تک کے سارے سامان ...... یہ کھولی بھی تو مشکل سے ملی ہے سنگی مترا۔

اس نے ایک بے مطلب سا قہقہہ اچھالا۔ یہاں سب کو لال اور ہری جھنڈیاں کھینچ لاتی ہیں سنگی۔ سپنوں کی لال اور ہری جھنڈیاں ......لکھتا تھا نا؟ سوچتا تھا چانس تو بمبئی میں ہے۔ چھلانگ لگا دو اور سبھاش گھئی کو پکڑ لو ...... ایک ہٹ کہانی کا آئیڈیا سنا دو۔ اپنی بنگالی فلموں کا اتنا ڈیمانڈ نہیں ہوتا نا ...... بمبئی کی بات ہی اور ہے۔ ایک دم سے ایک ہی بار میں سپر ہٹ ...... نہیں ......؟ بمبئی کے کتنے ہی ہیرو سپر اسٹار بننے سے پہلے ان ہی کھولیوں میں رہا کرتے تھے سنگی۔ این چندرا سے جیکی شیروف تک اور یہاں آ کر بارہ سو روپلی کی چکی پیس رہا ہوں۔

اس نے نظریں جھکا لیں اور جیسے سنگی مترا کے بدن کو نظر کے ہر زاویے سے تول لیا۔ خوبصورت پرکشش جسم، جسم پر معمولی نوعیت کی ساڑی۔ سانولا چہرہ۔ گہری اور اندر تک اتر جانے والی آنکھیں۔ بکھرے ہوئے بال۔ غضب کی سادگی۔

"دکھ ہوتا ہے۔"

سپنوں کی پتھریلی سڑک پر چلتے ہوئے تیرے ساتھ کیا کیا سوچا تھا۔

اور کیسے کیسے تصورات کے مکان آباد کئے تھے۔ ایسے ہوتا ...... کاش ایسا ہوتا!

اور ہر ایسا ہوتا کے بعد ایسا ہوتا کا ایک لمبا سلسلہ ...... وہ قریب کھسک آئی۔ چہروں کے درمیان ہونٹ چھو لینے بھر کا فاصلہ رہا۔ آنکھیں آنکھوں کے پاس لہرائیں۔"

سنگی مترا ہولے سے مسکرا دی..... ''سنو! تم وہی جسدیو ہو نا؟''

وہ شرارت سے ہنسی..... یاد ہے تین چار ملاقاتوں کے بعد تم نے کیا کہا تھا؟ تم اتنی سجی ہوئی کیوں رہتی ہو سنگی مترا؟ سچ تو یہ ہے کہ سجنا مجھے کبھی پسند نہیں تھا۔ صرف تمہارے لئے، تمہاری آنکھوں میں بسنے کے لئے..... بندی بھی لگالی تھی اور..... یاد ہے تم نے کیا کہا تھا..... مجھے تو سب کچھ بکھرا بکھرا پسند ہے۔ بکھری چیزیں، کمرہ کتابیں اور بکھری بکھری سی عورت..... یاد ہے؟..... دھت۔ دوسرے دن ہی میں ہمیشہ والی سادگی میں تمہارے سامنے تھی۔ تم ہنسے تھے۔ بس ایسے ہی رہنا سنگی ہمیشہ.....''

سنگی چپ ہوگئی۔

جسدیو نے پوچھا۔ ''یہ گزرا ہوا کیوں یاد آیا تمہیں؟''

''تم نے سپنوں کی پتھریلی سڑک کی بات کی نا اور دکھ کے کنکر چنے، اس لئے۔''

سنگی ایک بار پھر قہقہہ بار تھی۔ ''سنو! ایک بات پوچھوں؟''

''پوچھو.....''

''اپنے آپ کو ترقی پسند کہتے ہو نا تم لوگ؟''

''کہتا ہوں کیا مطلب.....؟ جسدیو بگڑا ''یہ تو آئیڈیولوجی کی بات ہے۔''

''بکواس..... سب ڈھونگ ہیں تمہارے۔ کھانا نہیں بناؤں گی آج۔ بھوکے رہنا۔''

جسدیو نے اس کی چوٹی کھینچی ——— ''سنگی کی بچی۔ کھانے کی بات چھوڑ۔ یہ آئیڈیالوجی پر چوٹ کیوں کی؟''

''آں پہلے چوٹی چھوڑو.....'' درد کی ہلکی سی شکن اس کے چہرے پر ابھری۔ سنگی اٹھ کھڑی ہوئی۔ کھانا نہیں بنا تو الٹا نقصان اسی کا ہے..... ''چلو..... چلتی ہوں کھانا بنانے۔''

اس نے آگے بڑھنا چاہا تو جسدیو غصّے میں آگے تن گیا۔

''سنگی کی بچی۔''

''پی۔ پریکٹیکل یہ ہر وقت کا جھگڑا اچھا نہیں لگتا۔''

سنگی نے ننگے پاؤں سے زمین کھجائی ——— جو کل تھا، جو کل کی باتیں تھیں۔ روزی، روٹی اور پریشانیوں کو آج سے جوڑتے ہوئے جب تم اس کل پر انگلی اٹھاتے ہو تو بہت چھوٹے لگتے ہو..... اپنے قد سے بہت کم..... جانے دو نا..... بہت کام پڑے ہیں۔''

''نہیں.....''

بُرا نہیں مانو گے نا.....؟

''نہیں۔''

''لفظوں میں اور حقیقت میں فرق ہوتا ہ جسدیو..... تم اور تمہارے دوست کبھی کبھی سب مجھے دوغلے لگتے ہو۔''

جسدیو ن حیرت سے دیکھا۔ مگر تبتک سنگی باتھ روم کا دروازہ بند کر چکی تھی۔

بارہ سو روپلی سے پہلے کلکتہ کی سڑکیں ناپتے ہوئے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ آنے والے دنوں میں کبھی حقیقت کے اس پل صراط سے بھی گزرنا پڑ سکتا ہے..... نازک سی عمر..... احساس اور جذبات کے نرم نرم روئی کے گالے..... اور شعر و شاعری، جو جنم سے ورثے میں ملی تھی ——— جو آنکھ کھلتے ہی اس نے بنگالی تہذیب میں گھلا ملا پایا تھا۔ نازک سی عمر اور کالج کا زمانہ..... کلکتہ کی مصروف تین سڑکیں..... ٹرام اور گاڑیوں کے شور..... غریبی اور بے روزگاری کے قدم قدم پر کچلے ہوئے جسم اور..... کلکتہ..... رکشے میں جتا آدمی..... بھیڑ میں پھنسا آدمی..... اور ننگا سا کلکتہ..... بے حال سا کلکتہ..... جینس کا پینٹ، کھادی کا کرتا اور کندھے سے جھولا لٹکائے۔ تب

سارا سارا دن وہ کلکتہ کی سڑکیں ناپ رہا ہوتا۔تب اس نے پہلی کویتا (نظم) لکھی تھی...... رکشے میں جتا ہوا بہاری...... پھر اس نے ہوڑہ کے جوٹ ملس میں کام کرنے والے ایک بوڑھے مزدور سے متاثر ہوکر دوسری کویتا لکھی۔یہ کویتا بھی بہت مقبول رہی...... پھر سنگی ملی تھی۔سنگی مترا...... تب درد کو نیا نیا پالنے کا شوق ہوا تھا...... گلیمر ــــــ سامنے تمہاری پسند کی ایک خوبصورت لڑکی بیٹھی ہو۔لڑکی پڑھی لکھی ہو...... ذرا اس درد کو اچھی طرح الفاظ میں اتار کر تو دیکھو۔آنکھیں بند کر کے...... مسکرا کر...... خوبصورت معنی خیز الفاظ میں اتار کر...... وہ بہاری رکشے والا...... جوٹ ملس کا وہ بوڑھا مزدور...... سنگی مترا...... مجسم مورت بنی اس کے لفظوں کے سحر میں کھوئی تھی۔

”آؤ سنگی۔“

اس نے شام ک ڈھلتے سایوں میں اپنے سایو کا عکس دیکھ لیا۔آؤ سنگی چلتے ہیں۔ اصل کلکتہ تو یہاں بت ہے۔جوٹ ملس کے اس مزدور میں۔آدمی کو ڈھونے والے اس بہاری مزدور میں...... سردی ہو، برسات ہو یا گرمی۔راتوں کو فٹ پاتھ آباد کئے لاکھوں بے گھر غریبوں میں، جنہیں کلکتہ واسی کہلانے کا بھی کوئی حق نہیں۔“

سنگی جیسے حیرت زدہ تھی۔اس نے غور سے جسد یو کو دیکھا۔ایسے کہ میوزیم سے اٹھ کے جیسے کوئی شاہکار اس کے سامنے آ گیا ہو، یا پھر اس نئے زمانے میں اس نے کسی شخص میں اربندو گھوش یا ٹیگور کو دیکھ لیا ہو۔

”تم...... جسد یو تم؟“

”سنگی...... میرا ہاتھ تھام لو۔“

* *

شہر کی پرچھائیوں میں سمٹتے ہوئے اسے کتنی ہی بار محسوس ہوا۔سنگی نے چند لمحوں میں جیسے اسے ہزاروں لاکھوں بار دیکھنے اور پڑھنے کی کوشش کی ہو......

خوابوں کے ہزاروں دروازے تھے اور خوشبوؤں میں ڈوبا ہر دروازہ بمبئی کی طرف کھلتا تھا۔

اس نے سنگی کی طرف دیکھا..... ''میری کویتا کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی ہے سنگی۔''

سنگی مسکرائی..... وہ کیسے؟''

''کل صرف آوارہ سڑکیں تھیں اور ملک کی غریبی..... اب روزگار ہے اور میری اپنا کیریئر'' جسدیو ہنسا۔ ایک بات کہوں..... آدمی ڈھونے والے اس بہاری مزدور کا چہرہ بھی کچھ دھندلا سا پڑ گیا ہے اور جوٹ ملس والا بوڑھا اچانک کہیں غائب ہو گیا..... ایسا کیوں ہو رہا ہے سنگی؟''

سنگی مترا ہنسی نہیں۔ اس نے غور سے جسدیو کو دیکھا..... بے جان بت کی طرح اس کے سینے پر بچھ گئی۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ ''ایک آنکھ میں کتنی آنکھیں ہوتی ہیں جسدیو۔ ایک چہرے میں کتنے چہرے؟''

''سنگی!''

''خواب تو بہلی سیڑھی دیکھنے تک سہانا رہتا ہے جسدیو۔ سیڑھی دیکھ لی اور پہلی سیڑھی پر چڑھنے کی نوبت آ گئی تو..... پچھلا سب باسی اور کوڑا لگنے لگتا ہے ایسا ہوتا ہے نا.....!

بمبئی.....

کھولی کے دروازے تک جو گندھ پھیلی تھی ہمت اور حوصلے کے بیچ وہ گندھ اسے کہیں سے بری نہیں لگی تھی۔ ہاں برے لگے تھے تو آس پاس کے لوگ..... وہ بوڑھا قدوس اور وہ رحمت کباڑیا..... ''کہاں سے آنا ہوا بائی..... کلکتہ.....

''تمہارے ہسبنڈ کیا کرتا بائی..... پھلم میں گانا لکھنے کو مانگتا..... آئیں۔''

آئے دن کے ان تذکروں سے اندر ہی اندر زخمی ہوا تھا جسدیو..... وہ جیسے تسلی

کے لئے لفظ جوڑتا.....

بس کچھ دن کچھ ہی دنوں کی بات ہے سنگی.....

اسے لے دے کر بس یہی غم کھائے جاتا..... ایک کمرے کی کھولی، بکھرا ہوا سامان۔ آس پاس کے گندے لوگ.....

''سنگی! تمہاری کہیں اور شادی ہوتی تو؟.....''

وہ مسکرا کر کہتی..... ''جسدیو! ہم نے لو میرج کی ہے۔ یہ کیوں بھول جاتے ہو۔ تم سنگھرش کرو۔ سنگھرش کرنے میں شرم کیسی؟''

اس دن پہلی بار وہ ابھتوش سے ملی تھی۔ تذکرے تو جسدیو سے کافی سن چکی تھی۔ لیکن ملی تھی پہلی بار..... اور پہلی ہی بار میں ابھتوش نے یہ احساس نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ اجنبی ہیں۔

''کیوں بھابی۔ بمبئی پسند آیا.....''

ابھتوش ہنستا تھا۔ کچھ عجیب تو نہیں لگا ــــــ زندگی میں ہر طرح کے تجربے تو ہونے ہی چاہئیں۔ ان تجربوں سے گزر کر ہی انسان ہونے کا درد جاگتا ہے۔ پہلی بار جب بمبئی آیا تھا تو میرا ایک دوست یہاں ایک چال میں رہتا تھا..... مجھے بھی جگہ مل گئی کیوں؟ جسدیو تو پھر بھی مجھ سے بہتر تھا۔

پہلی بار میں ہی ابھتوش کا گہرا رنگ اس پر چڑھا تھا۔

ابھتوش روانی میں بول رہا تھا۔ ''چال میں کیسے کیسے رنگ تھے اور کیسی کیسی دنیا آباد تھی۔ رشتوں کی نازک ڈال کے بیچ شرم و حیا کے زیور نہ تھے۔ وہاں ایک دوست بنا تھا رگھو۔ پانچ روپے کا ٹھرا پلا دو، پھر اس کا ٹیپ آن..... کہتا تھا بہو کی ننگی ٹانگیں دیکھے باپ۔ بہو بیٹے کا ملن بھی دیکھے ایسا اپنا چال۔ رہو وہیں ہو تو وہیں..... کھاؤ وہیں۔ وہی سنڈاس جیسا کمرہ اور دس دس افراد یہی اپنا چال۔

سنگی متر اسنا ٹے میں تھی۔

''پہلی بار..... اپنے درست ہاتھ پیر دیکھ کر لگا تھا۔ بھابی، ہم کتنے خوش قسمت ہیں۔ یہاں تو جینے کو جانور بننا پڑتا ہے۔ڈرین پائپ میں لیٹنے کا بھی ٹیکس لگتا ہے.....

ابھتوش چلا گیا..... سنگی اس پوری رات حیران و پریشان رہی۔ وہی بکھرا سا کمرہ۔لیکن اس دن ابھتوش کے جانے کے بعد اس نے اطمینان کی ٹھنڈی سانس بھری۔خوب خوب پیار کیا جسد یو کو۔

''ایسی کیا بات ہے، جسد یو حیران تھا۔ پھر وہ بتانے لگا: سیریلس بھی لکھنے کے آفر ملنے لگے ہیں۔کوکیز، ٹیلی فلم، مارننگ، آفٹرنون ٹرانسمیشن کے لئے..... وہ ہنسا..... یہاں رائٹر تو بہت ہیں، اسکرپٹ رائٹر کم ہیں۔''

جسد یو نے سنگی کی آنکھوں میں جھانکا۔

سنگی جیسے خود سے بولی۔''دھیرے دھیرے مجھے اس کمرے کی سیلن اور بدبو سے پیار ہوتا جا رہا ہے۔''

اس دن شاپنگ کے لئے ابھتوش کے ساتھ وہ دو قدم چلی تھی۔کھوسٹ قدوس اور رحمت کباڑیے نے دونوں کو دیدے نکال کر دیکھا.....

بائی.....

آواز جیسے جلتے سیسے کی طرح اس کے کان میں اتری ——

ابھتوش نے پلٹ کر اس کے چہرے کی شکن دیکھ لی تھی ——

''ان نفرت رنگوں کو وہیں چھوڑ دیا کرو بھابھی۔''

اس روز وہ سارا دن غصّے میں رہی۔ کھولی اور آس پاس والوں پر غصہ آتا رہا۔ جسدیو خوب ہنسا تھا۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ یہ ہنسی کتنی مصنوعی تھی۔

جسدیو نے اس کا مذاق اڑایا۔

''سنگی مترا، یہ تمہاری پرواز کہاں کھوتی جا رہی ہے۔''

لیکن اس بار چونکی نہیں سنگی مترا۔ طنز سے مسکرائی۔ ''بچپن میں ایک کہانی پڑھی تھی جسدیو۔ شہزادی راستہ بھول جاتی ہے۔ راستہ بھول کر وہ غلطی پر غلطی کرتی جاتی ہے۔ تم جسدیو..... تو جیسے لوگوں کے پاس کوئی آئیڈیالوجی تھی بھی کیا؟ یا سب رومانٹیسیزم..... کوری رومانٹیسیزم.....

وہ ہنسی..... پہلے تم یا تمہارا درد نہیں، کتابیں بولتی تھیں ـــــــ اس لئے کہ بیکار تھے تم۔ اور ٹھوسنے کے لئے ایک گھر تھا تمہارے پاس۔ جیب خرچ کا بار اٹھانے کے لئے بابو جی تھے۔ اب اپنے لئے تم خود ہو جسدیو۔ تو تمہارا درد وہیں رہ گیا ہے۔ جوٹ ملس کے اس بوڑھے کے پاس یا رکشہ ڈھونے والے اس بہاری مزدور کے پاس۔''

جسدیو نے بات بدلی۔ ''ڈیڑھ سال میں کتنا بڑا فرق آ گیا۔ اب تم لڑنے بھی لگی ہو.....''

سنگھرش کے پاؤں اوبڑ کھابڑ زمینوں پر بڑھتے رہتے تھے۔ جسدیو کو دھیرے دھیرے کام ملنے لگا تھا۔ اس بیچ صرف ایک بات ہوئی۔ دو ماہ کے لئے وہ اپنے گھر گئی تو اماں نے سر جو کو ساتھ کر دیا..... جو وہاں اماں کا سارا کام دیکھتی تھی۔ اماں کا ہاتھ پیر سب کچھ تھی۔ لیکن وہ..... اماں کی پہلی لڑکی تھی نا..... اماں کی دلاری..... اور اماں نے اس کے پیٹ میں دھیرے دھیرے چھوٹے چھوٹے پاؤں نکالتے بچے کا لمس محسوس کر لیا تھا.....

''حماقت مت کرسنگی..... یہ آرام کا سمے ہے۔ جسدیو کو بھی سمجھا دینا۔''

''نہیں اماں.....؟''

اماں نے بات کاٹ دی..... ''جانتی ہوں سب..... ایک کھولی ہے تمہارے پاس۔ ایک جن بڑھ جائے تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔''

سرجو.....

عجیب سا لگتا ہے نا؟ پیٹ کا بچہ جب دھیرے دھیرے اندر پاؤں پسارتا ہے تو؟ عجیب سی گدگدی مچتی ہے پورے وجود میں..... جسدیو..... وہ گنگناتے ہوئے ذرا پاس سمٹ آئی..... دیکھنا، ہلتا ہے یہ..... گھومتا ہے..... ناچتا ہے..... پورے پیٹ میں..... دھت..... اسے خود ہی شرم آ گئی۔

سرجو کہاں ہے..... بالکنی میں..... کمرے اور کچن کے بیچ نکلتی تھوڑی سی جگہ..... اس دن رات کے وقت اچانک سامنے نکل کر کھڑی ہو گئی تھی سرجو.....

''میم سائب، بائی رے برشٹی پور چھے بھیتر وشو بو؟'' (میم صاحب، باہر ٹپ ٹپ ہو رہی ہے ــــــ اندر سو جاؤں)

سنگی جلدی سے بولی۔ ''سو جاؤ.....''

سرجو کو حیرت تھی۔ ''میم سائب۔ یہ کیسی جگہ تم آ گیا۔ یہاں سب بائی بولتا۔

اس نے ڈانٹا..... ''اپنے کام سے کام رکھو سرجو.....''

ابھتوش نے بھی سرجو کا سواگت کیا۔ ''تم نے تو کھولی کو محل بنا دیا بھابی۔ چلو اچھا ہے۔ جب تک تین نہیں ہو جاتے، باتیں کرنے کے لئے کوئی تو ہو گا تمہارے پاس۔''

''نا میں نے بمبئی میں نہیں رہنا زندگی بھر..... ''سنگی مترا نے منہ بنایا..... ابھیتوش! یہاں تو صرف گدھ ہی گدھ نظر آتے ہیں مجھے۔''

ابھتوش نے سرجو کی طرف دیکھا، جو دھیان سے ٹکٹکی لگائے اس طرف دیکھ رہی

تھی۔اس کا لہجہ یکا یک بہت سنجیدہ ہو گیا۔ ''گدھ نہیں بھابی۔ یہاں وہ جانور بستے ہیں جو اپنے طور پر اپنی زندگی گزارنے کا حق نہیں رکھتے۔پیسوں سے اپنی خوشی بھی نہیں خرید سکتے.....صرف تھکن.....وہی بیچتے ہیں، اوڑھتے ہیں.....خریدتے ہیں پیتے ہیں.....''

''میں نے انہیں گدھ کہا ہے.....''سنگی نے زور دیا۔

وہی تو کہہ رہا ہوں.....تم جنہیں دیکھتی ہو اور جیسا سمجھتی ہو، ویسا نہیں ہے۔یہ آنکھیں خوشی ڈھونڈتی پھرتی ہیں بھابی۔ یہ خوشی کسی بھی ہنستے چہرے میں مل سکتی ہے۔

سنگی مترا نے قہقہہ لگایا.....''بشرطیکہ چہرہ لڑکی کا ہو۔''

سرجو سبزی لے کر کچن میں چلی گئی۔

سنگی نے کچن کی طرف جاتی ہوئی ابھیتوش کی نظروں کا جائزہ لیا، جو اسی سنجیدگی بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا۔''لیکن اس کے باوجود بھابی تم اسے بھوک نہیں کہہ سکتیں۔''

''بنومت''سنگی نے منہ بنالیا.....''کان ایسے پکڑو چاہے ویسے.....بھوک تو بھوک ہی ہوتی ہے۔اپنی بیوی کے ہوتے دوسرے کی بیوی کی طرف جب گدھ جیسی نظر اٹھتی ہے نا.....''

ابھیتوش ہنسا.....''تم کیوں چاہتی ہو بھابی کہ سب کچھ بدل جائے۔سب نہ بدلے تب بھی کیا فرق پڑتا ہے۔''

پتہ نہیں کیوں اسے محسوس ہوا جیسے سرجو سبزی کاٹنے کا بہانہ لے کر ایک ٹک ابھیتوش کو دیکھتی رہی ہو اور ابھیتوش بھی باتوں کے درمیان سرجو سے باتیں کرنے کا جواز ڈھونڈتا رہا ہو.....''کیوں سرجو.....آج چپ کیوں ہو؟ طبیعت خراب ہے

کیا؟ آج کیا بنا رہی ہو..... چائے نہیں پلاؤ گی.....؟

ابھیتوش چلا گیا تو سنگی مترا نے سوچا۔ ایسا کیوں ہے؟ اس نے ایسا کیوں محسوس کیا؟ کہیں کوئی طلب تھی کیا؟

نا.....؟ پھر..... سرجو مستقل ابھیتوش سے سٹ کر بیٹھی رہی تھی۔ کہیں کوئی برسوں سے ٹھنڈی پڑی آگ تھی کیا جو ذرا سا بھڑکی تھی۔

اس دن تیز تیز بارش ہو رہی تھی۔ بالکنی سے ہو کر پانی کے چھینٹ اندر کمرے تک آ گئے تھے۔ آج صبح سے ہی سرجو کچھ زیادہ تیز آواز میں بول رہی تھی۔ بات بات پر سلگ اٹھتی تھی۔ غصہ ہو جاتی۔ ''بنیا کے یہاں میں نہیں جاؤں گی میم سائب.....'' دو دنوں سے پانی بھی نہیں آ رہا تھا۔ نیچے ہینڈ پمپ تھا۔ جسدیو تو رات میں آتا تھا۔ سرجو نے ہاتھ پاؤں پھیلا دیئے ——— کھانا کیسے بنے گا۔ ''میں نہیں لاؤں گی پانی..... اتنی اتنی سیڑھیاں طے کر کے نیچے جانا پڑتا ہے۔''

''سرجو.....''

اس نے سرجو کا جائزہ لیا۔ ساڑی کا آنچل ڈھلک گیا تھا۔ اس کا دودھیا پیٹ اب نظروں کے سامنے تھا۔ سنگی نے غور سے دیکھا، چولی کے بٹن تک ٹھیک سے نہیں لگے تھے۔ سرجو کے بدن سے آگ کی جھاس اٹھتی ہوئی محسوس ہوئی اسے، گرم گرم بھاپ۔

''اے بھابی کی دیکھچن'' (ایسے کیا دیکھتی ہو میم سائب) سرجو فوراً پلٹی ایک بار اس نے ڈانٹا بھی۔ ''تیز تیز آواز میں کیوں بولتی ہو سرجو۔ سیدھے منہ کیوں نہیں بولتی۔''

جسدیو آیا تو اس نے پوچھا۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے جسدیو۔ ایسا کیوں ہے؟''

جسدیو کچھ زیادہ ہی تھک گیا تھا۔ ''تم تھکی تھکی سی لگ رہی ہو سنگی۔ سو جاؤ۔''

''میں تک گئی ہوں۔''سنگی نے جسدیو کے کھردرے ہاتھوں کو تھاما..... سب کچھ بدل رہا ہے جسدیو۔اس گھر کا ماحول..... اور بھی بہت کچھ..... پتہ نہیں یہ صرف میں محسوس کر رہی ہوں یا تم بھی۔اور بدلا ہے صرف.....''

جسدیو نے انگڑائی لی..... سر جو کے آنے سے۔''

وہ ایک دم سے چونکی۔ابھیتوش تو کہتا ہے کچھ نہ بدلے تب بھی کیا فرق پڑتا ہے..... لیکن فرق تو پڑا ہے جسدیو۔سر جو کے آنے سے کچھ تو فرق پڑا ہے۔

ابھیتوش کے بارے میں سنتی رہی تھی۔سوشل ایکٹی وسٹ۔صرف کہتا نہیں ہے کرتا بھی ہے۔جسدیو اور اس میں اتنا فرق ہے۔انقلاب صرف اس کے لئے بغاوت بھرا لفظ نہیں ہے بلکہ اس لفظ میں جیتا ہے۔جسدیو خالی ہوتا تو ابھیتوش کی تعریف لے کر شروع ہو جاتا، وہ بھی ابھیتوش کو دیکھتی رہی تھی۔بمبئی آنے کے بعد، اس کھولی میں رہنے سے لے کر اب تک۔اتنا پیار اور دوست تو پردیس میں مشکل سے ہی ملتا ہے۔جان چھڑکنے والا..... ذرا سے درد پر بچھ جانے والا۔انقلاب کے تیور تو وہ شروع سے ابھیتوش میں پڑھتی رہی تھی..... اس کی سرگرمیاں..... چال میں لڑائی ہوئی۔جھونپڑیاں خالی کرانے آئے غنڈوں سے ہاتھا پائی کی نوبت آ گئی..... مل میں ہڑتال شروع کروادی۔ابھیتوش خوب خوب ہنساتا، دنیا بھر کی باتیں لے کر بیٹھ جاتا، ان میں اپنے مسائل بھی ہوتے، دنیاوی خبریں بھی۔روس میں لینن اور مارکس کی ہٹائی جانے والی مورتیوں کا بھی تذکرہ ہوتا۔

جسدیو کی رومانی، لچھے دار گفتگو کے تاج محل تو بہت پیچھے چھوٹ گئے تھے۔وہ سوچتی۔سچ کیا ایسا ہوتا ہے سنگی مترا..... وواہ (شادی) سے پہلے شوقیہ آنکھوں میں بسنے تک، لڑکی کے سامنے میل جیسے ادھیڑنے تک۔ابھیتوش بھی کل..... شادی کے بعد ویسا ہی ہو جائے گا جیسا جسدیو ہے..... کتنی بار بے خیالی میں اس نے جسدیو کی

کچھے (انڈرویئر) سے جھانکتی پتلی پتلی ٹانگیں اور دبلے پتلے جسم کو دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔ ''خوابوں کا بھرم کیوں ٹوٹتا ہے جسی۔''

جسدیو چونکا تو وہ ہنستی چلی گئی۔ ''برا مت ماننا، وواہ نہیں ہوا تھا۔ تو تم سپنوں میں بار بار آنے والے ہیرو تھے میرے، جو شان سے لہراتا ہوا گھوڑے پر آتا ہے اور شہزادی کا دل جیت لیتا ہے......تب یہ کچھے سے جھانکتی پتلی پتلی ٹانگیں نہیں تھیں تمہاری۔ تب صرف تمہارے لفظ تھے اور ان لفظوں سے بنا ہوا ایک خوبصورت سنسار......مجھے لگتا ہے اس عمر میں سب مرد ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اب تمہارے بعد ابھیتوش کو پڑ رہی ہوں۔''

جسدیو ناراض ہوتا تو وہ اسے چڑھانے کے لئے بول دیتی ——

''بی پریکٹیکل......''

ابھیتوش اور سرجو......کبھی کبھی اسے لگتا، کھولی اور آس پاس کے ماحول نے اس کے من میں گندگی بھر دی ہے۔ ایسی ایسی باتیں کیوں سوچتی ہے وہ......جن کا نہ سر ہوتا ہے نہ پیر......دو دو باتیں کر لینے سے کوئی برا تو نہیں بن جاتا......سرجو میں کیا سچ مچ کوئی مانگ جاگی ہے......یا ابھیتوش نے اس مانگ کو محسوس کیا ہے۔ غلط کیا ہے۔ یہ مانگ یا اس کا ایسا سوچنا یا ابھیتوش کے چہرے سے اٹھتی نقاب۔ سنگی مترا کچھ بدل رہا ہے......وہ قد آدم مورتی ٹوٹ رہی ہے جو تمہارے دلوں میں بستی ہے......ٹوٹ رہی ہے نا۔

سرجو پوچھ رہی تھی۔ ''آج بے دادا آ سچھے جا۔ او نار جو نو دوئی ماچھ با نا چھی۔''

دادا وہ ابھیتوش کو کہتی ہے

سنگی چپ رہی۔ جواب نہیں دیا۔ دیوار گھڑی کی طرف دیکھا جو ٹک ٹک کرتی، جسدیو کے آنے کے وقت کا اشارہ کر رہی تھی..... ٹک ٹک..... صبح سے ہی وہ پیٹ کے درد کو لے کر پریشان تھی۔ محبت کے ان لمحوں کو پیٹ میں چھپائے کتنے ماہ گزر گئے۔ اب تو وہ ایک سنسنی خیز موڑ والی جذباتی سڑک پر کھڑی تھی۔ وہ اس کی آہٹ سنتی تھی۔ ننھے کومل کے سر کو محسوس کرتی تھی۔ جب وہ دھیرے دھیرے پیٹ میں ہاتھ پاؤں چلاتا۔

زمانہ کتنا بدل گیا بھابی۔ ابھیتوش نے اس دن ہنستے ہوئے اس کے پھولے پیٹ کو دیکھ کر گورکی (مشہور روسی ناول نگار میکسم گورکی) نئے انسان کی پیدائش کا قصہ سنایا تھا۔ مزدور عورت..... تیز طوفان، بارش، وہ کسی نرسنگ ہوم میں نہیں گئی۔ کسی مڈ وائف کا سہارا نہیں لیا۔ بلکہ وہ تو نیا انسان تھا۔ طوفانی ہوا، مزدوروں کے گیتوں کے بیچ، موسلا دھار بارش میں اس کا جنم ہوا تھا۔

لیکن وہ نیا انسان تو اس کے لئے بس خواب رہا..... اور کچے خوابوں کا بھی کیا ہے؟ وہ نیا انسان تو اندر ہی اندر ٹوٹ پھوٹ کر بکھر گیا۔ کانوں میں کہیں بوڑھے کھوسٹ قدوس کا جملہ لہرایا..... 'بائی تیرے کو تو اس وقت گھر میں ہونا تھا بائی..... وطن میں..... یہ تو گیر ملک ہے..... کھیال رکھنا۔''

گندگی صرف ذہن میں ہوتی ہے کیا؟ سوچنے میں..... اس دن بھی تیز موسلا دھار بارش ہو رہی تھی..... سرجو پریشان سی اس کے سامنے تھی..... میم سائب..... پلکیں موندنے سے پہلے اسے لگا، ابھیتوش اس پر جھکا ہے۔ سرجو، ابھیتوش میں دھیرے دھیرے کچھ باتیں ہو رہی ہیں، جسدیو تم کہاں ہو۔ ایک گھنے اندھیرے کا جنگل تھا..... وہ ڈوبتی جا رہی تھی۔ نیا انسان..... اسے لگا ہولے ہولے پر نکالنے والے بچے نے اندر لمبی خاموشی اوڑھ لی ہو۔ پھر ایک تیز درد اٹھا۔ درد سے

کراہتے ہوۓ وہ ہاتھ کو اندر نائیٹی میں لے گئی اور جب ہاتھ باہر آیا تو........

سنگی مترا...... جیسے یکا یک خوف سے نہا گئی...... منہ سے تیز چیخ نکل گئی۔ اس کے دونوں ہاتھوں نئے انسان کے خون سے سنے تھے۔

☨☨

بارش کب کی رک گئی۔ سنگی نے آنکھیں کھولیں تو پاس میں لگ بھگ جذبات سے کانپتا ہوا جسدیو کھڑا تھا......

سنگی......! اس کی آواز کمزور تھی۔ وہ منہ چھپا کر وہیں بیٹھ گیا۔ سنگی نے بے من سے دونوں ہاتھ اس کی طرف بڑھائے۔ تبھی جیسے ایک چھنا کا سا ہوا۔ اس نے چونک کر دیکھا۔

سرجو کپڑے کی گٹھری لئے اس کے سامنے کھڑی تھی۔ آنکھوں میں بغاوت کے سرخ ڈورے تیر رہے تھے۔

''میم سائب، آمی جا چھی...... آمی باڑی جا چھی...... آمی پھیروت جا چھی......''

سنگی نے اٹھنا چاہا۔ رات کے دھندلکے میں سارا منظر سامنے تھا۔ پتھر جیسے چہرے سے اس نے سرجو کو گھورا......

''ابھیتوش کب گیا...... کہاں گیا؟''

سرجو غصّے سے دہاڑی...... ''او آسے نا۔ کی لکھ نۓ آبے۔''

سنگی بت بن گئی تھی۔

سرجو زاروقطار رو رہی تھی۔ ''میم سائب...... جار سامی نیئی، سے ویشیا۔ جن کے بچّی نہیں ہوتے کیا وہ رنڈیاں ہوتی ہیں میم سائب...... دو بات کرنے کا مطلب کیا شریر سے کپڑا الگ کرنا ہوتا ہے۔ امی تو او کے مہاپرش سبھے بی چھلاح...... میم سائب ہم تو کھوش ہوتے تھے بابو کتنا پڑھا لکھا آدمی ہے......لیکن سب کتے ہیں میم سائب...... سب کو گوشت کی بوٹیاں چاہئیں۔ ماش رنگڑو اور دیر لکھے چھڑے پھیلو۔

آسول چہرہ بھیڑیے اسے۔''

اس نے سر جو کو روکا نہیں۔

سر جو کو جانا تھا، سر جو چلی گئی۔ سنگی پہلے پھوٹ پھوٹ کر نہیں روئی تھی۔ اس نے محسوس کیا تھا، بچے تو وہ اور پیدا کر لے گی۔ ابھی تو جسدیو کو خوش رکھنے کی ضرورت ہے، مگر بے وقت آئی آندھی نے اس کے وجود کے قلعے کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔

ایک ہفتہ کے اندر سب کچھ معلوم پر آ گیا۔ لیکن اندر کے بکھراؤ کو روکتے روکتے سنگی اپنے چہرے کی سپیدی کو چھپا نہ سکی۔ اس دن کام پر جاتے ہوئے اس نے خود ہی جسدیو کے کپڑے نکالے، ناشتہ تیار کیا، جوتا آگے رکھا، کپڑوں کے بٹن لگائے۔ جسدیو حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا..... ہاتھ میں بریف کیس تھماتے ہوئے سنگی نے اپنی دونوں وحشت زدہ آنکھیں اس کی آنکھوں میں اتار دیں۔

''سنو جسدیو۔''

اس کے لہجے میں کپکپاہٹ تھی۔ کچھ پوچھنا چاہتی ہوں تم سے.....

''جیسے وقت کی سوئی ٹھہر گئی۔ جسدیو کے چہرے پر برف جیسا کچھ جم سا گیا.....

''اوہو..... ڈرو مت جسدیو.....''

اس نے ٹھنڈی سانس بھری اور اندرونی چنگاریوں کو ایک ایک کر کے نکالنا شروع کیا۔ ''میں پاگل ہو رہی ہوں جسدیو..... جو پوچھتی ہوں اس کا خیال مت کرنا۔ صحیح صحیح جواب دینا..... دیکھو میری خاطر کچھ چھپانا نہیں۔ تم مردوں سے وشواس اٹھتا جا رہا ہے میرا..... پھر بھی یقین دلاتی ہوں میں..... برا نہیں مانوں گی..... عام زندگی میں تم کتنی عورتوں سے ملے ہو۔ ان سے تمہارے رشتے کس حد تک رہے ہیں۔ تم بس میں سفر کرتے ہو نا۔ بس میں لڑکیاں تم سے ٹکراتی ہوں گی۔ تم بھی ٹکراتے ہو گے۔ ان کے انگ چھوتے ہوں گے۔ کبھی میرے سوا کسی اور کی مانگ

نے جنم لیا ہے تمہارے اندر؟..... جسدیو یقین کرو، میں ہرگز ہرگز برا نہیں مانوں گی..... کبھی کسی کو دیکھ کر سوئی ہوئی بھوک لہرائی ہو۔ رات دن لڑکیوں سے سامنا ہوتا رہتا ہے تمہارا۔

اس پر ہذیان طاری تھا۔

''بولو جسدیو سچ تو یہ ہے کہ ساری ترقی پسندی ایک طرف۔ مردوں کے لئے ہم صرف گوشت کی بوٹیاں ہیں ـــــــ مجھے بوٹیاں نہیں بننا جسدیو۔ میں مردوں میں تمیز نہیں کر پا رہی..... اصول اور آدرش کی ساری کتابیں مجھے جھوٹی لگ رہی ہیں اور ان کے لکھنے والے بھی۔''

وہ اب تک اس کا گریبان پکڑے ہانپ رہی تھی..... ''میری تسلی کرا دو جسدیو ـــــــ سچ میں برا نہیں مانوں گی جسدیو..... میں برا نہیں مانوں گی۔''

پیراڈ

(۱)

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ کمرے میں موت جیسا سناٹا پسرا تھا۔ موت جیسا نہیں۔ کمرے میں چپکے سے ایک 'موت' آ کر گزر گئی تھی۔ جیسے تیز ہوا چلتی ہے..... سائیں سائیں..... جیسے لوہا یا جھکڑ چلتے ہیں..... جیسے ریگستانوں میں ریت کی آندھی بہتی ہے..... اور اس آندھی کے پاگل کر دینے والی شور و جود میں وحشت اور دہشت کے گھنگھرو باندھ دیتے ہیں اور شروع ہو جاتا ہے تانڈو.....

ڈم..... ڈرم..... ڈم..... ڈرم..... ڈرم.....

باہر کتے بھی چپ ہیں..... رات نے اپنی پر اسرار خاموشی میں، موت کے جان لیوا احساس کو زندہ کر دیا ہے.....

وہ ہے.....

نہیں..... وہ نہیں ہے.....

نہیں وہ ہے..... ابھی یہیں تھی..... پلکوں سے قریب..... آنکھوں سے، ذرا سے فاصلے پر، اس کے پاؤں سے پاؤں ملا کر چلی..... اور اُس کے ہونٹوں پر چپ سی آ کر بیٹھ گئی____

نہیں..... وہ نہیں ہے.....

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی..... 'وہ نہیں ہے' کا احساس گرمی کی اُمس سے کہیں زیادہ بڑھ چکا تھا____ وہ ہے، اس کمرے میں ہے۔ اُس کی آنکھوں کی بے چین پتلیوں کے سامنے.....

در، دروازے، کھڑکیاں، سب خاموش.....

وہ پاؤں دابے چل رہا ہے____ پر اسرار رات کے بدن کو روندتا ہوا____ چپ

چپ اپنی لائبریری کے کمرے میں آ گیا ہے ___ اس کمرے میں برسوں سے نہیں آیا ___ کتابیں در کتابیں ..... دھول اور گرد و غبار میں ڈوبی کتابیں ___ ریک میں ، ایک قطار سے سجی ہوئی کتابیں ___ الماریوں کے کھلے پٹ سے جھانکتی کتابیں ___ جیسے سلیپ واکر ہوتے ہیں ۔نیند میں چلنے والے .....

وہ سلیپ واکر بن گیا ہے ..... چپ چپ ان کتابوں کے درمیان گھوم رہا ہے ۔ پھر ایک بڑی سی موٹی سی کتاب کھول کر بیٹھ گیا ہے ۔

گول سی انگریزوں کے زمانے کی میز ہے ۔میز پر برٹش راج کے وقت کی ایک اونچی سی سیاہ کرسی ہے ___ وہ اس کرسی پر بیٹھ گیا ہے ۔ کتاب کھل گئی ہے ..... آنکھیں وحشت زدہ سی کتاب کے صفحوں پر دوڑ رہی ہیں ..... پیراڈ ..... وقت کی سوئی چلتے چلتے ٹھہر گئی ہے ۔ حال ، ماضی بن گیا ہے ___ ماضی حال ___ وہ وقت کی گردش سے دور نکلنے کی کوشش کر رہا ہے ___

پیراڈ ___

زندگی سو رہی ہے اور اندھیرے میں پیراڈ جاگ گئے ہیں ۔ ہزاروں کی تعداد میں پیراڈ .....

اُس کی آنکھیں نشہ میں ڈوبی لگ رہی ہیں ..... ایک عجب سی بے اطمینانی اُس کے وجود پر حاوی ہے ___ کسی بڑے مفکر کی طرح وہ کتاب پر جھک گیا ہے ___ آنکھیں بند ہیں ..... ہونٹ آہستہ آہستہ بڑبڑا رہے ہیں ..... نیل ہے ..... نیل ہے ..... نیل کہیں جا ہی نہیں سکتی ..... نیل ہے ..... یہیں آس پاس ..... وہ اسے محسوس کر سکتا ہے ..... اُسے چھو سکتا ہے ..... چھو سکتا ہے .....

تم کہاں ہو

کہاں ہو نیل .....

کہاں چھپ گئی ہو .....؟

پھر جیسے معصوم ہنسی کی 'جھڑی' لگ گئی ____

____ لو آ گئی ____

کہاں تھی نیل؟

یہیں تو تھی.....

یہاں.....

ہاں، تمہاری کتابوں میں.....

کتابوں سے باہر نکلو ____ باہر نکلو نیل..... میرا ہاتھ تھامو..... چلو..... چلنے کی پریکٹس کرو..... پریکٹس کرو نیل.....

پھر وہی معصوم ہنسی..... 'میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔ چلوں گی نہیں۔ پہچانوں گی نہیں..... اٹھوں گی نہیں۔ بیٹھوں گی نہیں۔ بس تمہاری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دوں گی ____ آنکھیں نہیں..... پوری پوری خود کو ڈال دوں گی..... پتلیوں کے جھولے میں جھولہ، جھولوں گی..... جھولہ ٹوٹ گیا تو.....؟'

کمرے میں اڑتی ہوئی ایک چمگادڑ آ گئی تھی..... بلب کی مدھم روشنی..... بے رونق دیواریں..... دھول سے بھری الماریاں.....

فادر تھامسن سر پر کیپ برابر کرتے ہیں۔ سینے پر کراس کے نشان بناتے ہیں۔ پھر کہتے ہیں ____ یہ سب کیوں جاننا چاہتے ہو اسلم شیرازی ____ دُنیا ایک دھند ہے۔ جو اس دھند سے باہر نکل گیا، اسے بھول جاؤ ____

ایک لمبی سانس ____ آپ مجھے پیراڈ کے بارے میں بتا رہے تھے.....

'قدیم داستانیں ____ فادر تھامسن کے چہرے پر بل پڑ گئے ہیں ____ ہاں، کیا بتا رہا تھا ____ ہاں۔ وہاں گیا تھا میں۔ اسفنک کے جنوب میں۔ ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ ۲۰ سے ۲۵ ہزار مزدوروں پر مشتمل ____ (قہقہہ)..... بستی نہیں، مزدوروں کا قبرستان کہو۔ قبرستان.....

'سب مردے تھے......؟'

'نہیں۔ ہاں ___ مردے......ہم کون سے مردے نہیں ہیں اسلم شیرازی...... سب مردے ہیں......وہ مرے ہوؤں کے لیے کام کرتے تھے......جیسے گورکن ہوتے ہیں تمہارے ہاں۔'

'گورکن قبر تیار کرتے ہیں۔'

ایک ہی بات ہے ___

فادر ہنستے ہیں ___ گورکن زندہ رکھنے کا راز نہیں جانتے۔ قدیم ممیاں......ان ممیوں کو صدیاں دینے والے مزدور جانتے تھے کہ مرنے کے بعد بھی انسان کو زندہ کیسے رکھا جاسکتا ہے......تمہیں یقین نہیں آئے گا اسلم شیزاری مگر میں ایسے کچھ مزدوروں سے ملا ہوں۔ وہ بتاتے ہیں۔ انہوں نے رات کے وقت ایسے کئی ممیوں کی کھلی آنکھیں دیکھی ہیں۔ ان سے گفتگو کی ہے۔ نا قابل یقین مگر سچ ___

فادر ایک بار پھر کراس چومتے ہیں ___

'نیل' بن رهی هے

نہیں پیارے قارئین، یہ کہانی وہاں سے شروع نہیں ہوسکتی، جہاں سے آپ چاہتے ہیں ___ اس کہانی کے لیے ۵۷۔۵۸ برسوں کا ایک **ملک** ہے، جہاں مسلسل ایمانداری اور وفاداری کی دہائیاں دینے کے بعد بھی اسلم شیرازی گھٹتا ہی رہتا ہے ___ گھٹتے گھٹتے ضدی اور چڑچڑا ہوگیا ہے۔ غصور اور بد دماغ بھی ___ وہ اپنا تمام تر غصہ، اپنی بیوی فاطمہ پر نکالتا ہے ___

'جہنم میں جائیں مسلمان......'

کیوں؟

'کیونکہ وہ جہنم میں جانے کے لیے ہی بنے ہیں۔'

ایسا کیا کر دیا مسلمانوں نے؟

'کیا کر دیا ___؟ اسلم شیزاری غصے سے چیخ مارتا ہے۔ 'کیا نہیں کر دیا۔ پاکستان سے افغان تک...... بابری مسجد سے لے کر......'

وہ ایک لمحے کو رکتا ہے ___ ہم چپ کیوں نہیں رہ سکتے۔ اقلیت میں ہیں اس لیے......

فاطمہ اس جملے کو دہراتی ہے ___ جو اقلیت میں ہیں، انہیں چپ رہنا چاہئے۔

کیوں؟ مر جانا چاہیے ___'

'نہیں مر جانا نہیں۔ بس چپ رہنا چاہیے۔'

تب نیل نہیں بنی تھی۔ نیل نہیں آئی تھی۔ نیل کا جنم نہیں ہوا تھا ___ اسلم شیرازی عمر کی چالیس پائدان پر کھڑا، آزادی کے بعد ہونے والے واقعات کے دھویں میں پلا بڑھا صرف اور صرف غصہ کرنے کے لیے پیدا ہوا تھا۔ ایک بے حد حساس اور جذباتی آدمی ___

فادر اسمتھ پڑوس میں ہیں۔ کبھی کیتھولک چرچ میں ہوا کرتے تھے۔ اب نہیں۔ چرچ کی آپسی سیاست سے گھبرا کر استعفیٰ دے کر چلے آئے۔ آنکھوں پر خوبصورت سا گولڈن فریم کا چشمہ ___ بڑی سی داڑھی ___ گیہواں رنگ ___ وہ اسلم شیرازی کے غصے پر بار بار ہنس دیتے ہیں ___

'اقلیتوں نے اس ملک پر بہت ظلم ڈھائے ہیں۔ ناراض کیوں ہوتے ہو ___'

'میں نے تو نہیں ڈھائے ___'

تم نے تم نے ہی نام بدل کر ڈھائے ہیں۔ میں نے بھی ___ 'فادر تھامسن زور زور سے ہنستے ہیں ___ غلطی یہ ہے کہ یہ اتہاس نہیں بھول سکتے۔ اس لیے اتہاس بدل دینا چاہتے ہیں۔ دیکھو اسلم شیرازی۔ ہم دونوں اسی لیے دوست ہیں کہ ہم دونوں اقلیت میں ہیں ___'

'اقلیت میں ہونا جرم ہے!'

'ہاں۔ جرم ہے ___ سچی بات تو یہ ہے کہ اس ملک میں اقلیت میں ہونا سب سے بڑا جرم ہے ___ اُنہیں اکثریت میں ہونے کے فائدے نہیں ملیں گے تو وہ یہ جرم کریں گے۔ بار بار کریں گے ___ کیونکہ بیچارے ایک سرکار تک اپنی نہیں بنا سکتے ___ بناتے بھی ہیں تو کئی وچار دھاراؤں کا سہیوگ مانگنا پڑتا ہے ___ ''

اسلم شیرازی کو ڈر لگتا ہے۔ وہ مکمل طور پر آ گئے تو.....؟'

'اتنا کیوں سوچتے ہو۔ تب کیا ہوگا ___ ہمارا جینا مشکل ہو جائے گا۔ مگر.....' فادر ہنستے ہیں۔ اس وقت ہم نہیں ہوں گے۔ ہمارے بچے ہوں گے۔ فکر کیوں کرتے ہو ___ بچے سمجھیں گے ___'

'بچے آتو جائیں پہلے.....' اسلم شیرازی نے سر جھکا لیا۔ 'فاطمہ کہتی ہے کہ.....'

ہو..... ہو ءءء فادر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا ___ تمہیں لڑکی ہوگی ___ دیکھ لینا۔ ایک اقلیت لڑکی ___ تمہاری، اقلیتوں کی آبادی میں ایک لڑکی کا اضافہ ___

تب نیل نہیں بنی تھی.....

●●

ممکن ہے، بہت ساری باتوں کا اس کہانی کے ساتھ کوئی لینا دینا نہ ہو، مگر اسلم شیرازی ___ ہوش سنبھالنے سے اب تک، یعنی فاطمہ کے زندگی میں آنے اور نیل کے بننے تک، دن اور تاریخ کے حساب سے چھوٹی سے چھوٹی بات کا گواہ رہا ہے۔ مثلاً اُس کے گھر والے بتاتے تھے کہ جب وہ پیدا ہوا، شہر میں کرفیو لگا ہوا تھا ___ جس دن اُس کا عقیقہ ہوا، اس دن گھر پر مشکل سے چند لوگ آئے تھے۔ کسی کو بھی اس موقع پر نہ آنے کے لیے کوئی سا بھی بہانہ بنانے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس لیے کہ شہر کی فضا اچھی نہیں تھی۔ اور کئی علاقوں سے توڑ پھوڑ کی خبریں بھی موصول ہوتی رہی تھیں۔ جس دن گھر کے پاس والے مدرسہ میں اُس کا نام لکھایا جانا طے ہوا

تھا، اس دن نام اس لیے نہیں لکھا جا سکا کہ محلے کی مسجد کے پاس کسی نے سور کے گوشت کی ہڈی ڈال دی تھی ___ یہاں جان بوجھ کر صرف وہی معاملے درج کیے جا رہے ہیں، جو اسلم شیرازی کے ساتھ گزرے ___ جب کہ انگلیوں پر گنے جانے والے وہ دن اور تاریخ بھی یاد ہیں کہ بدیع ماموں کے نکاح کے دن کیا ہوا۔ ریشمہ آپی کی شادی کے روز کہاں بم چھوٹا ___ یوسف بھائی نے جس دن پہلی بار اپنی دکان کھولی، اس دن محلے میں ہوئے ہنگامے میں کافی دکانیں لوٹ لی گئیں اور.....

بچپن سے آنکھ مچولی کے اس کھیل میں بڑے ہونے تک، آسمان میں پھیلتے منڈراتے دھویں رہ گئے تھے، جس کو سہما سہما سا دیکھتا ہوا اسلم شیرازی اپنی تقدیر کا ماتم کرنے پر مجبور تھا۔

تب نیل نہیں آئی تھی ___

ہاں، چپکے سے، کھلے روشندان سے آتی روشنی کی طرح، فاطمہ نے اس کی زندگی میں دستک دی تھی ___

'اب اتنا اندھیرا بھی نہیں ہے، جتنا تم سوچتے ہو.....'

'پتہ نہیں.....'

'سب کچھ معمول کے مطابق چل رہا ہے۔ کیا یہ غنیمت نہیں کہ ہم ہنس سکتے ہیں۔ پڑھ سکتے ہیں..... خوش ہو سکتے ہیں ___ اور..... پیار کر سکتے ہیں ___'

'پیار..... ایک ڈراؤنے ماحول میں.....'

'ڈراؤنے ماحول میں.....؟'، فاطمہ نے چونک کر اسکی طرف دیکھا ___ کہاں ہے، ڈراؤنا ماحول ___؟ چلو مجھے دکھاؤ..... اس کی کانپتی انگلیاں، اس کی ہتھیلیوں پر ناچ رہی تھیں۔ 'پاگل پن ہے تمہارا ___ سب جگہ ایسا ہی ہے۔ پڑوسی ملکوں کی بات چھوڑو، یوروپ میں دیکھ لو۔ وہاں کیا ہو رہا ہے.....

'لیکن جہاں کہیں بھی ہو رہا ہے، ہونے والی ہر دہشت گردی مسلمانوں سے جوڑ

دی جاتی ہے.....'

'جوڑا اس لیے دی جاتی ہے..... کہ تم کر رہے ہو۔ میرا مطلب ہے.....' فاطمہ نے اس کے ہاتھوں کو مضبوطی سے تھام لیا____ 'مسلمان ایسا کیوں کر رہے ہیں آخر۔ کشمیر میں یا باہری ملکوں میں____ جان لینے والوں کو قاتل یا ہتھیارا کہنے کی مہم کیوں شروع نہیں ہوتی۔ ایسے لوگوں کو پکڑوا و رشوٹ کر دو____ مسلمان کریں گے تو مسلمان ہی بدنام ہوں گے، نا.....'

فاطمہ کی آنکھوں کا رنگ یکا یک بدلا تھا..... 'زندگی میں جنگ اور خوف سے الگ بھی ایک راستہ ہوتا ہے۔ اس راستہ کو سمجھو۔ ہمیں اسی راستے پر چلنا ہے..... دور تک..... ایک ساتھ.....'

اُس نے سر جھکا لیا۔ ہونٹ لرز رہے تھے..... پتہ نہیں کیوں۔ ہاں، پتہ نہیں کیوں، بار بار ڈر جاتا ہوں۔ اب تو جیسے ڈر جانے کی عادت پڑ جانی چاہئے تھی۔ ذرا سا آسمان صاف ہوتا ہے، دل میں جمی گرو کے ہٹنے کا خیال آتا ہے کہ پھر وہی دھند۔ اس دھند میں کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ پھر سے وہی خوف کے خیمے.....'

'اس خوف سے باہر کیوں نہیں نکلتے.....'

کیسے نکلوں..... نکلنا چاہتا ہوں مگر..... 'مجھے یقین ہے' اُس کی آواز پھنسی پھنسی اور ڈری ڈری تھی.....

'نہیں تمہیں نکلنا ہوگا۔ آہ تم اس بات کو بھی بھول گئے کہ..... فاطمہ نے آگے بڑھ کر اس کا کانپتا ہوا ہاتھ اپنے پھولے ہوئے پیٹ پر رکھا..... یہاں دیکھو..... میرے لیے نہیں تو کم از کم..... ایک خوش رنگ تتلی تمہارے آنگن میں کھیلنے کے لیے آنے والی ہے۔ سمجھ رہے ہو نا.....'

'ایک خوش رنگ تتلی'..... اسلم شیرازی نے جبراً مسکرانے کی کوشش کی۔ فاطمہ کو پلٹ کر دیکھا۔ وہ جیسے اعتقاد بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ماں بننے

کا ایک مقدس احساس اس کے چہرے سے عیاں تھا۔ اسلم شیرازی کو لگا، وہ پہلے سے کچھ زیادہ مضبوط ہوگئی ہے اور اس مضبوطی میں پیٹ میں تیر نے والے، ہولے ہولے چلنے والے اس نئے انسان کا بھی ہاتھ ہو...... جسے وہ محض 'خوف' کی شکلوں میں دیکھ رہا تھا۔ آہ اپنے ہی بچے کے لیے یہ احساس کتنا ڈراؤنا تھا...... بال...... خوف جیسے...... ایک دوسرے میں گتھے، الجھے ہوئے...... جیسے پتلے دبلے رینگتے ہوئے سانپ ہوتے ہیں۔ آنکھیں خوف زدہ...... ہاتھ ٹیڑھے میڑھے...... جسے خوف اور وحشت نے مل کر ایک 'لنج پنج' سی شکل دے ڈالی ہو...... اور جسم...... تھرتھراتا، ہلتا ہوا سا___ جیسے پارکنسٹر ڈیزیز کے مارے ہوئے، عمر دراز لوگ ہوتے ہیں۔ ہلتے ہوئے___ مسلسل ہلتے ہوئے...... دماغ سے کمزور...... دونوں پاؤں پاس پاس دابے، چلنے کی آزمائش سے گزرتے ہوئے...... ہونٹ، آنکھیں، چہرہ...... جسم...... جیسے اندر مسلسل ہلتے ہوئے، خوف نے اس نئے انسان کو خوف کی علامت بنا کر اس دنیا میں بھیج دیا ہو......

جیسے کوئی ڈراؤنا سپنا ہوتا ہے...... نیل کے دنیا میں قدم رکھنے تک بار بار اسلم شیرازی اس سپنے سے زخمی ہوتا رہا......

نہیں، ایسا نہیں ہونا چاہیے......

'مائی ڈیر...... ایسا ہوتا ہے...... ہوتا ہے......' فادر تھامسن اُس کے ساتھ صبح کی چائے پی رہے تھے۔ دھوپ چاروں طرف کھلی کھلی لگ رہی تھی۔ کبوتروں کے جھنڈ آسمان پر تیرتے ہوئے ایک طرف سے دوسری جانب پرواز کر رہے تھے۔ اُسے احساس ہوا۔ فادر کی آنکھیں اس کی آنکھوں میں اتر آئی ہیں......

'پیرا لڈ۔ تم نے پھر کوئی بھیانک سپنا دیکھا کیا......؟'

'آہ، نہیں فادر......' اُس کے لہجے میں تھرتھراہٹ تھی...... آپ تو سب کچھ پڑھ لیتے ہیں......'

'ایک اقلیت کا آدمی، اپنے ہی جیسے آدمی کا درد سمجھتا ہے ـــ فادر مسکرائے ـــ پیرامڈ میں نیا کچھ بھی نہیں مائی ڈیر۔ بس، کچھ لوگ مرنے کے بعد بھی یہ قبول کرنے کو تیار نہیں ہوتے کہ وہ مر چکے ہیں۔ اس لیے وہ اپنی زندگی میں ہی مرنے کے بعد کے جشن کی تیاری کر چکے ہوتے ہیں۔ قیمتی سامان۔ آنکھیں کھلنے کے بعد پتہ نہیں کس چیز کی ضرورت محسوس ہو۔ کچھ لوگ تو اپنے نوکر، کنیزوں کو بھی مرنے کے بعد آس پاس سلائے جانے کی وصیت کر جاتے تھے تاکہ آنکھیں کھلتے ہی وہ اپنے نوکروں کو آواز دے کر جگا سکیں......

'تو کیا کبھی کسی کی آنکھیں کھلیں؟ میرا مطلب ہے......'

'ارے نہیں......' فادر تھامسن ہنسے۔ 'مرنے کے بعد کوئی زندہ ہوتا ہے کیا؟ ہنستے ہنستے وہ چپ ہوتے ہیں ـــ تم اسے تہذیب کی اس نہ ختم ہونے والی کہانی سے جوڑ سکتے ہو، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ایک دن سب کچھ فنا ہو جانا ہے۔ سمجھ رہے ہو نا۔ پتھروں پر لکھی تحریریں انہیں ہم تک پہنچاتی ہیں ـــ اڑتی ہوئی ریت، تیز چلتی ہوئی ہوا، آسمان پر روشن سورج ہر بار ان مٹ گئی تہذیبوں کے لیے ہمارے اندر ایک نہ ختم ہونے والا تجسس پیدا کرتا ہے...... یہ موت اور موت کے بعد بھی زندگی کو بچائے رکھنے کا وہ 'اسرار' ہے، جسے انسان کھونا نہیں چاہتا۔ اونچی سے اونچی عمارتیں بنانے والا اور دنیا میں حکومت کے خواب دیکھنے والا بھی یہ جانتا ہے کہ ایک دن...... ایک دن وہ مر جائے گا۔ مگر آہ ـــ وہ مرنے کے بعد پھر زندہ رہنا چاہتا ہے......' فادر تھامسن مسکرائے...... 'جیسے تمہارے اندر کا خوف۔ تم نے برسوں سے کسی فرعون یا شہنشاہ کی طرح اپنے اندر کے خوف کو، اپنے دل کی ممی میں سلا دیا ہے۔ مگر آہ...... یہاں الٹا ہے مائی فرینڈ...... وہ خوف جاگ گیا ہے اور دیکھو تو سہی، جیسے جیسے تمہارے یہاں ولادت کا دن قریب آتا جا رہا ہے، وہ خوف مسلسل تمہارے چہرے سے عیاں ہو رہا ہے۔ مگر کیوں مائی ڈیر فرینڈ ـــ

حقیقت یہ ہے کہ اسلم شیرازی اس راز سے خود بھی واقف نہیں تھا۔ اپنے خوف کو وہ الگ الگ شکلوں میں دیکھتا اور محسوس کرتا تھا۔ مثلاً جس بستر پر وہ سو رہا ہے، اس کے ٹھیک اُوپر گرمی کے موسم میں اپنی پتلیوں کے ساتھ ناچتا ہوا پنکھا ___ اُس پر گر سکتا ہے گھر سے باہر نکلتے ہی گھر کا کوئی بھی فرد انجانے حادثے کا شکار ہو سکتا ہے..... اگر ٹرین سے کہیں باہر کا سفر ہے تو ممکن ہے آگے ریل کی پٹریاں ٹوٹی ہوئی ہوں اور چیختی چنگھارتی ٹرین کسی حادثے کا شکار ہو سکتی ہو ___ اسلم شیرازی گھر سے باہر ہوتا تو فاطمہ میں دل الجھا ہوا ہوتا۔ پتہ نہیں گیس کھلا نہ چھوڑ دیا ہو ___ ٹائلس کی زمین کتنی چکنی ہوتی ہے، کہیں پاؤں نہ پھسل گیا ہو..... پھر فادر تھامسن کی آواز اُس پر حاوی ہو جاتی..... تم نے اپنے دل کے نہاں خانے میں ایک پیراڈ بنالیا ہے۔ اس میں تمہارا خوف سو رہا ہے مگر افسوس ___ اس خوف کی آنکھیں بار بار کھل جاتی ہیں.....

کبھی کبھی زور زور سے چلانے کی خواہش ہوتی..... مجھے اس پیراڈ سے مکتی دے دو۔ میں اس خوف سے آزاد ہونا چاہتا ہوں۔

'مگر کیسے.....؟'

'اگر میں سوچ لوں کہ آسمان پر چمکتا ہوا سورج پہلے سے کہیں زیادہ چمکیلا ہو گیا ہے.....'

تم نہیں سوچ سکتے.....

''اگر میں سوچ لوں کہ..... آسمان پر چمکتی تاروں کی بارات، میری اپنی زندگی میں اُتر آئی ہے.....

وہم ہے تمہارا.....

اگر میں سوچ لوں کہ..... آہ، تم کچھ بھی نہیں سوچ سکتے۔ اس لیے کہ تم صرف اور

صرف خوف کے سائے میں جیتے رہے ہو..... شاید آزادی کے ان ۵۸ برسوں میں صرف اور صرف ایک اقلیت ہونے کا احساس تمہارے اندر رہ گیا تھا، جو ہر قدم پر تم کو ڈرانے، دھمکانے کے لیے تیار رہتا تھا۔ نہیں، اس طرف مت جاؤ۔ خطرہ ہے۔ وہ تمہارے کلیگ نہیں ہیں، دوسرے مذہب کے ہیں۔ ترشول دھاری ____ مذہب کی اپنی راہیں اپنے قانون ہوتے ہیں ____ اُن کے قانون تمہارے قانون، سے اور ان کی راہیں تمہارے راستہ سے مختلف ہیں۔ اسلم شیرازی نہیں جانتا تھا کہ ایسا صرف وہی سوچ رہا ہے یا ایسا وہ دوسرے بھی سوچ رہے تھے جو اُس کی طرح ایک اقلیت گھرانے میں پیدا ہوتے ہیں۔ شاید اسی لیے آتش بازی یا پٹاخہ کی آوازیں اس کے اندر خوف ہی خوف بھرنے کا کام کیا کرتی تھیں ____

تو یہ اُنہی دنوں کا قصہ ہے جب پیراڈائز بار بار اسلم شیرازی کے خوابوں میں آ رہا تھا اور بقول فاطمہ، نیل بن رہی تھی ____ اور یہ اُسی لہولہو شام کا واقعہ ہے جب شہر سے پانچ کیلومیٹر دور پانچ پیر کی مزار کے پاس ایک مردے کی آخری رسومات کو لے کر دو فرقے کے لوگ آپس میں لڑ گئے تھے۔ اُس دن وہ دفتر میں تھا۔ شام کے پانچ بجے تک جب یہ خبر اس تک پہنچی تو اس نے پہلا کام یہ کیا، بغیر کسی کو بتائے دفتر چھوڑ دیا ____ باہر آیا، تو سنہرے آسمان کا رنگ مختلف نظر آیا ____

شاید ایک فاختہ تھی، جو اس کے باہر آتے ہی آسمان پر دور تک اڑتی چلی گئی تھی۔ نہیں وہ گدھ تھا۔ اور یقیناً یہ اس کی نظروں کا دھوکہ نہیں تھا۔ اسلم شیرازی نے گدھ کی تیز آنکھوں میں ایسی چمک محسوس کر لی تھی، جو کسی مردے کو دیکھ کر پیدا ہوتی ہیں ____ شہر کی دکانوں پر شٹر گر رہے تھے۔ لوگ جلد بازی میں نظر آ رہے تھے.....

یہ وہی لمحہ تھا، جب حواس باختہ، گھر کے اندر داخل ہونے پر اُس کی تیز تیز چلتی ہوئی سانسوں اور چہرے کے اڑے ہوئے رنگ کی پرواہ کیے بغیر فاطمہ نے دو ٹوک انداز میں آج کے دن کے سب سے بڑے واقعہ کی روداد سنائی ____

'اپنا ڈرا سہما چہرہ واش بیسن کے حوالے کر دو اور ہاں سنو۔ میری طبیعت خراب لگ رہی ہے۔ ممکن ہے..... ممکن ہے.....، اس نے سنبھل کر اس کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی.....

''ممکن ہے، نیل کے آنے کا وقت ہو گیا ہو.....''

'اوہ یقیناً'

واش بیسن پر اپنا چہرہ دھوتے ہوئے وہ پُر امید تھا۔ یقیناً، نیل نے اپنے لیے ایک ایسے موسم کا انتخاب کیا ہے، جیسا کہ اس نے سوچا تھا۔ ایک جلتی ہوئی شام۔ آسمان پر منڈراتا گدھ ____ اور شہر کی خطرناک فضا۔

آدھی رات ہوتے ہوتے شہر کے مختلف علاقوں سے لوٹ پاٹ کی خبریں موصول ہو چکی تھیں۔ اور یہی وہ وقت تھا جب نیل نے اُس کی دنیا میں آنے کے لیے اپنے ننھے منّے ہاتھ پاؤں نکالے تھے۔ مگر کہاں۔ نیل کہاں تھی.....؟

اس سے پہلے کہ وہ چیخنے کی کوشش کرتا، ڈاکٹر نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی.....

'نہیں۔ آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے..... وہ ہے ____ مگر بننے کے عمل میں ہے..... اور..... کیا کیجئے گا۔ کچھ بچے..... ہوتے ہی ایسے ہیں..... دل چھوٹا مت کیجئے۔ ابھی بچے کو نگرانی کیسخت ضرورت ہے۔

نیل کے بننے کے بعد

آرمینیا آرٹ سینٹر بلڈنگ کے دوسرے مالے پر اس کا کمرہ تھا۔ ان جی اوز کی طرف سے چلائی جانے والی اس ایغر وایشیائی تنظیم کا مقصد تھا، 'ہم اپنی قدیم تہذیب کو بچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ شروع کے بے روزگاری کے دنوں میں جب فاطمہ زندگی میں نہیں آئی تھی، تبھی سے وہ اس تنظیم میں شامل ہو گیا تھا۔ اس وقت کم پیسے ملتے تھے۔ دفتر بھی کسی چھوٹی جگہ کے ایک کمرے میں تھا۔ بہت ممکن ہے، اس وقت تک تہذیب کو بچانے کی مہم نے زور نہیں پکڑا ہو۔ پھر جیسے جیسے ان جی اوز پر گاڈ

کی مہربانی ہونے لگی، پیسے برسنے لگے۔ کام بڑھ گئے۔ آرمینیا آرٹ سینٹر بلڈنگ کرائے پر لے لی گئی۔ 'سیو اور سی لائزیزیشن' سے متعلق معلومات حاصل کرنے کا کام اس کے ذمہ تھا۔ انٹرنیٹ، پبلک سروس، ایفرو ایشیائی سروے کے بعد اُس کے ساتھ جڑے ہوئے لوگ اپنی اپنی رپورٹ تیار کرتے تھے۔ ان جی اوز کی طرف سے پابندی سے، ہر ماہ ایک میگزین بھی شایع ہوتی تھی۔ اس کا اسٹاف الگ سے تھا۔ یہاں سے بہت چھوٹی چھوٹی معلوماتیں جمع کرکے اس کی رپورٹ ہیڈکوارٹر بھجوائی جاتی تھیں۔ مثلاً اجودھیا کی مٹی میں پراچین سبھیتا تلاش کرنے کا مسئلہ ہو۔ ایک ایسی مٹی جو زمانہ قدیم میں راجہ دشرتھ کے وقت کی مٹی سے میل کھا سکتی ہو۔ سینکڑوں فٹ نیچے کی زمین سے، آثار قدیمہ کے طور پر کچھ بھی پالینے کا تجسس، تہذیبوں پر ریسرچ کرنے والوں کی آنکھوں میں ایک انوکھی چمک بھر دیتا تھا ___ حقیقت یہ ہے کہ اس نے ایسی چمک کے پیچھے ہر بار اپنے لیے نفرت کے رنگوں کو ہی محسوس کیا تھا۔ جیسے وہ لکھیا سنگھ کا بچہ......

یقینی طور پر کہہ سکتا ہوں کہ آپ لکھیا سنگھ کو نہیں جانتے۔ اُسے جاننا ایسا کوئی ضروری بھی نہیں ہے۔ مگر لکھیا سنگھ ان لوگوں میں سے ایک ہے، جو ہر بار اسلم شیرازی جیسے لوگوں کے راستہ میں اپنی زہریلی باتوں کا دھواں بچھا دیتے ہیں۔ جیسے اس دن......لکھیا سنگھ کا لہجہ سخت ہو گیا تھا۔

'مان لو۔ کھدائی سے ایسا کچھ برامد ہو جاتا ہے میاں، جو تمہارے لیے تصدیق دے، کہ وہاں ہم ہی ہم تھے تو پھر ___ بوریا اٹھاؤ گے۔ پاکستان جاؤ گے......'

'کیوں؟'

'نا ___ تمہیں تو نہ چٹ منظور نہ پٹ......'

اُسے احساس تھا، لکھیا جیسے لوگوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ لیکن اس 'تہذیب بچاؤ' جیسی مہم میں بھی، ایسے لوگوں کی شمولیت بڑھتی جائے گی، اُسے اس کا اندازہ نہیں

تھا۔ آرمینیا آرٹ سینٹر کے اس کشادہ ایر کنڈیشن کمرے میں اسلم شیرازی پر جو ذمہ داریاں ڈالی گئی تھیں وہ عام طور پر پراچین گرنتھوں، سنسکرتی یا کسی ایسے سروے سے متعلق ہوتیں، جہاں پراچین بھارت کو لے کر کسی نئی معلومات کو دوسروں تک پہنچانا ہوتا تھا۔ عام طور پر کسی نئی رپورٹ کو بناتے ہوئے لکھیا سنگھ ایسے طنز بھرے جملے اُس کی طرف ضرور اچھالتے ___ دیکھا۔ تمہارا اسلام یہاں بھی نہیں ہے، ارے تمہاری پونچھ عرب میں تھی تو یہاں کیسے نظر آئے گی.....'

لکھیا سنگھ سنجیدہ ہو جاتا ___ تمہاری جڑ، تمہاری تہذیبیں یہاں نہیں ملیں گی شیرازی۔ مغلوں کی یادگار بھی کھود ڈالو تو ہماری ہی ہڈیاں اور نشانیاں ملیں گی۔ کیوں؟ ہماری مردہ ہڈیوں پر بھی تم عمارتیں بنانے سے نہیں چوکے.....

واپس اپنی میز تک لوٹنے تک لکھیا سنگھ کے زوردار قہقہے اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے تھے ___

آتے جاتے وہ ہر بار اپنی زہریلی گفتگو کا ایک تیر چھوڑ ہی دیتا تھا ___ 'یار شیرازی کیوں پنگا لے رہے ہو ہم سے..... تم لوگ مل کر مندر کیوں نہیں بنوا دیتے.....'

'ڈرتے ڈرتے اس نے اپنی زبان کھولی تھی..... پھر تم اور جگہ بھی اپنا حق مانگو گے.....'

'تو؟' لکھیا کے چہرے کا رنگ تبدیل ہوا تھا ___ پھر یکایک وہ قہقہہ لگا کر ہنسا..... ہم اور مانگیں گے تم اور بنوا دینا۔ ہم مانگتے جائیں گے تم بنواتے جانا ___ وہ ایک بار پھر خونخوار چہرے کے ساتھ سامنے ہوتا ___ 'تم کیا سوچتے ہو۔ تم سالے تو باہر سے آئے تھے۔ اور ہم تھے سیدھے سادے لوگ۔ پانی اور پوتر تا کا رشتہ ہی جانتے تھے۔ شدھ بھوجن، شاکاہاری بھوجن، پہننے کو سادا لباس۔ اور اس سے زیادہ کیا تھا ہمارے پاس ___ نہ لڑنا جانتے تھے نہ تمہاری طرح مکاری اور

عیاری جانتے تھے ۔ یہ سب تو تم نے سکھایا ۔ بار بار حملہ کر کے ہمارے مندروں کو لوٹا ۔ ہمیں کمزور بنایا ــــــ اب آہستہ آہستہ سیاست ہم نے بھی سیکھ لی تو ــــــ ہم وہی کریں گے جو تم نے کیا تھا ۔ اہنسا پرمو دھرما یا گاندھی جی کے سدھانتوں کا یگ نہیں ہے ۔ یہ یگ ہے بدلا لینے کا ۔ دھرم کو سر اٹھا کر جینے کا حق دینا ہے ، تو دھرم کو راجنیتی سے جوڑنا ہوگا .....

سچ یہ ہے کہ اسلم شیرازی ہر بار ڈر جاتا تھا ــــــ ہر بار لکھیا کی آواز اسے خوف میں مبتلا کر دیتی تھی ۔ ایک تو پردیس کا معاملہ پھر یہی پردیس جب اپنا دیس بن گیا تو بجائے گھٹنے یا کم ہونے کے اس کے اندر کے خوف میں بھی مزید اضافہ ہوتا رہا ۔ کیونکہ پہلے فاطمہ نہیں آئی تھی ۔ پہلے زندگی کا کوئی سا بھی خوشگوار احساس اس کے شامل نہیں تھا ۔ شاید ایک زندگی میں دوسرے کو شامل کیے جانے کے احساس کے بعد ہی لڑکیاں کچھ زیادہ ہی تعداد میں خوف کے جالے بننے کا کام کیا کرتی ہیں ۔ مثلاً اس کی کسی بھی بات سے فاطمہ پر کوئی اثر نہ ہو ۔ اس کے کسی ری ایکشن سے فاطمہ کی زندگی متاثر نہ ہو ۔ اور جو کچھ اس کے پرکھوں ، پروجوں نے کیا تھا ، اس کا صلہ ایک نہ ایک دن تو ملنا ہی تھا ۔ صدیوں کی حکومت ، تاناشاہی اور غرور میں ڈوبے ہوئے دن ۔ مندروں کو توڑنا ، ہندوؤں پر جزیے لگانا ، یعنی اتہاس آپ سے پیچھا کہاں چھڑاتا ہے ۔ آپ جتنا اتہاس یا تواریخ سے ہاتھ جھٹکنا چاہتے ہیں ، تاریخ کے میلے ، خون میں ڈوبے ہاتھ آپ کو اتنا ہی جکڑ لیتے ہیں ــــــ بھاگومت ۔ یہ سب تمہارا کیا دھرا ہے ــــــ اور پھر غلامی کے اندھیرے دن ، جس پر مسلم حکمرانوں کی کمزوریوں اور عیاشیوں کی مہر لگی ہوئی تھی ۔ ذرا آگے بڑھیے تو وبھاجن یا تقسیم کی دردناک کہانی جیسے چیخ چیخ کر اشارہ کرتی ہے کہ دیکھ یہی مسلمان ہیں ، جو بٹوارے کا سبب بنے ــــــ آنکھیں کھنے کے بعد سے ہی اسلم شیرازی ملک میں ہونے والے دنگے فساد کے

پیچھے، مسلمانوں کے خوفناک اور خونی اتہاس کی کہانیوں سے گزرتا رہا۔ پھر تو جیسے عادت سی پڑ گئی۔ زندگی کے راستے میں جو بھی ملے، زیادہ تر لکھیا سنگھ جیسے لوگ ہی تھے۔ کچھ لوگ یا تو صاف اور بے باک ہوتے تھے۔ اور کچھ پیٹھ پیچھے اتہاس کی کتابوں پر حامی بھرنے والے ___ کل ملا کر اُس کی سمجھ سے زیادہ تر لوگوں کا یقین یہی تھا، کہ اس ملک میں ہر غلط، ناجائز، توڑ پھوڑ اور دہشت گردی کے پیچھے صرف اور صرف مسلمانوں کا ہی قصور رہا ہے۔

نیل کی پیدائش کے دوسرے دن دفتر میں مٹھائیاں بانٹتے ہوئے اچانک ہی لکھیا سنگھ نے اس کے راستہ کو روک دیا تھا ___ کس خوشی میں میاں جی ___ پانچ پیر کی مزار پر دس ہندوؤں کو ٹھوک دیا تم لوگوں نے اس خوشی میں..... یا پھر اپنی جیت کی خوشی میں۔ کہ پولس نے بھی تم لوگوں کا ساتھ دیا ___'

''مجھے..... مجھیکی بچی ہوئی ہے.....'

'کیا ___' لکھیا سنگھ بولا۔ ایک دم سے ٹھہر گیا ___ اس کے اندر کا کڑوا 'سینس آفر ہیومر' اس کا مذاق اڑانے کے لیے تیار تھا۔

'کھا لیتا ہوں میاں جی۔ لڑکا ہوتا تو نہیں کھاتا۔ لڑکی ہے۔ اس لیے کھا لے رہا ہوں۔ ممکن ہے، ہمارے دھرم کا کوئی لڑکا ہی لے جائے..... ہو ہو ہو،، وہ ہنس رہا تھا۔ لیکن سنو شیرازی۔ تمہاری بچی نے آنے کے لیے ٹھیک ٹائم نہیں چنا۔ ارے ہمارے دس جنے مر گئے تھے۔ نہیں مار دیئے گئے تھے۔ تمہارے لوگوں دوارا۔ یہ کوئی شبھ سمئے تھا، پیدا ہونے کے لیے.....'

دھیرے دھیرے لگنے لگا تھا، آرمینیا آرٹ سینٹر کا ہر آدمی وہی زبان بولنے لگا ہے، جو لکھیا سنگھ بولتا ہے۔ کئی بار اس کے جی میں آیا کہ باہر ان کی رپورٹ کر کے بھیج دوں۔ صاف صاف لکھ دوں کہ قدیم تہذیب کو بچانے کی صورت میں آپ ہی کے لوگ ہمارے ورتمان اور مشتر کہ تہذیبی وراثت کو ختم کرنے میں لگے ہیں۔ پہلے

اپنا ورثہ بچا لیجئے۔ قدیم تہذیب کو بچانے کی بات بعد میں سوچئے گا۔ لیکن یہ شکایتیں کس سے کرتا۔ چھ مہینے سال میں باہر سے ڈے لی گیٹ یا ہیڈ کوارٹر سے انکوائری یا دیکھنے کے لیے سی او اور دوسرے ڈائرکٹروزٹ کیا کرتے۔ وہ بھی یہ دیکھنے کے لیے کہ فنڈ کا غلط استعمال تو نہیں ہو رہا ہے ___ ان سے کچھ بھی بولنے یا کرسی کو 'اونچا' کرنے کی ہمت اس میں نہیں تھی.....

پیارے قارئین، یقین کریں، آئندہ صفحات میں زندگی اور فنتاسی کے میل سے جو کہانی آپ پڑھیں گے، شاید آپ کو اس پر بالکل یقین نہ آئے۔ لیکن یہ کہانی اسی لمحے پیدا ہوگئی تھی جب لکھیا سنگھ نے اس کا یعنی اسلم شیرازی کا مذاق اڑایا تھا۔ اپنی کرسی پر واپس لوٹنے تک جیسے ہزاروں کی تعداد میں خونی منقار والے گدھ اس کے چاروں طرف چھا چکے تھے۔ جسم میں لرزش تھی ___ پاؤں کانپ رہے تھے۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا رہا تھا۔ لکھیا سنگھ کے زہریلے لفظ اُسے ڈس رہے تھے..... 'لڑکا ہوتا تو نہیں کھاتا..... لڑکی ہے اس لیے..... تمہاری بچی نے آنے کے لیے شبھ سمئے نہیں چنا..... یہ کوئی سمئے تھا، پیدا ہونے کا.....، اور یہ سچ تھا، فاطمہ کے گھر آجانے کے بعد بھی اُس نے نیل کو پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔ یا اس کے اندر اتنی ہمت ہی نہیں تھی کہ نیل کو دیکھ پانے کی کوشش کرتا۔ کیونکہ ولادت کے وقت اسے دیکھے جانے پر ہی اس پر غشی طاری ہوگئی تھی اور جیسا کہ داستان کے شروع میں، بتایا جاچکا ہے کہ اس نے کہا تھا۔ نیل تو ہے ہی نہیں۔ اور ڈاکٹر نے کہا تھا۔ وہ ہے۔ آپ ذرا دیکھیے تو سہی، وہ بن رہی ہے ___ اور قصہ کوتاہ بات یہ تھی کہ وہ سچ مچ بن رہی تھی۔ یعنی جو گوشت پوست کا لوتھڑا نیل کی شکل میں اس کے سامنے تھا، وہ آدھا ادھورا تھا۔ عام پیدا ہونے والے بچے سے اس کا سر کہیں زیادہ چھوٹا تھا۔ منہ کا حصہ ابھی بنا ہی نہیں تھا ___ ایک لمحے کو اس کی نگاہ نیل کی طرف چلی گئی اور بڑی مشکل

سے وہ اپنی چیخ دبا پانے میں کامیاب ہوا تھا۔لیکن دوسرے ہی لمحے وہ کانپ گیا تھا۔ جو کچھ ہوا تھا، وہ ایک دم اچانک ہوا تھا۔ننھی نیل کی بند آنکھیں اس سے ٹکرائی تھیں.....اور آپ یقین کریں.....وہ آواز، یقینی طور پر.....وہ آواز بالکل صاف تھی.....اور وہ آواز یقیناً اس کے لیے تھی.....'ڈرو مت.....'

وہ ادھر اُدھر دیکھنے لگا____

''ادھر اُدھر مت دیکھو پاپا۔ یہ میں ہوں۔ابھی تم سے بہت باتیں کرنی ہیں۔مگر خدارا، پہلے یہاں سے مجھے گھر لے چلو۔اور خدا کے واسطے یہاں ابھی بہت سے لوگ کھڑے ہیں۔ایسے، حیرانی کے عالم میں چونک چونک کر اپنا مذاق مت اڑواؤ پاپا۔بس مجھے یہاں سے لے چلنے کی پہل کرو____'

وہ پسینے پسینے تھا۔

ڈاکٹر کچھ حیرانی کچھ شک سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

'کیا ہوا؟'

'نہیں کچھ نہیں.....'

'آپ کانپ رہے ہیں، آپ کا چہرہ پسینے میں ڈوب گیا ہے۔'

'نہیں، بس یونہی____'

کھڑکی کے اس پار سورج غروب ہو رہا تھا۔

نیل اور پیرا مڈ کی تاریک دنیا

اس درمیان صرف اتنا ہوا کہ نیل گھر آ گئی۔فاطمہ جب نیل کو لے کر پہلی بار اپنے بیڈ روم میں داخل ہوئی تو اچانک وہ زور سے چلاّ پڑی۔نیل فاطمہ کی گود میں، کپڑوں سے لپٹی ہوئی، ایک چھوٹی موٹی گٹھری کی شکل میں تھی۔کمرے میں اڑتی ہوئی ایک چمگادڑ تیزی سے فاطمہ کے کان کے پاس سے اڑتی ہوئی سامنے والی دیوار کے پاس چلی گئی۔مارے خوف کے فاطمہ نے نیل کو بستر میں ڈال دیا____

دونوں کان بند کر لیے ___ چمگادڑ کو کمرے سے باہر جانے کا راستہ نہیں مل رہا تھا۔

وہ زور سے چیخا ___ کھڑکی کھول دو۔

فاطمہ ابھی تک اپنی آنکھیں اور دونوں کان بند کیے کھڑی تھی۔ بچپن سے چمگادڑ کو لے کر ایک خوف اندر اندر بیٹھ گیا تھا۔ چمگادڑ کان میں داخل ہو جاتے ہیں۔ بچپن میں سنے ہوئے ایسے ہزاروں قصہ تھے ___ مگر چمگادڑ کا یہ رقص جلد ہی تھم گیا۔ کھلی کھڑکی سے چمگادڑ کو باہر نکلنے کا موقع مل گیا ___ فاطمہ نے اپنی سانسیں برابر کیں۔ پیار سے نیل پر جھک گئی ___ نیل سو گئی تھی ___ گورا رنگ، سر پر بالوں کا جمگھٹ تھا۔ مگر منہ کا حصہ خالی تھا۔ فاطمہ آہستہ آہستہ اس کے بالوں کو سہلا رہی تھی۔

'تم نے سنا ___ ڈاکٹر نے کہا ہے۔ پلاسٹک سرجری ہو جائے گی۔ پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا ___

اس نے پلٹ کر پیار بھری نظروں سے اُس کی طرف دیکھا ___ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا نا.....؟

'اس کی آواز میں درد کا اک ایسا راگ چھپا تھا کہ وہ اندر تک لہولہان ہو گیا ___

اپنے کمرے میں واپس آنے تک اسلم شیرازی بس اسی خیال سے دوچار رہا کہ کیا اسپتال سے گھر آتے ہوئے سچ مچ اُس نے نیل کی آواز سنی تھی۔ یا اس کا وہم تھا ___ نہیں یقیناً اس کے کان بج رہے ہوں گے۔ اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ممکن ہے، خوف کے مسلسل حملے میں، اسے اپنی ہی بات سنائی دی ہو ___ اُس دن کئی بار ایسا ہوا جب فاطمہ کسی نہ کسی کام سے اندر باہر کرتی رہی اور وہ تا دیر نیل کے پاس رہا۔ یا تو وہ سوتی رہی۔ یا پھر چیخ چیخ کر رونا شروع کر دیتی۔ لیکن ایک بار بھی اس نے اس کی طرف پلٹ کر نہیں دیکھا ___

وقت تیزی سے گزرنے لگا تھا۔ ڈاکٹر کی پیشن گوئی صحیح ثابت ہوئی تھی۔ نیل کو

سیزریا جھٹکے شروع ہو گئے تھے۔ جھٹکے کے دوران اس کا چہرہ بالکل پیلا پڑ جاتا اور اچانک وہ تیز تیز سر کو جھٹکا دینے لگتی۔ ڈاکٹر کے مطابق چھوٹے دماغ والے ایسے بچے، ایب نارمل ہوتے ہیں اور یہ جھٹکے معمولی بات ہیں۔ اور یہ سچ ہے کہ ڈاکٹر نے پہلے دن سے ہی اس بات کا احساس کرا دیا تھا کہ نیل زیادہ دنوں تک تمہاری دنیا میں رہنے کے لیے نہیں آئی ہے ____

فادر کی نظروں میں نیل کی موجودگی کا مقصد صاف تھا۔

'وہ تمہارے خوف کا چہرہ ہے ____' فادر اسمتھ سنجیدہ تھے۔ اُس سے زیادہ دل مت لگاؤ۔ بس سمجھ لو۔ وہ چند دن کی مہمان ہے، تمہیں اس مہمان کی قدر کرنی ہے ____

'وہ مہمان نہیں میری بیٹی ہے فادر.....، اُس کے آنسو سارے باندھ توڑ گئے تھے ____ ایک بیٹی جس کے بارے میں اُٹھتے بیٹھے، سوتے جاگتے سپنے دیکھتا تھا۔ ایک بیٹی، جس کے لیے میں سب کچھ بھول گیا تھا.....'

'بھولے نہیں تھے۔ تم ایک انجانے خوف کی پرورش کر رہے تھے..... افسوس! ہم اقلیت کے لوگ اس انجانے خوف سے باہر نکل ہی نہیں سکتے۔'

ارمینیا آرٹ بلڈنگ کی عمارت میں اس دن ایک بار پھر لکھیا سنگھ نے اس کا نام لے کر پکارا تھا ____

قریب جانے پر لکھیا سنجیدہ چہرے کے ساتھ اُس سے مخاطب تھا۔

'کبھی تم نے ایک بات غور کی اسلم شیرازی'

'کون سی بات؟'

'میں نے سمجھا تھا، شاید نہیں پوچھنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ تم خود ہی سمجھ جاؤ گے۔'

میں ابھی بھی نہیں سمجھا ــــــ

لکھیا نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ اچھا بتاؤ، یہاں تمہاری ذات کے کتنے لوگ ہیں؟

'اکیلا میں ہوں'۔

'یہی تو پوچھ رہا ہوں'، لکھیا ہنس رہا تھا ــــــ اکیلے کیوں ہو یہاں۔ یہاں سے چلے کیوں نہیں جاتے۔ ذرا سوچو اگر یہاں تم نہیں ہوتے، تو یہاں ہمارا ایک آدمی ہوتا ــــــ ہمارا یعنی ہمارے دھرم کا...... ایک تم نے ہماری پوری کیمسٹری بگاڑ دی ہے۔' اسے گہرے سناٹے میں چھوڑ کر لکھیا تو چلا گیا لیکن اسلم شیرازی کو اس گہری دھند یا سناٹے سے باہر نکلنے میں کافی اذیت کا سامنا کرنا پڑا۔ اُس کے جی میں آیا، لکھیا سے کہے۔ اپنے دھرم کے آدمی ہونے پر بھی تمہارا جی نہیں بھرے گا لکھیا سنگھ۔ پھر تم جات برادری لے آؤ گے۔ گوتر کی باتیں کرو گے۔ اس پر بھی بس نہیں چلے گا تو چھیتریتا اور ونش واد کی دہائیاں دو گے۔ بات یہ ہے کہ تم لوگوں کا ہاضمہ خراب ہے ــــــ لیکن اسلم شیرازی کی اپنی کمزوریاں اس پر حاوی تھیں۔ وہی کمزوریاں، جس کے ساتھ وہ بڑا ہوا تھا۔ جس کے ساتھ اُس نے پاؤں پاؤں چلنا شروع کیا تھا۔ اسکول سے کالج اور کالج سے اپنی ذمہ داریوں کی دنیا میں آنے تک انہی کمزوریوں نے اس کی پوری زندگی کو ایک ڈراؤنے خواب میں تبدیل کر دیا تھا۔

اور اب اس ڈراؤنے خواب کی شکل میں نیل سامنے تھی......

وہ چاہتا تھا کہ نیل آسمان میں اڑتی۔ اس کے چھوٹے چھوٹے ڈینے ہوتے......

مگر ــــــ نیل کے ڈینے ٹوٹے ہوئے تھے......

نیل کی سب کچھ اس کی آنکھیں تھیں۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں، جن آنکھوں میں وہ کوئی بھی سپنا نہیں رکھ سکتا تھا۔

چھوٹے چھوٹے ہاتھ، جن کی انگلیاں مضبوطی سے تھام کر وہ انہیں چلنا نہیں سکھا

سکتا تھا.....

اور ایک آدھا ادھورا منہ، ایک آدھی ادھوری سی نیل..... اور بڑھتا ہوا وقت کا قافلہ جیسے ہر لمحہ اسے وارننگ دینے کے لیے موجود ہوتا..... نیل جا رہی ہے۔ نیل کی زندگی سے ایک دن اور کم ہو گیا۔ بدنصیبی کی کوئی بھی کہانی، شاید اس سے زیادہ اذیت ناک نہیں ہو سکتی کہ وہ ہر لمحہ نیل کو خود سے دور جاتا ہوا دیکھ رہا تھا اور بے بس تھا۔

حقیقت یہ ہے، کہ وہ نیل کو کسی پیراڈ میں لے جا کر چھوڑ دینا چاہتا تھا۔ عین ممکن ہے، آپ اسے کوری فنتاسی، ایک بچکانہ خیال، ایک واہیات اور محض جذباتی ہونے کی دلیل کے ساتھ خارج کر دیں..... مگر یہ بھی سچ ہے کہ اُنہی دنوں اُسے خواب میں پیراڈ نظر آنے لگے تھے..... ہزاروں کی تعداد میں..... اسلم شیرازی کو اس بات کا احساس تھا کہ ایک دن سونے چاندی اور زندگی کی تمام تر آسائشوں کے ساتھ دفن، پیراڈ میں آرام کرتے یہ مردے ضرور جاگتے ہوں گے ____ یا ضرور جاگیں۔ پھر آواز دیں گے..... جیسے اس کی نیل..... وہ اسے چپکے سے کسی پیراڈ میں رکھ آئے..... کیا خبر، چپکے سے نیل جاگ جائے..... چپکے سے اُسے آواز لگائے..... چپکے سے اٹھ کر چلنے کی تیاری کرے..... چپکے سے اٹھ کر ہوا میں تیرتی ہوئی گود میں آجائے..... اس کی بانہوں میں سما جائے.....

پیارے قارئین..... یہاں آپ کو ذرا سا ٹھہرنا پڑے گا۔ کیونکہ جیسا آپ کو شروع میں بتایا گیا۔ یہ کہانی وہاں سے شروع نہیں ہو سکتی، جہاں سے آپ چاہتے ہیں۔ اور یہ اُنہی دنوں کا واقعہ ہے جب عالمی نقشہ پر دہشت پسندی کے ایک کے بعد ایک کئی حادثے نے مسلمانوں کو دہشت پسند قرار دے دیا کر دیا تھا۔ کشمیر سے کنیا کماری اور امریکہ سے برطانیہ ہر جگہ داڑھی والا مسلمان شک کے دائرے میں تھا۔ اور یہاں ڈاکٹروں کے مطابق نیل کے سیزر اس قدر بڑھ چکے تھے کہ اب اس کی زندگی کے سارے راستے مسدود ہو گئے تھے۔ فاطمہ کی آنکھیں ایک ایسی جھیل بن چکی تھیں،

جس کا سارا پانی سوکھ چکا ہو ___ نیل کی چیخیں اب اتنی زیادہ دہشت میں مبتلا کرنے والی ہوتیں کہ ربّ سے مانگی جانے والی دعاؤں میں اب اس کے لیے موت کی آرزو ہوتی..... اور یقیناً وہ ایک سرد ترین رات تھی، جب سرد کہا سے نے پورے شہر پر اپنا سایہ ڈال رکھا تھا۔ کمرے میں مرکری روشنی تھی۔ مسلسل کرب کی کیفیت سے گزرتے ہوئے یکا یک اسلم شیرازی کی نظر نیل پر چلی گئی۔ اور وہ یکا یک چونک پڑا۔

نیل کی روشن چمکتی آنکھیں اس کی آنکھوں میں جھانک رہی تھیں..... اور یقیناً وہ اس کی آواز سن سکتا تھا، محسوس کر سکتا تھا۔

'تم اتنا ڈرتے کیوں ہو..... ہاں تمہی سے پوچھ رہا ہوں پاپا..... کیوں ڈرتے ہو.....'

'میں.....'

'یہاں اور کون ہے۔ تمہارے اور ممّی کے سوا..... مجھے تمہارا ڈرنا پسند نہیں ہے.....' پسند نہیں ہے؟

'اور کیا..... تم ڈر ڈر کر بڑے ہوئے۔ ڈر ڈر کر زندگی شروع کی..... ڈر ڈر کر مجھے پیدا کیا..... اور دیکھو تو.....'

'کیا دیکھوں.....'

'مجھے اور کسے۔ تم نے اپنا ڈر ممّی کو دے دیا۔ ممّی میرے روپ میں اس ڈر کی پرورش کرتی رہیں۔ اور دیکھو تو..... میں تمہاری زندگی میں آئی بھی اور نہیں بھی آئی۔ کیا ملا تمہیں ڈرنے سے ___ اور اب میں جا رہی ہوں_ لیکن میں تمہیں خوفزدہ نہیں دیکھ سکتی پاپا۔ سمجھ لو، میں تمہاری خوف کی شکل ہوں۔ اور اب میں جا رہی ہوں، تو تمہیں خوفزدہ نہیں ہونا چاہئے.....'

نیل کی آنکھوں میں چمک تھی..... ایسی چمک جو اسلم شیرازی نے اپنی اب تک کی

زندگی میں شاید ہی کبھی دیکھی یا محسوس کی ہو......

'اور جان لو پاپا...... میں جا رہی ہوں...... میں کبھی لوٹ کر تمہاری دنیا میں واپس نہیں آؤں گی۔ مگر مجھے یاد کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے پاپا...... تم ڈرو گے نہیں۔ کیوں کہ ڈرنے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے تمہارے پاس......'

نیل نے مسکراتے ہوئے اُس کی طرف دیکھا اور پلٹ کر آنکھیں بند کر لیں ___ جیسے اب اس کی ضرورت نہیں رہ گئی ہو......

جیسے اس نے اپنا کام مکمل کر لیا ہو......

اور آخر میں

کہتے ہیں، دنیا کے آٹھ عجوبوں میں سے ایک پیرامڈ تک پہنچنا کوئی سہل کام نہیں۔ جہاں روشنی اور ہوا کا گزر نہیں۔ ایک نہ ختم ہونے والی اندھیری سرنگ ___ نہ ختم ہونے والی سیڑھیوں کی قطار اور بھول بھلیاں ___ ایک پر اسرار دنیا اور پتھروں سے پھوٹتی ہوئی خاموشی ___ ایک بھیانک فنتاسی اور خوف کے گھیرے سے باہر نکلنے تک، گو یہ کافی مشکل اور دشوار کن مرحلہ تھا، لیکن اسلم شیرازی نے اس دھند اور تاریکی میں زندگی کی ایک موہوم سی کرن ڈھونڈ لی تھی۔

نیل جا چکی تھی ___

نیل کے جانے کا بھیانک سناٹا زندگی کے راستہ میں حائل ضرور تھا، تاہم اسی سناٹے سے اسلم شیرازی اپنی زندگی کا نیا باب شروع کرنا چاہتا تھا۔ اور جیسا کہ اس دن آرمینیا آرٹ سینٹر کی بلڈنگ کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اچانک ہی اس نے لکھیا سنگھ کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اور اس سے پہلے کہ لکھیا سنگھ حیرانی سے اس کی طرف دیکھتا، اسلم شیرازی نے برسوں سے اندر دبے ہوئے لاوے کو ایک ہی جھٹکے میں نکال دیا۔

'سنو لکھیا سنگھ۔ برسوں سے تم کہتے رہے۔ میں سنتا رہا۔ لیکن کچھ باتیں ایسی ہیں

جو تمہیں بتانا ضروری ہے۔'

مثلاً؟ لکھیا سنگھ کی آنکھوں کا رنگ بدلا تھا۔

'مثلاً یہ کہ اب مجھے اپنے آپ کو اور تمہیں یہ بتانا ضروری ہے کہ جن لوگوں نے ملک کا بٹوارہ کرایا۔ وہ میں نہیں تھا۔ اس لیے اس حادثے کی سزا تم کم از کم مجھے نہیں دے سکتے۔ جس نے بابری مسجد بنایا، وہ بھی میں نہیں تھا، جس نے گودھرا کیا، وہ بھی میں نہیں تھا ___ دنیا کے ایسے کسی بھی حادثے میں میری شرکت نہیں رہی ہے لکھیا سنگھ، تمہاری رہی ہو تو میں نہیں جانتا ___ اس لیے جو کام میں نے کیے ہی نہیں، تم بار بار اس کام کے لیے مجھے ذلیل کرنا چاہو گے تو میں برداشت نہیں کروں گا۔ اور ہاں، کیمسٹری میری موجودگی سے نہیں تمہاری موجودگی سے خراب ہوئی ہے..... اگر اس سینٹر سے کسی ایک آدمی کو جانا ہوگا تو وہ تم ہو گے لکھیا سنگھ.....'

گھر واپس آنے پر آج پہلی بار وہ محلے کے سونا حلوائی کی دکان سے چھنی ہوئی تازہ جلیبیاں لے کر گھر پہنچا تھا۔ یقینی طور پر یہ فاطمہ کے لیے چونکنے کی بات تھی.....

'تمہیں تو آج تک کوئی بھی اچھی بری چیز گھر لانے کی توفیق نہیں ہوئی ___ یہ جلیبی لے کر کیسے آ گئے ___'

'پتہ نہیں'

اس کی آواز جیسے پراسرار پیراڈکی تنگ و تاریک دنیا میں گم ہو گئی تھی ___

اختتام